قیدِ تقدیر

عائشہ لیاقت



حالات اور تقدیر کب انسان کی سوچ کے مطابق چلتے ہیں..... انسان اُسی حصار میں گھومتا رہتا ہے جس میں اُسے قید کیا گیا ہے

قیدِ تقدیر

عائشہ لیاقت

انتساب

اللہ تعالٰی کے بعد

میری ماں اور اُن تمام عزیز از جان دوستوں کے نام

جنہوں نے مجھے اس ناول کو لکھنے کی ترغیب بھی دی

اور میرے لئے انسپائریشن کا باعث بھی بنے……

ترتیب

اے ابنِ آدم!

ایک تیری چاہت ہے
اور ایک میری چاہت ہے
ہوگا وہی جو میری چاہت ہے
پس اگر سپرد کر دیا تو نے خود کو اسکے جو میری چاہت ہے
تو وہ بھی میں تجھے دونگا جو تیری چاہت ہے
اور اگر تو نے مخالفت کی اُسکی جو میری چاہت ہے
تو میں تھکا دونگا تجھکو اُس میں جو تیری چاہت ہے
پھر ہوگا وہی جو میری چاہت ہے۔

حدیثِ قدسی

☆ ☆ ☆

پیش لفظ

جلد بازی اور ناشکری انسان کی فطرت کا خاصا ہیں۔ انسان ہمیشہ وہی پانے کی کوشش کرتا ہے جو اسکی قسمت میں ہی نہیں ہوتا اور خدا نے اسے جن نعمتوں سے نوازا ہوتا ہے انسان انکی قدر ہی نہیں کرتا۔ خدا کی نعمتوں کی ناشکری ہی کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں فرمایا ہے کہ

ترجمہ: ''میں نے ہر چیز کو بنایا اور اسکے گلے میں اسکی تقدیر ڈال دی۔'' القرآن۔

اللہ نے انسان کو "اشرف المخلوقات" بنایا اور اسے دو چیزیں عطا کر دیں۔ ایک انسان کو اختیار دے دیا کہ وہ اچھائی اور برائی میں سے جسے چاہے اپنے لئے چن سکتا ہے۔ اور دوسرا اسکی تقدیر بنا دی۔ تقدیر کے ہاتھوں انسان کو بے بس بنا کر خدا نے انسان کو یہ بتا دیا کہ وہ اس دنیا میں "مطلق العنان" نہیں ہے اور ارادوں کی ناکامی سے اللہ نے انسان کو اپنے پروردگار کو پہچاننے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ مگر انسان بھی اپنی تجسس فطرت کے باعث مجبور ہے۔ یہ انسان کا تجسس ہی تو تھا جس نے اسے جنت سے نکال کر زمین پر پہنچا دیا۔ انسان ہمیشہ وہی کام کرتا ہے جس سے اسے منع کیا گیا ہو۔ انسان کا تجسس اور اسکا نفس اسے گناہ کرنے پر مجبور و بے بس کر دیتے ہیں۔ یہ شیطان کے وہ ہتھکنڈے ہیں جنہیں استعمال کر کے شیطان انسان کو ولی سے ابلیس اور انسان سے حیوان بنا دیتا ہے۔ لالچ، ہوس، نفرت اور جلن، حسد کے جذبات سے شیطان انسان کو اپنا غلام بنا لیتا ہے اور یہ باطل قوتیں انسان سے بہت سے گناہ سرزد کروا دیتی ہیں۔

دنیا کا ہر شخص چاہے بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب کسی نہ کسی اضطراب و بے چینی میں رہتا ہے۔ کوئی بھی اپنی زندگی سے مطمئن نظر نہیں آتا۔ ہر کسی کو کوئی نہ کوئی خواہش پوری ہونے یا کوئی حسرت پوری نہ ہونے کا دکھ ہے۔ ہر انسان ہمیشہ وقت سے پہلے اور قسمت سے زیادہ پانے کی سعی کرتا رہتا ہے۔ اسی کوشش میں وہ اپنا سکھ اور چین برباد کر لیتا ہے۔ اسکی خواہش کی تکمیل تو نہیں ہوتی مگر وہ ہمیشہ اضطراب کا شکار ہی رہتا ہے۔ انسان کی زندگی اس وقت برباد ہونے لگتی ہے جب وہ اپنی قسمت سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی چاہت پانے کیلئے انسان ہر ممکن کوشش کر گزرتا ہے لیکن اپنی تقدیر کے حصار سے نکل جانا اسکے بس میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے پاک کلام میں ارشاد فرماتا ہے کہ

ترجمہ: ''اے گروہ جن وانس! اگر تمہیں اختیار ہو کہ تم زمین و آسمان کی حدوں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔ لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' القرآن

اپنی قسمت سے بڑھ کر چاہنا تو انسان کے بس میں ہے لیکن ہر چیز کو پا لینا اسکے اختیار میں نہیں ہے۔ رب کی تقسیم پہ راضی رہنا بنی نوع انسان کے لئے بہت کٹھن ہے۔ یہ کسی ایک انسان کی نہیں ہر انسان کی کہانی ہے۔ دنیا میں سب انسان وقت سے پہلے اور تقدیر سے زیادہ پانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہیں جو اپنی تقدیر سے قانع ہیں ورنہ زیادہ تر بنی نوع انسان اپنی چاہت کے صحراؤں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور خدا کی چاہت کے خلاف سعی کرتے دکھائی دیتے ہیں یا اپنی زندگی کو کوستے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ کوشش اور محنت لاحاصل ہی رہتی ہے اور انسان کبھی اپنی تقدیر کے حصار سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوتا اور تھکا دیا جاتا ہے اپنی چاہت کی تلاش میں۔

باب نمبر ۱

آج رات بھی اُس نے بہت شراب پی لی تھی۔ لیکن پھر بھی اپنے ہوش وحواس میں تھا۔ اور آنسو مسلسل اُسکے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ وہ بار بار شراب کے گھونٹ بھرتا جاتا تھا اور آنکھوں سے آنسو گرتے جاتے تھے۔ وہ جتنا اُسے بھلانے کی کوشش کرتا تھا، اُتنی ہی شدت سے اُسکی یاد آنے لگتی تھی۔ وہ آنکھیں بند کرتا تو اُسکا مسکراتا ہوا چہرہ اور محبت پاش نظریں اُسکے دل پہ خنجر چلانے لگتیں۔ کبھی اُسکی ہنسی اور قہقہے اُسکے کانوں میں گونجنے لگتے تو کبھی اُسکی محبت بھری باتیں یاد آنے لگتیں۔ اُسکی باتوں کو یاد کرکے کبھی وہ مسکرانے لگتا اور کبھی شدتِ غم سے گھبرا کر چلانے لگتا۔ پچھلے ایک مہینے سے اُسکا یہی معمول تھا۔ آفس سے تھک ہار کر جیسے ہی گھر جانے کا خیال آتا تو ایک خلش سی اُسکے دل میں چبھنے لگتی تھی اور اُسکی یاد دل و دماغ کو ایک شدید اذیت میں مبتلا کر دیتی تھی۔ اُسکے کہے ہوئے جملے اُسکی سماعتوں سے ٹکرانے لگتے تھے "آپ گھر نہیں گئے ابھی تک؟"، "ابھی تک فری نہیں ہوئے؟"

"میں کب سے آپکی کال کا انتظار کر رہی تھی۔".....

محبت بھری باتوں کی بازگشت اُسکے دل و دماغ کو چھلنی کیے دیتی تھی۔ شدتِ غم اُسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ ایک مہینے پہلے تو وہ اُسکے ساتھ ہی تھی وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُسکا انتظار کرنے والا اُسکی محبوب ہستی تھی۔ وہ کسی وقت، کسی بھی جگہ خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ کوئی تھا جو اُسکے ساتھ ہر پل اُسکے سائے کی طرح ساتھ رہتا تھا۔ آفس میں، گھر میں، کام کے وقت یا دوستوں سے ملاقات کے دوران ہر پل کوئی اپنے ہونے کا احساس دلاتا تھا۔ وہ جو ہر پل اُسکی فکر کرتا تھا، اُسکے گھر جلدی لوٹ آنے کا، اُسکے کھانا کھانے کا، سونے کا جاگنے کا.....

"کہاں کھو گئی ہو؟..... کیوں مجھ سے دور چلی گئی تم؟..... میں کیسے جیوں گا تمہارے بغیر؟....."

وہ زور زور سے چلا رہا تھا۔ آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ شراب کے نشے میں دھت ہوتے ہوئے بھی اُسکی یاد تھی کہ دل سے جاتی نہ تھی اور وہ شراب کے گھونٹ بھر بھر کے تھک جاتا تھا۔ وہ اُس سے بہت محبت کرتا تھا وہی اُسکی زندگی کی پہلی اور آخری تمنا تھی اُسکے بغیر وہ زندگی کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔ دن رات سوتے جاگتے بس اُسی کا خیال رہتا تھا۔ رات آنکھ اُسکے نام پہ بند اور اُسی کے نام پہ صبح کا آغاز ہوتا تھا۔ وہ اُسے جتنا چاہتا تھا جواباً اُسے بھی اُتنی ہی بے انتہا محبت ملتی تھی۔ دونوں کی محبت مثالی تھی۔ لوگ اُنکی محبت پہ رشک کیا کرتے تھے اور وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے ساتھ بہت خوش تھے۔ پھر رفتہ رفتہ دوریاں بڑھنے لگیں اور دلوں میں کدورت اور بے یقینی نے جنم لے لیا۔ اچانک ہی وہ اُسکی زندگی ویران کر گئی۔ اُسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب ہو چکا تھا۔ اُسکے شب و روز میں اب

تنہائی، درد، اضطراب اور یادوں کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی یہ دوری ختم نہیں کر پا رہا تھا۔ اُسکی ساری کوششیں ناکام رہی تھیں۔ اس ایک مہینے میں اُسکی حالت کیا سے کیا ہو گئی تھی۔ وہ ایک سڈول جسم، گندمی رنگت والا ایک وجیہہ لڑکا تھا مگر اس ایک مہینے میں وہ بے حد لاغر نظر آنے لگا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو اور کمزوری نے اسکے خدوخال کو بہت متاثر کیا تھا۔ وہ بہت بدل چکا تھا اور دن بہ دن حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے اپنا خیال رکھنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ نیند اُسکی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی اور آنکھوں میں چمکتے مستقبل کے خوابوں کو آنسوؤں کے سیلاب نے بہا ڈالا تھا۔

☆......☆......☆

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ بے حد بددلی سے تیار ہو رہی تھی۔ غم و غصہ اُسکے چہرے کو سرخ کر رہا تھا اور اُسکا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلی جائے۔ اُسے ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ شاید اپنے آپ سے بھی۔ آج پھر اُسے کچھ لوگوں کے سامنے پیش ہونا تھا۔ رشتے والی خالہ پھر سے کچھ لوگوں کو اُسے دکھانے کیلئے لا رہی تھی اور اماں نے اُسے خاص تیار ہونے کو کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ عذاب صرف لڑکیوں کیلئے ہی کیوں ہوتا ہے؟ اس نے جلتے ہوئے دل سے سوچا۔ ہر بار لوگوں کے سامنے پیش ہوتے ہوئے، لوگوں کی تنقیدی نظروں کا سامنا کرتے ہوئے، ایک ہی طرح کے سوالوں کے وہی جواب دیتے ہوئے اُسے بہت تذلیل محسوس ہوتی تھی۔ اُسکی عزت نفس مجروح ہو کر رہ جاتی تھی جب لوگ اُسے ریجیکٹ کر کے چلے جاتے تھے۔ اور رشتے والی خالہ اُسکی ماں کو تسلیاں دیتے ہوئے کسی اور رشتے کی نوید سنا جاتی تھی۔ اور اُسکی ماں کا دل یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا تھا کہ شاید اگلی بار کہیں بات بن جائے..... مگر ایک بات دل کو بہت بے چین رکھتی کہ اُنکی بیٹی میں کیا کمی ہے۔ جو کہیں بات نہیں بنتی۔ وہ خوش شکل بھی ہے، پڑھی لکھی بھی، خاندان بھی خوشحال ہے۔ بڑی پانچ بہنوں کے بعد اُسکا نمبر آتا تھا اور اسکے علاوہ دو بھائیوں کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بہنیں بھی اپنے اپنے گھروں میں خوشحال زندگیاں بسر کر رہی تھیں۔ پھر نہ جانے کیا وجہ ہے جو سب سے چھوٹی بیٹی کا رشتہ نہیں ہو رہا۔ یہ سب باتیں ایک طرف مگر جو ٹوٹ پھوٹ اور احساسِ ذلت جو ہزار بار اُسکے دل کو نیا زخم لگا دیتا تھا وہ کسی پل اُسکے دل کو قرار نہ آنے دیتا تھا۔ وہ سوچتی تھی کہ کیا شادی نہیں ہوگی تو کیا زندگی نہیں گزرے گی یا وہ زندہ نہیں رہ پائے گی؟ کیا یہ دنیا عورت کو کبھی سکون سے جینے دیگی؟ کیا عورت کی زندگی کا مقصد محض شادی ہونا یا بچے پیدا کرنا ہوتا ہے؟ یہ مصیبتیں عورت کیلئے ہی کیوں ہیں؟ یہ سب سوچتے ہوئے اُسکا دل بے حد تنگ ہو جاتا تھا۔ اُسے سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے، اگر وہ ان سب ذلتوں سے بچنے کے لئے ماں کو مزید رشتے دیکھنے سے منع کرتی تو اماں اور ابا مزید پریشان ہو جاتے اور اُنکو نہ روکتی تو خود کو اذیت سے دوچار کرتی۔ اُسکے لئے کچھ بھی سازگار نہیں تھا، وہ چاہ کر بھی اپنے لئے کچھ نہیں کر پاتی تھی۔ زندگی کا ہر موسم اُسکے لئے مثل خزاں تھا۔ ہر راستہ تپتے صحرا کی طرح تھا۔ طرح طرح کے لوگ آ کر اُسے عجیب عجیب نظروں سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتے۔ کئی عورتیں تو منہ پر ہی عمر زیادہ ہونے کا طعنہ دے جاتی تھیں۔ ہمارا معاشرہ بھی کتنا ہپوکریٹ ہے۔ وہ اکثر سوچا کرتی اور کڑھتی رہتی تھی۔ مرد چالیس کا بھی ہو جائے تو لڑکی کی عمر بیس بائیس سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے۔ لڑکا چاہے بندر یا لنگوری کیوں

نہ ہو، پہلو میں اُسکے حور ہی ہونی چاہیے۔ اور اگر کبھی لڑکا خوش شکل ہو تو بس پھر تو جیسے آفتاب و ماہتاب کی تلاش کئی کئی برسوں تک جاری رہتی ہے اور نظر ہے کہ ٹھہرتی ہی نہیں۔ عورت کی زندگی کا حصار اس معاشرے میں کتنا تنگ ہے۔ یہ سوچ کر اُسکا دم گھٹنے لگتا تھا۔ اور ڈپریشن اس قدر بڑھ جاتا تھا کہ وہ اکیلے میں کئی کئی گھنٹے زاروقطار روتی رہتی تھی۔ ہمارا معاشرہ یہ بات کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ اُسکے بنائے قوانین ایک لڑکی کی زندگی کس قدر اذیت ناک بنا دیتے ہیں۔ یہ معاشرہ جس میں ہم زندگی گزار رہے ہیں، عورت کو چادر اور چار دیواری سے آگے دیکھنا ہی نہیں چاہتا۔ مردوں کے اس معاشرے میں عورت کتنی ہی ترقی یافتہ اور بااختیار کیوں نہ ہو جائے مرد کے مقابلے میں ہمیشہ کمزور ہی رہتی ہے۔ یہ مرد کبھی باپ ہوتا ہے، کبھی بھائی، کبھی شوہر اور کبھی بیٹا۔ مردوں کا یہ معاشرہ اکیلی عورت کو کبھی بغیر مرد کے زندگی چین سے بسر کرنے نہیں دیتا۔ مرد صرف مرد کا حامی ہوتا ہے اور عورت کی زندگی اس معاشرے میں بنا مرد کے تصور ہی نہیں کی جا سکتی۔ اُسے ہر قدم پہ ایک مرد کا سہارا لازم و ملزوم ہی شرط ہے۔ ورنہ اکیلی عورت کا جینا بھی مرد حرام کر دیتے ہیں۔ ہر شخص ایک گدھ کی مانند معلوم ہوتا ہے جو عورت پر اُسے نوچ کھانے کے لئے ہر طرف سے حملہ آور ہوتا ہے۔ یہ بھی عجیب نظامِ قدرت ہے کہ عورت کیلئے راہبر بھی ایک مرد ہی ہوتا ہے اور راہزن بھی ایک مرد ہی ہوتا ہے۔ لیکن عورت کے پاس مرد پہ اعتبار کرنا ہی واحد حل ہوتا ہے۔ اور اُسکے ساتھ کسی بندھن میں بندھ جانا ہی عورت کے لئے عافیت کا باعث بھی ہے۔ ورنہ یہ معاشرہ گدھوں اور بھیڑیوں سے بھرا پڑا ہے اور عورت کی مثال ایک ہرن کی سی ہے جسے خود اپنا بچاؤ کرنا ہے اور اپنے بقا کی جنگ اس معاشرے کے جنگل میں تنہا لڑنا ممکن نہیں اسلئے اُسے ایک مہربان سائبان کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اُسے ان خونخوار درندوں سے بچا کر عزت و احترام کی چادر اُڑھا دے اور اپنے نام کا ہار پہنا کر اُسے محترم بنا دے۔

☆.....☆.....☆

وہ بہت غصے میں گھر سے نکلی تھی، اُسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی جا رہی تھی۔ اُسے اس دنیا کی ہر چیز سے نفرت محسوس ہو رہی تھی اُسکا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس دنیا سے مردوں کا وجود ہی ختم کر دے۔ ان سب مردوں کا وجود جو عورتوں کی زندگیاں مجبور و لاچار بنا دیتے ہیں۔ اور خود ہمیشہ خودمختار ہی رہتے ہیں لیکن اپنے گھر کی عورتوں کا جینا محال کر رکھا ہوتا ہے۔ ہر مرد چاہے باپ ہو، بھائی ہو، بیٹا ہو یا شوہر ہو، ہر روپ میں عورت کے لئے ایک تکلیف دہ حقیقت کیوں بن جاتا ہے؟ اس سے روگردانی بھی اُسکے لئے ممکن نہیں ہوتی اور ان کی خودغرضی بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ ہر مرد صرف اپنے بارے میں سوچتا ہے اسے صرف اپنے آپ سے مطلب ہوتا ہے اور عورت تو مرد کے لئے محض ایک ملکیت اور جائداد ہوتی ہے اور ضرورت کی چیز جسے وقتِ ضرورت جیسے چاہے استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی غیرت پہ قربان کیا جاتا ہے تو کبھی وہ خود اپنے باپ اور بھائیوں کی پگڑیوں کی لاج رکھنے کے لئے اپنے ارمانوں اور جان کی بلی چڑھا جاتی ہے...... اچانک ایک تیز رفتار گاڑی کے ہارن نے اُسے چونکا دیا اور وہ اپنی سوچوں سے باہر نکلی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ گاڑی کے نیچے آنے والی تھی اور ڈرائیور اگر وقت پہ بریک نہ لگاتا تو آج اس دنیا اور اسکی تکلیفوں سے اُسے نجات مل ہی جاتی، مگر وہ اتنی خوش قسمت کہاں کہ زندگی نہ سہی موت ہی اُس پہ مہربان ہو جاتی...... وہ شکست خوردہ سی چلتی ہوئی ایک پارک کے بنچ پہ آ کر بیٹھ گئی۔ یہ

پارک اُسکے گھر کے نزدیک ہی تھا اور وہ بے خیالی میں یہاں آ پہنچی تھی۔ گھر کے ڈپریشن زدہ ماحول سے سب سے قریبی راہ فرار یہی تھی۔ اُسکی آنکھیں اور دل دونوں اپنی بے بسی اور لاچاری کے غم سے جل رہے تھے۔ پارک میں چند ہی لوگ تھے اور کچھ بچے جو جھولے جھول رہے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عورت کو خدا نے نا جانے کیوں اتنا بے بس بنایا ہے؟ یہ دنیا تو عورت کے ساتھ سیکنڈ ریٹ سٹی زن والا سلوک کرتی ہے۔ خدا نے بھی شاید اُنکو یہی مقام دے رکھا ہے کیونکہ وہ مرد کے بعد پیدا کی گئی اس لئے وہ مرد سے کمتر ہے اور ہر لحاظ سے مرد اُس سے برتر و اعلیٰ ہے۔ لوگ دعاؤں میں بھی بیٹے ہی مانگتے ہیں، کسی کو بھی بیٹی کی چاہ نہیں ہوتی.....کوئی اُنکو دعاؤں اور منتوں میں نہیں مانگتا۔ جو حیثیت، آزادی، پیار اور سپورٹ بیٹوں کو ملتی ہے وہ کبھی بھی بیٹیوں کو نہیں ملتی۔ ہمارے معاشرے کا مڈل کلاس طبقہ لڑکیوں کو جس ماحول میں پروان چڑھاتا ہے وہ بہت ہی گھٹن زدہ اور بے بس کر دینے والا ہوتا ہے، دنیا سے ذرا چھپا کے رکھا جاتا ہے اور ہمیشہ ایک مرد پہ انحصار کرنا سکھایا جاتا ہے، وہ مرد پہلے باپ ہوتا ہے، پھر بھائی، پھر شوہر اور زندگی کے آخری موڑ پہ بیٹا..... یہ تمام رشتے اُنہیں اپنے مطلب و منشا کے مطابق بانکتے ہیں اور اُنکا اچھا برا سب اُنہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ وہ چاہیں تو زندگی کو جنت بنا دیں اور چاہیں تو دوزخ بنا دیتے ہیں۔

سوچیں اُسکے ذہن کو ماؤف کیے جا رہی تھیں اور اُسکا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے چلائے یا پھر اس دنیا سے کہیں دور چلی جائے۔ یہ سب اُسکی برداشت سے باہر ہو رہا تھا وہ بینچ پہ بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شام کے سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے اور اُسے اپنا کوئی ہوش نہ تھا وہ گھر واپس نہیں جانا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

وہ آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب اُسکی ماں کمرے میں آئی۔ اپنے بیٹے کی سوجی ہوئی آنکھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے بن چکے تھے اور مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر اُنکا دل خون کے آنسو رو دیا۔ بلقیس بیگم کا بس چلتا تو اپنے بیٹے کی ہر خوشی اُسکے قدموں میں لا کر ڈھیر کر دیتیں لیکن اُن کے بس میں کچھ نہیں تھا۔

"تبریز۔ میرے بیٹے تُو نے یہ اپنا کیا حال بنا لیا ہے؟" ماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا اب اپنی حالت پہ بھی مجھے اختیار نہیں؟ یا اسکا فیصلہ بھی آپ اور بابا بچپن سے کر چکے ہیں میرے لئے؟" تبریز نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ ماں کو جواب دیا۔

"بیٹا میں تیرا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔ لیکن تمہارے باپ کو سمجھانا میرے بس کی بات نہیں ہے، تُو اپنی یہ ضد چھوڑ دے اور اپنے باپ سے صلاح کر لے۔ آخر کب تک خود کو اور ہمیں یہ اذیت دیتا رہے گا؟" ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ہونہہ.....اذیت.....میری زندگی برباد کرتے ہوئے کسی کو اذیت ہوئی تھی؟ نہیں ناں۔ تو اب کیسی اذیت ماں؟" تبریز نے جلے ہوئے لہجے میں تلخی سے جواب دیا۔

"بیٹا ہم تیرے ماں باپ ہیں تیرے بھلے کے لئے ہی کیا تھا جو بھی کیا تھا۔ میں مانتی ہوں تمہارے باپ سے غلطی ہوئی ہے لیکن آخر تو وہ تمہارے بابا ہیں۔ معاف کر دے اُنکو اور بھول جا پُرانی باتیں نئی زندگی شروع کر بیٹا۔" بلقیس بیگم نے التجایا انداز میں کہا۔

"ماں میں اُسے نہیں بھلا سکتا۔ وہی میری زندگی میں آئے گی ورنہ کوئی بھی نہیں آ سکتا۔" تبریز کا لہجہ اٹل تھا۔

"اب ایسا کیسے ہوگا؟ اُسکی تو شادی ہو چکی ہے کسی اور سے۔۔" بلقیس بیگم نے حیرت سے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں کل بھی اُسے چاہتا تھا آج بھی چاہتا ہوں اور ہمیشہ چاہتا رہوں گا۔ اُسکے سوا کسی اور کو اپنی زندگی میں شامل نہیں کروں گا۔ کبھی بھی نہیں۔۔" تبریز نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور چلا گیا۔

بلقیس بیگم حیرت اور دُکھ کے ملے جُلے انداز میں اُسے جاتا دیکھتی رہ گئیں۔ پچھلے دو مہینے سے اُسکا یہی معمول تھا۔ وہ بنا کچھ کھائے اور کسی کو ملے گھر سے نکل جاتا تھا اور رات کے نہ جانے کون سے پہر گھر لوٹتا تھا۔ باپ کو تو وہ ملنا گوارہ بھی نہیں کرتا اور گھر کے باقی افراد سے تو وہ پہلے بھی لیا دیا رہتا تھا۔ ماں نے بہنوں نے، بھائی بھابیوں نے، غرض کس کس نے اِسے نہیں سمجھایا تھا لیکن تبریز کسی کی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھا۔ اُسنے تو جیسے خود کو برباد کرنے کی ٹھان لی تھی۔ بلقیس بیگم نے ایک سرد آہ بھری اور سوچا کہ کاش اگر تبریز کے بابا بیٹے کی پسند کا مان رکھ لیتے اور چند خود غرض رشتے داروں کی خاطر اپنے بیٹے سے جنگ مول نہ لیتے تو آج اُنکے بیٹے کا یہ حال نہ ہوتا۔ اُسکی زندگی اور جوانی عشق کے روگ میں برباد نہ ہو رہی ہوتی۔۔۔ جوان اولاد پہ زور نہیں چلتا کاش یہ بات وہ جان جاتے تو آج اُنکا بیٹا اُنکے ہاتھ سے یوں نہ نکل جاتا۔ کیا تھا اگر وہ بیٹے کو اُسکی پسند کی شادی کر لینے دیتے، آخر کیا بُرائی تھی اُسکی پسند میں؟ ہر لحاظ سے اچھی تھی وہ لڑکی اور لوگ بھی خاندانی تھے۔ لیکن محمود صاحب کی ضد، انا اور خود غرضی نے اُنہیں اُنکے مقام سے گرا دیا۔ تبریز کا غصہ اور ناراضگی اپنی جگہ بجا ہے۔ بلقیس بیگم خود کو بھی تبریز کا قصوروار سمجھتی تھیں کیونکہ ایسے وقت میں اُنہوں نے بیٹے سے زیادہ اپنے مجازی خدا کا ساتھ دیا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ غلط اُنکا شوہر ہے۔

☆.....☆.....☆

کبھی کبھی زندگی اتنی تلخ ہو جاتی ہے کہ ہر آنے جانے والی سانس بھی زہر کی طرح حلق میں اُترتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ عرشیہ کی زندگی بھی اب ایسے ہی موڑ پہ آ کر ٹھہر گئی تھی۔ جہاں اُسے زندہ تو رہنا تھا لیکن ان تلخ حقیقتوں کے زہریلے گھونٹ بھر بھر کے۔ سائنس نے کتنی ترقی کر لی ہے لیکن ایسی کوئی ایجاد نہیں ہوئی جو انسان کو اُسکے دکھوں سے نجات دلا سکے۔ جو زندگی کی تلخیوں کو ختم کر کے سکون اور راحت کا کوئی لمحہ میسر کر سکے۔ آج بھی کچھ لوگ اُسے شوپیس کی طرح دیکھ کر چلے گئے تھے اور انکار اُنکے چہروں سے صاف ظاہر تھا۔ خود کو بار بار ذلت کی ان گھڑیوں سے گزارتے ہوئے عرشیہ پہ جو گزر رہی تھی وہ صرف وہی جانتی تھی اگر اُسے اپنے بوڑھے ماں باپ کا خیال نہ ہوتا تو وہ کب کی یہ سلسلہ بند کروا چکی ہوتی لیکن ماں باپ کی تسلی کے لئے اُسے یہ سب نا چاہتے ہوئے بھی برداشت کرنا ہی پڑ رہا تھا۔ لیکن اب اُسکی برداشت اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی، اسلئے آج اُس نے ماں باپ کو سمجھانے کی ٹھان لی تھی کہ اب وہ مزید اپنی ذلت

برداشت نہیں کرسکتی اور شادی بھی نہیں کرنا چاہتی۔ ایسے ذلیل ہونے سے تو بہتر ہے کہ وہ عزت اور سکون سے بنا شادی کے زندگی گزار دے۔ امی، ابو اب سونے کی تیاری میں تھے جب وہ کمرے میں اُن سے بات کرنے آئی تھی۔

"امی مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" عرشیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"ہاں کہو کیا بات ہے۔" صبیحہ بیگم نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے عرشیہ کو دیکھا۔

"امی مجھے آپ سے اور ابو سے بس یہی کہنا ہے کہ اب میرے لئے مزید کوئی رشتہ دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ میں یہ تماشہ اب اور برداشت نہیں کرسکتی۔" عرشیہ نے دوٹوک الفاظ میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"لیکن بیٹا یہ ہماری مجبوری ہے۔ بیٹیوں کو کوئی ساری زندگی اپنے گھر تو بیٹھا کر نہیں رکھ سکتا ناں۔" صبیحہ بیگم نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

"امی میں روز روز کے اس تماشے سے تنگ آچکی ہوں۔ میری انا اور عزتِ نفس مجروح ہو کر رہ گئی ہے۔ خدا کے لئے میری اس ذلالت سے جان چھڑا دیں۔ میں مزید اپنی توہین نہیں سہہ سکتی۔" عرشیہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"عرشی، عرشی میری بچی مت رو۔" صبیحہ نے بیٹی کو گلے لگا کر چپ کرایا۔

"امی میں اب کسی کے سامنے نہیں جاؤں گی۔ مجھے نہیں کرنی شادی۔ میں ایسے ہی خوش ہوں۔ خدا کے لئے میرا تماشہ مت بنائیں۔ ورنہ میں برداشت نہیں کرسکوں گی اب...." عرشی نے التجائیہ لہجے میں آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا تو صبیحہ بیگم کا کلیجہ کٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے بیٹی کو سینے سے لگا لیا۔ اُن کی آنکھیں بھی ڈبڈبا گئیں۔ کس قدر مجبور ہوتے ہیں بیٹیوں کے ماں باپ بھی، اپنی کوکھ سے جنمی بیٹیاں پال پوس کر، سلیقہ مندی رکھ رکھاؤ سکھا کر پرائے لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اپنی جوان اولاد کیسے غیروں کو دینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ کبھی کبھی خود ہی اُن کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہیں کہ کوئی قدردان ملے تو اپنا لختِ جگر اُس کو سونپ کر سبکدوش ہو جائیں.......

"بس میری جان۔ اب بس کر دے۔ تمہارے ابو نے تمہیں یوں روتے دیکھ لیا تو اُنکا بی۔ پی ہائی ہو جائے گا۔ تم تو جانتی ہو وہ کتنے حساس ہیں تمہارے معاملے میں۔" صبیحہ بیگم نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔ شب بخیر۔" عرشیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"شب بخیر۔" صبیحہ بیگم نے بھی کہا۔

اپنے دل کی بات ماں کو بتا کے عرشیہ کو کافی بہتر محسوس ہوا تھا۔ ایک بوجھ جو وہ برسوں سے اپنے دل پہ لئے پھر رہی تھی کچھ ہلکا لگنے لگا تھا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ خود کو ایسے روگ نہیں لگائے گی اور اپنی زندگی کو یوں ضائع نہیں ہونے دیگی۔ وہ اپنی زندگی بنانے کے لئے اب خود کچھ کرے گی۔ وہ پڑھی لکھی ہے اور باشعور بھی۔ عرشیہ نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ جاب کرے گی اور خود کو معروف رکھے گی۔ چاہے کوئی بھی مخالفت کرے بھائی یا ابو.....وہ کسی کی مخالفت کی پرواہ نہیں کرے گی۔ عرشیہ کا ارادہ اٹل تھا اور اب اُسے کوئی نہیں

روک سکتا تھا کیونکہ رشتوں کے انتظار میں زندگی کے کئی حسین اور قیمتی سال وہ ضائع کر چکی تھی اپنے ماں باپ کی خاطر، لیکن اب مزید ایسا نہیں ہونے دیگی۔ خود کو رشتوں کے انتظار میں بوڑھا نہیں ہونے دیگی اور نہ ہی اپنی عزت نفس کو ملیا میٹ ہونے دیگی۔ رات بھر عرشیہ اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے گزاری نہ جانے کس پہر اُسکی آنکھ لگ گئی اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ لیکن یہ فیصلہ کر کے وہ خود کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی اسلیے سکون کی نیند آ گئی تھی۔

☆......☆......☆

ہر طرف رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ لیکن اُسکا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ پھر سے اُسی گھٹن زدہ ماحول میں جائے جہاں وہ پہلے ہی مہینوں بعد آتی تھی اور ایسا شاید ہی کبھی ہوا ہو کہ وہ ہوسٹل سے گھر آئی ہو اور کوئی تماشہ نہ کھڑا ہوا ہو گھر میں۔ لیکن کچھ بھی ہو انسان کی مرنے سے پہلے آخری پناہ گاہ اُسکا گھر ہی ہوتا ہے۔ جہاں کچھ بھی ہو کیسا بھی ماحول ہو، جانا ہی ہوتا ہے۔ دنیا کے جھمیلوں سے فارغ ہو کر جب آرام کرنے کا خیال آتا ہے تو ایک ہی لفظ ذہن میں آتا ہے اور وہ ہے "گھر"۔

رات گہری ہو رہی تھی۔ اُسے اندازہ تھا کہ گھر میں سب اُسکے لیے پریشان ہو رہے ہونگے اسلیے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ گھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن یہ طے تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی ہوسٹل واپس چلی جائے گی ورنہ اُسکا جذباتی پن اُسے پھر سے اپنے باپ کے مقابل لا کھڑا کرے گا۔ سکندر حیات خان اگر ایک روایتی زمیندار تھے تو زویا سکندر بھی اُنھی کی بیٹی تھی۔ اُس میں بھی انکا ہی خون تھا، خودسر، منہ زور، ضدی اور جذباتی......

رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے جب زویا گھر واپس لوٹی۔ لونگ روم میں اُسکی ماں اور بہن اُسکے لیے پریشان بیٹھی تھیں۔ زویا کو دیکھتے ہی دونوں اُسکی طرف بڑھی تھیں۔

"کہاں چلی گئی تھی تم؟" زویا کی ماں رخشندہ حیات خان نے سوال کیا۔

"جہاں اس جہنم سے میری جان کچھ دیر کے لیے چھوٹ جاتی ہے۔" زویا نے تلخی سے جواب دیا۔

"بیٹا تم کیوں اپنے باپ کے منہ کو آتی ہو؟ تمہارے اسطرح لڑنے جھگڑنے سے کچھ بدل نہیں جانا، لیکن اس طرح تم اُنکی نظر میں بری بنتی ہو۔"

"مجھے اچھا بن کے کرنا بھی کیا ہے؟"

"اپنی بہن کو دیکھو۔ کیا وہ کبھی یوں اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ بحث کرتی ہے؟"

"میرا موازنہ مہرو کے ساتھ نہ کریں۔"

"کیوں نہ کروں؟ تمہاری بہن ہے وہ۔ تمہیں اُس سے سبق سیکھنا چاہیے۔"

"جی بالکل۔ سیکھ لیا ہے سبق میں نے۔ میں بھی اُسکی طرح چپ رہی تو ایک دن مجھے بھی اُسکی طرح کسی وڈیرے کی دوسری

بیوی بننا پڑے گا۔"

"تو تم کیا سمجھتی ہو اس طرح خودسری اور منہ زوری سے تمہیں اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار مل جائے گا؟"

"میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا ملے گا۔۔۔ لیکن میں غلط باتوں پہ خاموش نہیں رہ سکتی۔ ہم بیٹیاں بھی انسان ہوتی ہیں اور یہ بات بابا جان کو معلوم ہونی چاہیے۔ جو کچھ مہرو کے ساتھ ہونے جا رہا ہے وہ سب میں چُپ چاپ برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ لوگ اُسکی زندگی تباہ کرنے پہ تُلے ہوئے ہیں۔ اُس سے دوگنی عمر کے پہلے سے شادی شدہ آدمی سے اُسکی شادی کروا رہے ہیں۔ اُسے کسی کی سوتن بنا رہے ہیں آپ لوگ۔ کبھی سوچا ہے کہ وہ ایسی شادی سے خوش بھی رہ سکے گی یا نہیں؟؟؟"

"تمہارے بابا کے فیصلے کے آگے ہم سب کو سر جھکانا ہی پڑتا ہے بیٹا۔ ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں؟" رخشندہ بیگم نے دکھی لہجے میں بے بسی کا اظہار کیا۔

"آپ لوگ کریں ایسے فیصلوں پہ سرِ تسلیم خم۔ یہ سب مجھ سے نہیں ہوگا۔ نہ ہی میں اپنی بہن کی بربادی کے تماشے کا حصہ بنوں گی۔ جا رہی ہوں میں یہاں سے۔۔۔۔" زویا نے تلخ لہجے میں کہا اور اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مہرو اور رخشندہ بیگم دونوں اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔ رخشندہ بیگم نے التجائیہ نظروں سے مہرو کو دیکھا۔

"امی جان آپ پریشان نہ ہوں۔ میں اُسے سمجھاتی ہوں، آپ تو جانتی ہیں یہ کتنی جذباتی ہے۔" مہرالنساء نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مہرو خدا کے لئے اِسے سمجھاؤ۔ ورنہ اسکا باپ میرے ساتھ پتہ نہیں اسکا بھی کیا کرے گا۔۔۔؟" رخشندہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

"ارے امی جان۔ خدا کے لئے خود کو سنبھالئے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں اُسے سمجھا لوں گی آپ فکر نہ کریں۔"

"اُسے سمجھاؤ۔ روکو اُسے ورنہ وہ ہوسٹل جا کر واپس نہیں آئے گی اور اسکا باپ مجھے قصوروار ٹھہرائے گا۔"

"میں روکتی ہوں اُسے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ جب مجھے بابا جان کا فیصلہ قبول ہے تو پھر کسی کا بھی بولنا بے سود ہے۔۔۔۔" مہرو کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ مہرو بالکل اپنی ماں کی طرح تھی، نرم طبیعت، قدم قدم پہ سمجھوتے کرنے والی، باپ کے فیصلوں پہ سر جھکانے والی، اپنی ماں کے دکھوں کو دل میں اُتار جانے والی چپ چاپ سب سہہ جانے والی، وہ بالکل اپنی ماں کی روش پہ چل رہی تھی۔ لیکن زویا۔۔۔ زویا بالکل اپنے باپ سکندر حیات خان کا پرتو تھی۔ بے حد جذباتی اور منہ زور، کبھی کسی کی غلط بات برداشت نہیں کرتی تھی، اپنے حق کے لئے لڑ جانے والی، اپنی بات منوا کر ہی رہتی تھی۔ وہ کبھی مہرو کی طرح ڈرتی اور جھجکتی نہیں تھی، باپ اور بھائیوں کے بھی مقابل کھڑے ہونے سے نہیں ڈرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سکندر حیات خان نے اُسے شہر میں ہوسٹل میں بھیج دیا تھا۔ وہ سکول کے زمانے سے ہوسٹل میں بھیج دی گئی تھی اور شاید یہی وجہ تھی کہ زویا کا جذباتی پن اور ضد اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ غلط بات کرتی تھی۔۔۔۔

مسئلہ بھی تھا کہ وہ جو بھی تھی صحیح کہتی تھی... لیکن یہاں عورتوں کی سنتا کون تھا؟ یہاں تو صرف ایک مرد کا حکم چلتا تھا۔ یہ تو سکندر حیات خان کی سلطنت تھی جہاں صرف حکم دیئے جاتے تھے اور سرِ تسلیم خم کیئے جاتے تھے۔ یہاں کوئی دہائی نہیں دی جا سکتی اور نہ فیصلے بدلے جاتے تھے۔ لیکن زویا سکندر حیات خان کی سلطنت کا ایک باغی باشندہ تھی جو اُسکے بنائے ہوئے اصولوں اور کیئے گئے فیصلوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

تبریز مسلسل اُسکا نمبر ڈائل کر رہا تھا جیسے اُسے اُمید ہو کہ کبھی نہ کبھی تو وہ اپنا نمبر آن کرے گی۔ لیکن اُسے مایوسی کا سامنا ہی کرنا پڑا تھا۔ تبریز کی حالت دن بہ دن ایسی ہوتی جا رہی تھی جیسے کوئی پھول پانی نہ ملنے سے آہستہ آہستہ مرجھاتا جاتا ہے۔ رومی کے بغیر جینا اُسکے لیئے پل پل مرنے کے مترادف تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ کاش وہ اُسے اس پل پل مرنے کے لئے چھوڑنے کے بجائے ایک ہی بار اپنے ہاتھوں سے مار جاتی تو بہتر تھا۔ اس طرح جدائی کی آگ میں جلتے رہنے سے تو بہتر تھا کہ وہ مر جاتا۔ اور ایسی کوشش بھی وہ کر کے دیکھ چکا تھا۔ لیکن موت نے بھی اُسکو قبول نہ کیا تھا۔ نہ رومیسہ ہی اُسکی زندگی میں لوٹ کر آئی تھی۔ اُسے رہ رہ کر اپنے باپ پہ غصہ آتا تھا جنکی ضد نے اُس سے اُسکی محبت چھین لی تھی۔ اگر وہ راضی ہو جاتے تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ رومی صرف اور صرف اُسکی ہوتی۔ لیکن صرف اُسکی ضد کی وجہ سے، صرف اُنکے راضی نہ ہونے کی وجہ سے رومی کے گھر والوں نے انکار کر دیا اور رومی ایسی لڑکی نہیں تھی کہ وہ کورٹ میرج جیسا قدم اُٹھاتی۔ وہ نہایت شریف گھرانے کی خاندانی لڑکی تھی جسے ہر چیز سے زیادہ اپنے خاندان اور ماں باپ کی عزت کا خیال تھا..... محبت سے بھی زیادہ۔ اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے تبریز کا ساتھ چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تبریز اُس کی خاطر سب سے منہ موڑ لے۔

تبریز نے ایک بار پھر رومی کا نمبر ڈائل کیا اور اس بار خوش قسمتی سے لائن کنیکٹ ہو گئی۔

"ہیلو"

رومی کی آواز کان میں پڑتے ہی تبریز کی دھڑکن جیسے تیز ہو گئی اور فرطِ جذبات سے اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"رومی....." تبریز کے منہ سے بمشکل اُسکا نام ہی نکل سکا تھا۔

"بولو۔ کیا بات ہے؟" رومیسہ نے سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

"رومی..... خدا کے لئے میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں تمہارے بنا نہیں جی سکتا۔"

تبریز کی آواز لرز رہی تھی اور آنسو مسلسل اُسکی گالوں کو بھگو رہے تھے۔

"ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے اب...... نہ تمہارے گھر والے مانیں گے اور اب میرے گھر والے بھی اس بات پہ راضی نہیں ہیں۔ وہ کسی صورت یہ رشتہ قبول نہیں کریں گے۔"

"جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا کیا قصور ہے رومی؟ تم مجھے تھوڑا سا وقت اور دو۔ میں سب کچھ ٹھیک کر دوں گا، میں سب کو منا لوں گا۔"

"اور کتنا وقت لگنا تھا تبریز....؟ ہم چھ سال سے ساتھ تھے۔ساتھ پڑھا لکھا ہم نے، لڑکپن سے جوانی تک.....اور کتنا وقت چاہیے تھا تمہیں اور تمہارے گھر والوں کو؟" روی نے بپھرے ہوئے انداز میں جرح کیا تھا۔

"روی میری جان۔۔میں جانتا ہوں میرے گھر والوں کی غلطی ہے۔لیکن پلیز مجھے ایک موقعہ اور دو۔بس تھوڑا سا وقت اور دے دو پلیز میں تمہاری منت کرتا ہوں بس ایک اور موقعہ دے دو....."

"ہونہہ...ایک اور موقعہ....مجھے اور میرے خاندان کو رُسوا کرنے کے لئے؟"

"پلیز روی۔ایسا مت کہو...یہ صرف غلط فہمی ہے۔تمہارے بابا کو کسی نے غلط بتایا ہے میرے بابا ایسے نہیں کہہ سکتے۔خدا کے لئے میرا یقین کرو۔"

"بس کرو تبریز۔اب تمہاری کسی بھی صفائی کا مجھ پہ کوئی اثر نہیں ہوگا۔جھوٹ تو تم نے مجھ سے بولے...اپنے بچپن کی منگنی مجھ سے چھپائی اور ہمیشہ جھوٹ بولا کہ تمہارے گھر والے مجھے دل سے قبول کریں گے۔"

"کس منگنی کی بات کر رہی ہو؟ وہ منگنی جس کے بارے میں مجھے بھی لاعلم رکھا گیا تھا....مجھے خود نہیں معلوم تھا تو تمہیں کیسے بتاتا؟"

"جھوٹ...ہو ہی نہیں سکتا کہ اتنی بڑی بات کا تمہیں علم نہ ہو۔اور اگر بالفرض علم نہیں بھی تھا تو کیا تمہیں اپنے گھر اور خاندان کے رسموں رواج کا بھی علم نہ تھا؟ کیا نہیں جانتے تھے کہ تمہارے خاندان میں غیروں میں شادی نہیں کرتے؟"

"ہاں ایسا ضرور ہے کہ ہمارے یہاں خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے تھے لیکن جب میں نے اس اصول کو ماننا ہی نہیں تھا تو تمہیں بتا کر پریشان کیوں کرتا؟"

"ہونہہ...تمہارے ماننے یا نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ ہونا تو وہی تھا جو تمہارے ماں باپ نے چاہا تھا۔وہ کیوں اپنی بھتیجی پہ مجھے ترجیح دیتے جبکہ انہوں نے پہلے کبھی کسی بچے کی پسند کو اہمیت نہیں دی تھی تو تمہیں اس اصول سے استثنیٰ کیسے مل جاتا؟"

روی کا لہجہ تلخ اور طنزیہ ہوتا جا رہا تھا اور تبریز کے لئے اُسکے سوالوں کے جواب دینا مزید مشکل ہو رہا تھا۔وہ اُسے کسی طور بھی راضی نہیں کر پا رہا تھا۔

"میں اُنہیں منا لیتا روی۔تم مجھے ایک موقعہ تو دو۔بس آخری بار؟" تبریز نے التجائیہ انداز میں کہا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ اس سے کوئی فائدہ ہے اب۔بھول جاؤ مجھے اور جہاں گھر والے کہتے ہیں شادی کر لو۔میں نہیں چاہتی کہ تم زبردستی اُنکو اپنی بات ماننے پہ مجبور کرو۔"

"وہ اپنی خوشی سے تمہارا ہاتھ مانگنے آئیں گے۔تم دیکھ لینا...."

"ہاں۔جیسے پہلے آئے تھے...." روی نے طنز کیا۔

"میں کوشش کر رہا ہوں اُنکو منانے کی۔ایک ہفتے تک میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ تمہارے گھر رشتہ لیکر آئیں۔" تبریز نے روی

کے طنز کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"چلو دیکھتے ہیں۔" روی نے کہا اور فون رکھ دیا۔

تبریز بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن روی نے کوئی بات نہیں سنی اور فون بند کر دیا۔ لیکن کم از کم بات تو کی اُس نے اور تبریز کے لئے یہ بھی بہت تھا کہ اُسکی آواز ہی سن لی ورنہ پچھلے ایک ماہ سے مسلسل کوئی رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ پھر بھی ایک اُداسی سی دل میں چبھن کر رہی تھی کہ اب اُسکی روی پہلے جیسی نہیں رہی تھی، پتہ نہیں وہ کیوں اتنا بدل گئی تھی.... لیکن جو بھی تھا وہ اُسکے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ روی ہی اُسکی پہلی اور آخری خواہش تھی اور وہ اُسے پانے کے لئے ہر کسی سے لڑ سکتا تھا ہر حد پار کر سکتا تھا۔ تبریز کو لگتا تھا جیسے وہ اُسی کے لئے بنائی گئی ہے ۔ اُسے آج بھی وہ دن یاد ہے جب اُس نے روی کو پہلی بار دیکھا تھا اور دیکھتے ہی اپنا دل ہار بیٹھا تھا۔ روی اور وہ ایک ہی انسٹیٹیوٹ سے پڑھے تھے اور لڑکپن کی عمر سے تبریز نے روی کو چاہا تھا۔ پہلے یہ محبت یک طرفہ تھی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ روی بھی اُسے بے حد چاہنے لگی تھی۔ روی کی سادگی اور معصومیت تبریز کو بہت بھاتی تھی، وہ اپنی عمر کی لڑکیوں سے یکسر مختلف تھی ۔ بے حد سادہ اور بے حد خوبصورت اور سب سے بڑھ کر باسیرت۔

خوبصورتی اور خوب سیرت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین بھی تھی ۔ ہر کوئی اُسکی خوبیوں کے گُن گاتا تھا، سارے ٹیچرز اُسکی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے تھے۔ صرف تبریز ہی نہیں تھا جو اُسکے آگے پیچھے گھومتا تھا اور بھی بہت سے لوگ تھے جو روی سے بے حد متاثر تھے اور اُس سے شادی کے خواہش مند بھی تھے ۔ لیکن روی نے صرف تبریز کو دل میں جگہ دی تھی اور زندگی میں بھی۔ تبریز، روی کی محبت پا کر بے حد مسرور رہا کرتا تھا اور ہر پل اپنی قسمت پہ نازاں تھا لیکن اُسے کیا معلوم تھا کہ وقت اور حالات کی تلخیاں اُنکے پیار میں زہر گھول دیں گی اور جدائی اُنکا مقدر ٹھہرے گی۔

شام کے سات بج رہے تھے جب تبریز آفس سے گھر آیا تھا اور پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے ڈرائنگ روم سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں جا رہا تھا جب بلقیس بیگم نے اُسے آواز دی تھی ۔ آج کافی دنوں کے بعد وہ اتنی جلدی گھر آیا تھا ورنہ جب سے روی سے رابطہ ختم ہوا تھا وہ رات رات بھر دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کر کے فجر کے وقت ہی گھر لوٹتا تھا۔ آج بھی گھر جلد آنے کا ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ وہ ماں سے بات کر سکے تاکہ روی کے گھر جا کر اُسکا رشتہ پھر سے مانگیں۔ ماں کے علاوہ وہ اور کسی سے مدد طلب نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ گھر میں وہی ہوتا تھا جو اُسکے بابا چاہتے تھے ۔ اور بابا سے بات صرف اُسکی ماں ہی کر سکتی تھیں چاہے ڈرتے ڈرتے ہی سہی......

ماں کے آواز دینے پہ تبریز سیدھا اُنکے پاس چلا گیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُسکی نظر اپنی بہن پہ پڑی تھی جو کافی دنوں بعد سسرال سے آئی تھی اور تبریز کو دیکھتے ہی وہ اُسکی طرف لپکی تھی۔

"تبریز میرے بھائی یہ تم نے اپنا کیا حال بنا لیا ہے؟" صبا نے بھائی کو گلے لگاتے ہوئے بے چینی سے کہا۔

"ٹھیک ہوں میں۔ مجھے کیا ہوا ہے؟" تبریز نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ٹھیک؟؟؟ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ کتنے کمزور ہو گئے ہو اور تمہاری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بن گئے ہیں۔ تم ایسے تو نہ تھے...." صبا نے بھائی کے چہرے پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تو کیا ہوا؟ زندہ تو ہوں مر تو نہیں گیا ناں...."

"اللہ نہ کرے۔ مریں تمہارے دشمن۔ کیوں اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو؟ کیوں اپنا خیال نہیں رکھتے؟" صبا تبریز کی بات پہ تڑپ گئی۔

"میری تباہی کے ذمہ دار تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ میں اپنا خیال کیوں نہیں رکھتا۔" تبریز نے تلخ لہجے میں کہتے ہوئے سامنے بیٹھے ماں باپ کی طرف اشارہ کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ صبا نے بے بسی سے ماں باپ کی طرف دیکھا تھا۔ تبریز کی بات پہ محمود صاحب کا خون کھول اُٹھا تھا اور وہ غصے میں تیز تیز سانس لینے لگے تھے۔

"دیکھ رہی ہو تم اپنے لاڈلے بھائی کی حرکتیں...؟" محمود صاحب نے غصے میں پھنکارتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

"بابا جان آپ ہی ضد چھوڑ دیں۔ آخر برائی کیا ہے اُسکی پسند میں؟" صبا نے باپ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"ضد میں کر رہا ہوں یا یہ کر رہا ہے؟ اپنی بہن کو کیا منہ دکھاؤں گا میں اگر اسکی بات مان لی تو؟"

"لیکن بابا یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ یہ رشتے زبردستی نہیں جوڑے جا سکتے۔ جوڑ بھی لئے جائیں تب بھی زندگی بھر نباہ نہیں کیا جاتا آخر کار ایسے رشتوں کا انجام برا ہی نکلتا ہے...."

"میں کچھ نہیں جانتا۔ تبریز کی شادی خاندان سے باہر نہیں ہوگی۔ جیسے تم بڑوں کی شادیاں خاندان سے باہر نہیں ہوئیں ویسے ہی اُسکی بھی نہیں ہوگی..."

"بابا اگر ہم میں سے کسی ایک کی شادی خاندان سے باہر ہو جائے تو کیا برائی ہے؟ وہ بہت اچھے لوگ ہیں، آپ تبریز کی بات مان لیں ورنہ وہ خود کو برباد کر لے گا۔ آپ نے دیکھ ہی لی ہے اُسکی حالت...."

"ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر میں نے تبریز کی شادی اُسکی مرضی سے کر دی تو کل کو شاریز بھی اپنی مرضی کرنے لگے گا۔ آج اگر اپنی بہن کا مان توڑ دیا میں نے۔ اُسکی بیٹی جسکو بچپن سے تبریز کے نام پہ بٹھا رکھا ہے اُسکی جگ ہنسائی ہو جائے گی.... پورا خاندان مجھ سے منہ موڑ لے گا۔ کل کو شاریز بھی اپنی پسند کی شادی کا مطالبہ لے کر آ جائے گا پھر کیا تمہاری خالہ کو بھی اسی طرح ذلیل و رسوا کرواتا پھروں گا میں...؟"

"اگر آپکو اتنا ہی خیال تھا اپنی اور اپنے خاندان والوں کی عزت کا تو آپ نہ ایسے رشتے جوڑتے اگر آپ پہلے ہی ایسے قدم نہ اُٹھاتے تو آپکو ایسے مسئلے ہی نا جھیلنے پڑتے..." صبا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"کہنا کیا چاہ رہی ہو تم؟ صاف صاف بات کرو۔ اپنی اولاد کے اچھے برے کا فیصلہ کرنے کا مجھے پورا حق اور اختیار حاصل ہے۔ پھر کیوں نہ کرتا میں اُنکی شادی کے فیصلے؟"

"کیوں نہیں بابا۔ کریں آپ فیصلے ضرور کریں۔ لیکن کم از کم اولاد کی پسند نہ پسند کا خیال نہ سہی، ایک بار اُنکی مرضی ہی جان لیتے ایسے فیصلے کرنے سے پہلے۔۔"

"اولاد کا اچھا بُرا ماں باپ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں جان سکتا۔"

"بے شک ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ایک بات آپکو یاد رکھنی چاہیے تھی بابا۔ وہ یہ کہ زور زبردستی، ظلم اور خاندان کی حرمت کا پاس بیٹیاں ہی رکھا کرتی ہیں، بیٹوں سے ایسی کوئی اُمید نہیں رکھی جا سکتی۔۔" صبا نے کرب بھرے انداز میں کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

محمود صاحب بیٹی کی بات سن کر ششدر سے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ اور بلقیس بیگم ہنا کچھ کہے باپ اور بچوں کی اس جنگ کو تکتی رہیں تھیں کیونکہ سامنے حیران سا کھڑا یہ شخص اور اسکی اولاد دونوں ہی اُسکے بس سے باہر تھے۔ محمود صاحب کے احکام کی تکمیل اُنکے جن بچوں نے کرنی تھی وہ کر چکے تھے اور اب تبریز اور شاریز کی باری تھی۔ تبریز پہ اُنکا کوئی زور نہیں چل رہا تھا کیونکہ وہ ہو بہو اُنہی کا پرتو تھا۔ اور سب سے چھوٹا شاریز اپنے بڑے بھائی کے نقشِ قدم پہ نہ چل پڑے اسی لیے محمود صاحب زیادہ پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ تبریز کی شادی اُسکی بچپن کی منگیتر سے ہی ہو تبریز چاہے نہ چاہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تبریز کی مرضی نہیں چلے گی تو شاریز کی بھی ایسا کچھ کرنے کی ہمت نہیں ہوگی۔ بس کچھ بھی ہو محمود صاحب ٹھان چکے تھے کہ وہ کسی صورت بھی تبریز کی بات نہیں مانیں گے اور نا ہی اپنے خاندان سے تبریز کی خاطر لڑائی مول لیں گے۔ تبریز کی بات ماننے کا مطلب تھا سارے خاندان میں بدنامی اور رسوائی اور ہمیشہ کے لئے خاندان سے کٹ جانا۔۔۔ محمود صاحب کو اولاد اور خاندان میں سے کسی ایک کو چننا تھا اور اُنہوں نے بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا۔ تبریز بھی اپنی ضد کا پکا تھا۔ نہ وہ اپنی چاہت سے دست بردار ہو رہا تھا اور نہ محمود صاحب اپنے فیصلے سے پیچھے ہٹنے والے تھے۔

☆---☆---☆

پورے ایک ہفتے کی کوششوں کے بعد آخر عرشیہ کو اخبار میں ایک مناسب جاب مل ہی گئی۔ عرشیہ نے اپنی سی۔وی بذریعہ ای۔میل بھیج دی تھی اور دو دن بعد اُسے انٹرویو کال آ گئی تھی۔ وہ بہت خوش تھی لیکن اُسنے گھر میں کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا۔ کل صبح گیارہ بجے اُسکا انٹرویو تھا اور اُس نے سوچ لیا تھا کہ رات کے کھانے پہ سب کو بتا دے گی جو فیصلہ بھی اُسنے اپنے لئے کیا تھا۔ رات کے 8 بجے جب سب لوگ ڈائننگ ٹیبل پہ کھانا کھا رہے تھے تب عرشیہ نے بابا کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے کل کے انٹرویو کے بارے میں بتایا تھا اور حسبِ توقع بابا اور شیراز بھائی کو اعتراض ہوا تھا۔ بھابی تو ویسے بھی اُسکے کسی بھی معاملے میں بولنا پسند نہیں کرتیں تھیں، نا حمایت میں اور نا ہی مخالفت میں۔

"کیا ضرورت ہے تمہیں جاب کرنے کی؟" شیراز نے کھردرے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"میں خود کو مصروف رکھنا چاہتی ہوں۔" عرشیہ نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"تو گھر میں کم کام تو نہیں ہوتے خود کو مصروف رکھنے کے لئے۔"

"گھر کے کام گھر میں رہ کر کرنے پڑتے ہیں اور ان سے دل پھر بھی نہیں بہلتا کیونکہ گھر میں ایک ہی ماحول ہوتا ہے۔"

"باہر کا ماحول تم جیسی شریف اور خاندانی لڑکیوں کے لئے ہوتا بھی نہیں۔ گھر کا ماحول ہی اچھا ہوتا ہے تم لوگوں کے لئے۔ اسلئے کوئی جاب شوب نہیں کرنی۔ گھر پہ بیٹھو آرام سے..." شیراز نے تحکمانہ انداز میں کہا تو بابا بھی سمجھانے کے لئے بول پڑے۔

"ہاں بیٹی۔ بھائی ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آجکل باہر کا ماحول اچھا نہیں ہے۔ لڑکیوں کا گھر سے باہر کام کرنا مناسب نہیں لگتا۔" بابا نے پیار سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ماحول انسان خود بناتا ہے اور انسان کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ ماحول کے رنگ میں خود کو رنگ لے یا نہ رنگے..." عرشیہ نے دلیل پیش کی۔

"جاب کرنے والی لڑکیوں کو خاندانی لوگ اچھا نہیں سمجھتے اور نا ہی ایسی لڑکیوں سے رشتہ کرتے ہیں جو باہر مردوں کے ساتھ کام کرتی پھرتی ہیں۔" شیراز نے کہا۔

"ہونہہ.....تو گھر بیٹھی جو بوڑھی ہو جاتی ہیں اُن میں بھی تو یہ 'سو کالڈ خاندانی' لوگ بُرائیاں نکال کے چلے جاتے ہیں۔" عرشیہ نے جلے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"بس میں جو کہہ رہا ہوں وہ کرو۔ تمہارا بڑا بھائی ہوں، تمہارے بھلے کے لئے ہی کہہ رہا ہوں۔"

"ہونہہ...میرا بھلا...کیا بھلائی ہے اس میں میری؟ جتنے سال میں نے آپ لوگوں کے کہنے پہ اپنی زندگی کے ضائع کئے ہیں اتنے سالوں میں تو میں پی۔ ایچ۔ ڈی بھی کر لیتی اور آج اپنا کریئر بنا چکی ہوتی۔ اسطرح رشتوں کے انتظار میں ذلیل و خوار نہ ہو رہی ہوتی..."

عرشیہ کا لہجہ بے حد تلخ ہو گیا تھا۔ اُس نے مٹھیاں بھینچ لیں تھیں اور ضبط کرنا اُسکے لئے نہایت مشکل ہو رہا تھا۔

"ہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیتی.... ایم۔ اے کر کے برابر کا پڑھا لکھا لڑکا ڈھونڈنا اتنا مشکل ہو گیا ہے اور اگر واقعی کر جاتی پی۔ ایچ۔ ڈی تو کیا بنتا؟" شیراز نے مذاق اُڑانے والے انداز میں کہا۔

"بس بہت ہو گیا۔ شادی شادی شادی.....اسکے علاوہ بھی زندگی کچھ ہو سکتی ہے آپ لوگ کیوں نہیں سمجھتے؟ نہیں کرنی مجھے شادی، بھاڑ میں جائیں سب رشتے اور یہ شادی۔ میں کل انٹرویو دینے ضرور جاؤں گی اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ دیکھتی ہوں کون روکتا ہے مجھے....."

عرشیہ نے زور سے ٹیبل پہ ہاتھ پٹخے تھے اور غصے میں چلاتے ہوئے اُسکی آنکھیں اس دکھ اور کرب سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ذلت کے اس احساس نے اُسے روح تک گھائل کر دیا تھا اور اب وہ ایک زخمی شیرنی کی طرح دھاڑ رہی تھی جو اپنے دفاع اور بقا کی آخری بھرپور کوشش کر رہی ہو۔ سب لوگ حیران اور ششدر سے اُسے دیکھتے گئے۔ کسی نے بھی اس سے پہلے اُسکا ایسا روپ نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو نہایت نرم گفتار اور شائستہ لب و لہجے کی مالک تھی۔ اچانک ہی اُس میں ایسی تلخی اور تیزی کہاں سے آ گئی تھی یہ بات نہ وہ خود جانتی تھی اور نہ

ہی سب گھر والے۔ لیکن صبیحہ بیگم بیٹی کے کرب کو سمجھ سکتیں تھیں اسلئے اس بار انہوں نے مداخلت کی تھی۔

"عرشی میری بچی بس کرو۔ اتنا غصہ نہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا بیٹا۔"

"بس امی اب بہت ہو گیا۔ نہیں ہوتی مجھ سے روز روز یہ تذلیل برداشت۔ ان سب سے کہہ دیں کہ مجھے میری زندگی میری مرضی سے جینے دیں، اٹھائیس سال انکی مرضی کے گزار چکی ہوں میں۔ اب اگر یہ سب بند نہ ہوا تو پاگل ہو جاؤں گی میں، ورنہ ڈپریشن کے مارے خودکشی کرلوں گی کہہ رہی ہوں میں آپ لوگوں کو۔"

عرشیہ اُٹھ کے وہاں سے چلی گئی تھی اور سب ہکا بکا سے اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ صبیحہ بیگم نے بے چارگی بھری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔

"بیٹا کرنے دو اسے ٹیچنگ میں کیا برائی ہے آخر یہ نبیوں پیغمبروں کا پیشہ ہے۔ اور شادی ہونا یا نہ ہونا تو نصیب کی بات ہے۔۔۔ پتہ نہیں کیا لکھا ہے میری بچی بیچاری کے نصیب میں خدا نے"

"ہاں بیٹا۔ کر لینے دو اسے ذرا دھیان بٹ جائے گا اسکا۔ ورنہ پتہ نہیں کیا کیا سوچنے لگی ہے آجکل۔۔" بابا نے ایک سرد آہ بھری تھی۔

"لیکن بابا ماحول اچھا نہیں ہے لڑکیوں کے لئے۔" شیراز نے کمزور سی دلیل دی تھی۔

"بیٹا ماحول کیسا بھی ہو انسان کی تربیت اچھی ہو تو کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اور بھی بہت سی لڑکیاں بھی کرتیں ہیں اچھے گھروں کی۔ اب تو لوگوں کی سوچ بدل رہی ہے بیٹا۔ یہ اپنے پڑوس میں چوہدری صاحب کی بیٹی بھی جاب کرتی ہے اور ابھی پچھلے ماہ ہی اُسکی منگنی ہوئی ہے۔" صبیحہ بیگم نے مثال دے کر بیٹے کو قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ٹھیک ہے امی جان۔ جیسا آپ لوگ مناسب سمجھیں۔" شیراز نے ہار مانتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

☆......☆......☆

مہرو ماں کو تسلی دے کر مطمئن کر چکی تو زویا کے کمرے میں آ گئی جہاں حسب توقع زویا اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ مہرو نے زویا کے سوٹ کیس کو جسے وہ سامان سے بھر رہی تھی خالی کرنا شروع کر دیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟" زویا نے غصے سے کہا۔

"وہی جو مجھے کرنا چاہیے۔"

"چھوڑو مجھے پیکنگ کرنے دو۔ میں مزید یہاں نہیں رہ سکتی۔"

"کوئی اپنی بہن کی شادی پہ بھی گھر چھوڑ کر جاتا ہے؟ تم کیسی بہن ہو زویا؟"

"ہاں۔ نہیں جاتا کوئی لیکن میں جا رہی ہوں۔ کیونکہ میری بہن کی شادی نہیں بربادی ہو رہی ہے جسے میں دیکھنے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔"

"اری پاگل... تجھے کس نے کہا کہ یہ بربادی ہے؟ ہمارے خاندان میں ایسی ہی شادیاں تو ہوتی ہیں زویا... چھ ماہ پہلے سکینہ پھپھو کی بیٹی رخسار کی بھی تو شادی یوں ہی ہوئی تھی۔ اب دیکھو وہ کیسے رانی بن کر راج کر رہی ہے اپنی حویلی میں اور اسکی سوتن اس کا اتنا خیال رکھتی ہے..." مہرو نے نظریں چراتے ہوئے زویا کو اپنی زندگی میں آنے والی خوشیوں کی یقین دہانی کرانی چاہی جن کا اُسے خود بھی کوئی یقین نہیں تھا۔

"ہاں اپنی باپ کی عمر کے جاگیردار کے ساتھ جسکے پہلے سے تین جوان اولادیں ہیں اور اُسے رخسار سے کوئی اولاد بھی نہیں چاہیے... یا شاید وہ خود اب اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا۔ ہونہہ..." زویا غصے سے پھنکاری۔

"یہ باتیں تمہیں کس نے بتادیں میری ماں؟" مہرو سرپیٹ کر رہ گئی۔

"خود رخسار نے۔"

"کیا واقعی؟"

"ہاں مہرو۔ ابھی بھی وقت ہے انکار کردو اس شادی سے"

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے زویا؟ اگلے ہفتے میری شادی ہے بابا جان زبان دے چکے ہیں۔ اب یہ ناممکن ہے۔"

"کچھ بھی ناممکن نہیں ہوتا مہرو۔ تم انکار کردو، میں سب کو دیکھ لوں گی۔"

"اوہ میری بہادر شیرنی... بس کرو اب اور چلو یہ سامان واپس رکھو کہیں نہیں جا رہی تم اور نہ میں انکار کروں گی کیونکہ میں خوش ہوں۔"

"وجہ بتا سکتی ہو اس خوشی کی؟"

"ملک فراز ایک اچھے اور سوبر انسان ہیں۔ اور تم جانتی ہو مجھے کم عمر چھچھورے لڑکے نہیں پسند.... میری اپنی بھی خواہش تھی کہ ایک میچور اور سنجیدہ شخص میرا جیون ساتھی بنے۔"

"میچور اور سنجیدہ تک تو ٹھیک تھا لیکن عمر رسیدہ اور شادی شدہ ہونا تو کچھ ایکسٹرا کوالیٹیز ہی ہیں تمہارے ان ملک فراز قصوری میں..."

زویا نے تمسخرانہ انداز میں کہا تو مہرو کو بھی ہنسی آ گئی۔ زویا نے بہن کو ہنستا دیکھ کر گلے لگا لیا۔ زویا اپنی بہن مہرو سے بے حد محبت کرتی تھی دنیا میں مہرو وہ واحد ہستی تھی جسکی بات زویا نہیں ٹال سکتی تھی۔ ماں باپ اور بھائیوں سے اُسکی کبھی نہیں بنی تھی صرف مہرو ہی جانتی تھی کہ اُسے کیسے سنبھالا جاسکتا ہے جب وہ جذباتی ہو جاتی تھی تو مہرو ہی اُسے سمجھاتی بجھاتی تھی۔ زویا سب سے چھوٹی تھی اور سب کی لاڈلی بھی خاص طور پہ مہرو کی۔

"اچھا بتاؤ۔ مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گی؟" مہرو نے لاڈ بھرے لہجے میں کہا۔

"چلو زیادہ فری نہیں ہو۔ میں کل جا رہی ہوں ہوسٹل۔"

"کیوں زوئی؟ اپنی بہن کی شادی کا تمہیں کوئی ارمان نہیں کیا؟"

''ارمان تو بہت تھے لیکن اسکی شادی کے نہیں...''

''ہائے کتنی بدقسمت ہوں میں.... لوگوں کی شادیاں ہوتی ہیں تو اُنکی بہنیں کتنے ناز اٹھاتی ہیں، ناچتی ہیں گاتی ہیں، مہندی لگاتی ہیں... میری ایک ہی بہن ہے اور وہ بھی مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے....'' مہرو نے روہانسی ہو کر کہا۔

''اچھا اچھا بس.. زیادہ سینٹی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ زویا حیات خان ابھی زندہ ہے مری نہیں۔'' زویا نے بہن کو روہانسا ہوتے دیکھا تو جذباتی لہجے میں کہا۔

''مریں تیرے دشمن۔'' مہرو نے زویا کے سر پہ چپت لگاتے ہوئے کہا۔ زویا کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے پھر سے بہن کے گلے لگ گئی تھی اور زور سے ایک بوسہ اُسکی گال پہ لیا تھا۔

اگلے دن صبح ناشتے کے بعد دونوں ڈرائیور کے ساتھ شوپنگ کے لئے شہر چلی گئیں تھیں۔ رخشندہ، زویا کے بدلے ہوئے رویے سے بے حد خوش تھیں کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ باپ بیٹی کے درمیان ایسے موقعے پہ کوئی بدمزگی ہو۔ سکندر حیات خان تو اپنے فیصلے سے پھرنے والے نہیں تھے، اسلئے زویا کا احتجاج بے سود ہی تھا۔ زویا اپنے باپ کی بھی لاڈلی تھی اسلئے جو باتیں مہرو اور رخشندہ اُن سے کرتے ہوئے ڈرتے تھے وہ زویا بڑی آسانی سے کرلیا کرتی تھی اور بھائیوں کے ساتھ تو وہ ویسے ہی لڑکا بن جایا کرتی تھی۔ لیکن یہ معاملہ کوئی عام سا مسئلہ نہیں تھا جس میں وہ اپنی ضد سے باپ کو زیر کر لیتی۔ رخشندہ بیگم نہیں چاہتی تھیں کہ زویا اپنے باپ کے لاڈ پیار کے علاوہ کوئی دوسرا روپ بھی دیکھے۔ وہ اُس روپ سے بے خبر تو نہیں تھی لیکن کبھی براہ راست اُنکے اُس روپ سے زویا کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ زویا نے ہمیشہ باپ کا لاڈ پیار دیکھا تھا جس میں رعب بھی ہوا کرتا تھا لیکن وہ کبھی بھی اُسکے لئے ایک سنگدل روایتی زمیندار نہیں بنے تھے جیسے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ ہوا کرتے تھے حتیٰ کہ اپنی بیوی کے ساتھ بھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ شہر کے بڑے تعلیمی اداروں میں پڑھ رہی تھی اور ہوسٹل میں رہنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ ضدی اور جذباتی تو وہ پہلے سے ہی تھی اور کچھ گھر کے سخت ماحول سے دوری اور اعلیٰ تعلیم کی وجہ سے منہ زوری اور خوداعتمادی میں بھی بے حد اضافہ ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

عرشیہ کا آج جاب پہ پہلا دن تھا اسلئے وہ صبح جلد بیدار ہو کر تیار ہونے لگی۔ وہ بہت نروس ہو رہی تھی کیونکہ اُس نے اس سے پہلے کبھی بھی کہیں جاب نہیں کی تھی اور بچوں کو پڑھانا اُسے بے حد مشکل لگ رہا تھا۔ لیکن وہ بہت خوش اور مطمئن تھی اُسے مصروف رہنے اور اپنی مرضی سے جینے کی اجازت مل گئی تھی۔ کبھی کبھی بڑی سے بڑی خوشی انسان کو وہ طمانیت نہیں بخشتی جو ایک چھوٹی سی خوشی مل جانے سے حاصل ہوتی ہے۔ عرشیہ کی خوشی کا بھی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ جلدی جلدی ناشتہ کر رہی تھی تاکہ ٹائم پہ سکول پہنچ سکے۔ امی اور ابو بھی اُسے خوش دیکھ کر مطمئن نظر آ رہے تھے۔ ناشتے کے بعد عرشیہ ابو کی گاڑی لے کر سکول کے لئے روانہ ہو گئی اور امی ابو خاص اُسکے خیریت سے جانے اور گھر لوٹ آنے کی دعائیں کر رہے تھے۔ ہمارے ہاں مڈل کلاس طبقہ اپنی بیٹیوں کے بارے میں ایسا ہی حساس ہوتا ہے۔ ذرا جو

بیٹی نے گھر سے قدم باہر نکالا ماں باپ کے دل کو دھڑکا ہی لگا رہتا ہے اور جب تک بیٹی خیریت سے گھر لوٹ نہیں آتی دل ہی دل میں دعا کرتے رہتے ہیں۔ یہ بات ہمارے معاشرے کے خوبصورت ترین پہلوؤں میں سے ایک ہے۔ عرشیہ سکول پہنچ کر سب سے پہلے پرنسپل کے آفس میں پہنچی تھی۔ صبح کے ٹھیک آٹھ بج چکے تھے۔ یہ سکول شہر کے پوش ترین علاقے میں واقع تھا اور سکول کی بلڈنگ بھی نہایت شاندار تھی۔ یہاں شہر بھر سے اور دوسرے چھوٹے شہروں سے بھی اُمراء کے بچے پڑھنے آتے تھے۔ عرشیہ کی کوالیفیکیشن تو بہت اچھی تھی لیکن تجربہ نہ ہونے کی وجہ سے اُسکو فی الحال چھوٹے بچوں کی کلاس ملی تھی۔

"مس عرشیہ۔ آپ کو نرسری کلاس کے لئے اپائنٹ کیا گیا ہے اور میری اسسٹنٹ آپکو کلاس روم تک گائیڈ کر دیں گی اور کورس آؤٹ لائن بھی آپکو دی جائے گی جس کے مطابق آپکو بچوں کو لیکر چلنا ہوگا۔" پرنسپل نے ضروری ہدایات دیتے ہوئے کہا۔

"آل رائٹ میڈم۔" عرشیہ نے جلدی سے کہا تھا۔

"اور اگر آپکو اس سلسلے میں کوئی بھی کنفیوژن ہو تو آپ وائس پرنسپل سے ڈسکس کر سکتی ہیں۔" پرنسپل نے کہا اور انٹرکام پہ اپنی اسسٹنٹ کو اندر بلایا۔ اسسٹنٹ فوراً اندر آ گئی۔ پھر پرنسپل نے اُسے عرشیہ کو کلاس روم تک لے جانے اور کورس آؤٹ لائن دینے کا حکم دیا۔ اسسٹنٹ عرشیہ ہی کی عمر کی تھی اور نہایت چالاک و چوبند لڑکی تھی وہ عرشیہ کو لیکر اپنے روم میں آئی وہاں سے کورس آؤٹ لائن پرنٹ نکال کر عرشیہ کو دیا اور اُسے کلاس روم تک چھوڑ کر چلی گئی۔ عرشیہ کلاس روم میں داخل ہوئی تو سب بچے خاموش ہو کر بیٹھ گئے جو کچھ دیر قبل شور و غل مچا رہے تھے۔ سب حیرانگی سے عرشیہ کو دیکھنے لگ گئے، چھوٹے چھوٹے بچے اُسے بہت پیارے لگ رہے تھے۔

My name la Arshla and I am your naw teachef۔ عرشیہ نے مسکراتے ہوئے بچوں کو مخاطب کیا۔ چند شرارتی بچے اُسے دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"سب بچے ون بائے ون مجھے اپنے نام بتائیں۔ سب سے پہلے آپ بتائیں۔" عرشیہ نے پہلی لائن میں بیٹھی ہوئی بچی سے کہا۔ پھر سب ایک ایک کر کے اُسے نام بتاتے گئے۔ پھر عرشیہ نے چند مزید سوالات کرنے کے بعد کورس کو دیکھا اور بچوں کو بڑے انہماک سے پڑھانے لگی۔ خوشی اُسکی ہر ہر بات سے نمایاں ہو رہی تھی۔ آج جیسے اُسے جینے کا مقصد مل گیا تھا اور وہ برسوں پرانی اُس گھٹن سے آزادی محسوس کر رہی تھی جس میں وہ زندگی کی قید کاٹ رہی تھی۔ وہ خوش اور مطمئن تھی کہ اب اُسے کسی کے سامنے 'شوپیس' کی طرح نہیں لایا جائے گا۔

☆......☆......☆

صبا نے جو کہنا تھا وہ کہہ کر کمرے سے نکل آئی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُسکی کوئی بات کوئی دلیل بھی اُسکے باپ کو موم نہیں کر سکتی۔ صبا کی آنکھوں میں لاچارگی کے آنسو تھے، آج اُسے تحریم کی یہ حالت دیکھ کر بہت دکھ ہوا تھا۔ صبا کو اپنا گزرا وقت یاد آنے لگا تھا۔ شہباز کا چہرہ اُسکی آنکھوں کے سامنے لہرا گیا تھا۔ صبا کو خود پہ گزری ہوئی وہ ساری تکلیفیں یاد آنے لگیں تھیں جو آج تحریم پہ گزر رہی تھیں لیکن فرق

صرف اتنا تھا کہ تبریز اپنی چاہت کو پانے کے لیے لڑ سکتا تھا اور صبا کیونکہ بیٹی تھی..ایک کمزور لڑکی تھی جسے اپنے ماں باپ کی عزت کا بوجھ اُٹھانا تھا اسلیے خاموش رہی اور کسی کو اپنے دل کی بات نہ بتا سکی کہ وہ شہباز سے شادی کرنا چاہتی ہے زمان سے نہیں۔زمان اُسکی پھوپھو کا بیٹا تھا اور شہباز اُسکے ماموں کا بیٹا لیکن پھر بھی صبا کو مجبوراً زمان سے شادی کرنی پڑی کیونکہ یہ اُسکے باپ اور بڑے بھائی سفیر کا فیصلہ تھا، جن کے فیصلے کے آگے کسی نے آواز نہ اُٹھائی تھی تو صبا کیسے اُٹھا سکتی تھی؟ سفیر اور محمود صاحب نے شہباز کا رشتہ قبول نہ کیا لیکن زمان کا رشتہ قبول کر لیا اور اسکے لیے صبا کی پسند ناپسند تو دور کی بات رضامندی لینا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ایسے میں صبا نے لب سی لیے تھے اور وہی کیا جو ہر فرمانبردار بیٹی کرتی ہے...چپ چاپ اپنے باپ کے فیصلے پہ سرِ تسلیم خم کر دیا تھا لیکن یہ صرف وہی جانتی تھی کہ وہ کس اذیت اور کرب سے گزری تھی۔شاریز کی آواز پہ وہ چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آئی تھی۔

"ارے آپا جان..آپ کب آئیں؟" شاریز نے دور سے اُسے دیکھتے ہی کہا تھا۔صبا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور مسکرا کر چھوٹے بھائی کو گلے لگا لیا۔

"بس ابھی کچھ دیر ہی ہوئی ہے۔تم بتاؤ کیسے ہو؟" صبا نے کہا۔

"میں بالکل ٹھیک ٹھاک...ہٹا کٹا۔" شاریز نے سینہ چوڑا کرتے ہوئے باڈی بلڈرز کی طرح پوز بناتے ہوئے کہا تو صبا کو ہنسی آ گئی اور اُس نے اُسے کان سے پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"مسٹر ہٹا کٹا...یہ بتایئے آپکی سٹڈیز کیسی جا رہی ہیں؟اس بار بھی ایف۔ایس۔سی کلیئر کرنی ہے یا پھر سے فیل ہونے کا ارادہ ہے؟"

"ارے آپا..اُف کتنی ظالم ہو کان تو چھوڑو کتنی زور سے پکڑا ہوا ہے..آہ.." شاریز نے صبا کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

"نہیں پہلے بتاؤ مجھے.." صبا نے اُسکا کان نہیں چھوڑا۔

"جی میں پوری تیاری کر رہا ہوں..اب تو کان چھوڑ دیں۔ابھی بھی سید حا ٹیوشن سینٹر سے آ رہا ہوں..اب تو کان چھوڑ دیں خدا کے لیے..اُف.." صبا اُسکے شور مچانے پہ ہنسنے لگی۔

"اچھا چلو چھوڑ دیا۔کیا یاد کرو گے.....لیکن اگر اس بار فیل ہوئے تو بہت پٹائی کرونگی۔" صبا نے شاریز کو تنبیہ کی تو وہ ذرا سر جھکا کر بڑے ادب سے بولا۔

"جو حکم ملکہ عالیہ.." شاریز کی حرکت پہ صبا کھل کھلا کر ہنس دی اور بہن کو مسکراتا دیکھ کر شاریز بھی ہنسنے لگا۔

"اچھا تم جا کر کھانا کھا لو۔میں تبریز کے پاس جا رہی ہوں اُس سے ضروری باتیں کرنی ہیں۔" صبا نے شاریز کو کہا تو وہ کبھی کبھی کر کے ہنسنے لگا۔صبا کو اُسکا یہ انداز کچھ عجیب سا لگا تو اُس نے شاریز کو ڈانٹا۔ "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟میں نے کوئی لطیفہ نہیں سنایا..."

"میں تو اسلیے ہنس رہا ہوں کہ رات کے اس وقت آپ جس کے پاس جا رہی ہیں وہ مجنوں تو اپنی لیلیٰ کے غم میں آنسو بہا رہا

ہوگا... کبھی کبھی..." شاریز پھر سے کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ صبا کو اُسکا یوں مذاق اُڑانا بالکل پسند نہیں آیا اور اُس نے ایک زوردار تھپڑ شاریز کے بازو پہ مارا اور غصے سے پیر پٹختی وہ وہاں سے چلی گئی۔ "اُف بڑی ظالم ہیں آپا آپ تو..." شاریز اپنا بازو سہلانے لگا۔ تبریز کے کمرے کا دروازہ بند تھا صبا نے آہستہ سے دستک دی۔ تھوڑی دیر بعد تبریز نے دروازہ کھولا تو صبا سامنے کھڑی تھی۔

"صباتم؟ آجاؤ اندر..." تبریز اُسے کہہ کر اندر آ گیا اور صبا بھی پیچھے پیچھے اندر آ گئی۔

"بولو کیا بات ہے؟ سب ٹھیک تو ہے ناں؟ زمان تمہارے ساتھ ٹھیک ہے کہ نہیں؟" تبریز نے بہن کے چہرے پہ پریشانی کے آثار دیکھے تو فکرمند ہو کر پوچھنے لگا۔

"سب ٹھیک ہے۔ زمان بھی ٹھیک ہیں۔" صبا نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو پھر تم اتنی اُداس کیوں ہو؟ اگر کوئی بات ہے تو مجھے بتاؤ؟" تبریز نے بہن کے اُداس چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں تمہارے لئے بہت فکرمند ہوں تبریز... تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ایسے تو نہیں تھے۔" صبا کے لہجے میں تاسف بھرا ہوا تھا۔ اُسکے کہنے پہ تبریز کے چہرے پہ اُداسی مزید گہری ہو گئی۔

"جب انسان اپنی محبت کھو بیٹھے تو ایسا ہی ہو جاتا ہے جیسا تمہیں میں دکھائی دے رہا ہوں..."

"سب ٹھیک ہو جائے گا تبریز... میں ابا کو منانے کی پوری کوشش کرونگی۔ وہ مان جائیں گے..." صبا نے بھائی کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ لیکن تبریز کے چہرے پہ ایک تلخ مسکراہٹ آ گئی۔ "کب مانیں گے وہ؟ جب روحی کے گھر والے اُسکو کسی اور کے ساتھ منسوب کر دیں گے تب؟؟؟" صبا تبریز کی بات سن کر کچھ پریشان سی ہو گئی۔ "کیا مطلب؟ کیا روحی ایسا ہونے دیگی؟" صبا نے پوچھا۔

"وہ مجھے جھوٹا سمجھنے لگی ہے..." تبریز نے تھکے ہارے لہجے میں صبا کو بتایا۔ صبا کچھ اُلجھ سی گئی تھی اُسکی سمجھ میں نہیں آئی تھی" جھوٹ کیسا؟" صبا نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ابا کے کسی دوست نے روحی کے بابا سے کہا ہے کہ میرے گھر والے اس رشتے پہ راضی نہیں ہیں... اور یہ کہ ہمارے خاندان میں نہ پہلے کبھی ایسی شادی ہوئی ہے جو خاندان سے باہر ہو اور نہ آئندہ کبھی ہوگی... اور یہ بھی کہ سب اس رشتے کے خلاف ہیں اور صرف تبریز کے مجبور کرنے پہ آئے تھے ورنہ کوئی بھی دل سے نہیں چاہتا۔" تبریز نے تفصیل بتائی تو صبا حیران رہ گئی۔ "لیکن وہ کسی کی بات پہ یونہی کیسے اعتبار کر سکتے ہیں تبریز؟" صبا نے حیرت سے پوچھا۔ "صرف یہی نہیں اُس آدمی نے روحی کے بابا کو ساری باتیں بتا دی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ میری بچپن کی منگنی ہو چکی ہے اور اگر میں یہ منگنی توڑ کر بضد روحی سے رشتہ کرونگا تو ابا مجھے گھر سے نکال دیں گے اور جائیداد میں سے عاق کر کے مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج کر دیں گے..." تبریز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کوئی اس طرح سے اُسکے پیار میں زہر گھول دے گا اور وہ اتنا بے بس ہو جائے گا کہ کچھ بھی نہ کر سکے گا۔ صبا کا مارے حیرت کے منہ کھلا رہ گیا اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی اس طرح بھی کر سکتا ہے۔ "لیکن تبریز ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ ابا ایسا نہیں کر سکتے... پھر یہ

سب کس نے کہا ہے جا کر؟" صبا نے بے چینی سے کہا۔

"ظاہر ہے کہ کسی اندر کے بندے کا کام ہے یا پھر یہ کام ابا نے خود ہی کروایا ہے تاکہ جو کام وہ مجھ سے نہیں کروا سکے وہ روی کی طرف سے کروا دیں..." تبریز نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں؟" صبا نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"روی سے جو باتیں میں نے مصلحتاً چھپائی تھیں وہ بھی اُسے پتہ چل گئی ہیں۔ اب وہ مجھ سے بات تک نہیں کرتی... شاید نفرت کرنے لگی ہے۔ اور اس کے گھر والے بھی اب کبھی اس رشتے پہ راضی نہیں ہوں گے..." تبریز نے صبا کو بتایا۔

"اوہ میرے خدا... ابا جان اس حد تک جا سکتے ہیں میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا..." صبا نے افسوس سے کہا۔

"میری زندگی تو تباہ کر دی اُنھوں نے... لیکن میں نے بھی قسم کھائی ہے کہ میری زندگی میں اگر کوئی عورت میری بیوی بن کر آئے گی تو وہ صرف رومیسہ ہوگی ورنہ کوئی نہیں... کوئی بھی نہیں..." تبریز نے مضبوط اور اٹل لہجے میں کہا۔

☆......☆......☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے جب مہرو اور زویا شادی کی شاپنگ سے فارغ ہو کر حویلی پہنچے تھے۔ گاڑی پورچ میں رکتے ہی دونوں گاڑی سے اُتری تھیں اور ملازم کو گاڑی سے سامان نکال کر اندر پہنچانے کا حکم دے کر لان کی طرف پہنچیں تو سکندر حیات خان بیٹھے تھے۔ اُنکے دو گن مین بھی پوری مستعدی کے ساتھ کھڑے تھے۔ ایک آدمی اُنکے سامنے زمین پہ بیٹھا گریہ وزاری کر رہا تھا۔ مہرو اور زویا دور سے یہ معاملہ دیکھ رہی تھیں۔ سکندر حیات خان کی پشت اُن دونوں کی طرف تھی۔

"سردار صاحب... ہم تو آپکے ٹکڑوں پہ پلتے ہیں بھلا ہم آپ سے ایسی نمک حرامی کیسے کر سکتے ہیں؟ خدارا مجھے چھوڑ دیجئے۔" وہ آدمی دونوں ہاتھ جوڑے رو رو کر التجائیں کر رہا تھا۔

"اوئے تو پھر بتا مجھے کس نے کی ہے دشمنوں کو مخبری اگر تُو نے نہیں کی تو؟" سکندر حیات نے اُس شخص کو پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر پوچھا تو وہ اُسکے پیر پکڑ کر قسمیں کھانے لگا۔

"سردار صاحب میں اپنے بچوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں... میں نے نہیں بتایا کسی کو کچھ... مجھے چھوڑ دیں خدا کے لئے..." وہ زار و قطار رو رہا تھا۔ زویا سے یہ سب برداشت نہیں ہو رہا تھا اس سے پہلے کہ وہ جا کر کچھ کہتی مہرو نے اُسے بازو سے پکڑ کر روک لیا اور اُنگلی ہونٹوں پہ رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"اوئے منظورے..." سکندر حیات نے اپنے ایک گن مین کو پکارا۔

"جی سردار صاحب... حکم؟" منظورے نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"لے جا اسے اور کتوں کے آگے ڈال دے۔ خود ہی بک دے گا کہ کس نے مخبری کی ہے۔" سکندر حیات نے کہا تو وہ آدمی

مزید آہ و بکا کرنے لگا لیکن اُنہوں نے ایک نہ سنی اور گن مین اُسے گھسیٹتا ہوا وہاں سے لے گیا۔

"جب یہ سچ اُگل دے تو اِسکا کام تمام کر دینا۔ اور ہاں... جسکے لئے یہ کام کرتا رہا ہے اُسکا نام معلوم کر لینا اور جو جو خبریں یہ دے چکا ہے ایک ایک بات معلوم کرنی ہے... سمجھے؟"

"جی سمجھ گیا سردار صاحب۔" سکندر حیات نے دوسرے گن مین کو ہدایات دیں تو وہ بھی چلا گیا۔ زویا سے رہا نہ گیا اور وہ گن مین کے جاتے ہی باپ کی طرف لپکی۔

"بابا جان... یہ سب کیا ہو رہا تھا؟" زویا نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ سکندر حیات اپنی چہیتی بیٹی کو دیکھ کر مسکرا دیے اور کہا۔ "بیٹا یہ سب روٹین میٹرز ہیں آپکی سمجھ میں نہیں آئیں گے۔" مہرو بھی آ گئی اور باپ کو سلام کر کے وہ بھی پاس رکھی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

"تو پھر آج پورا شہر خرید لائی ہیں میری شہزادیاں؟" سکندر نے خوش ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"جی بابا جان... مجھے تو اتنا کچھ نہیں خریدنا تھا لیکن آپکی یہ چھوٹی شہزادی کو کچھ زیادہ ہی مزا آتا ہے شاپنگ میں... میڈم کا بس چلتا تو پورا شہر خرید لیتی..." مہرو نے بابا کو بتایا تو بابا ہنسنے لگے۔ پھر زویا بھی کہنے لگی۔ "ہاں تو کیوں نہ کروں میں؟ پورے لاہور کو پتا لگنا چاہیے کہ سکندر حیات خان کی بیٹی زویا سکندر آئی ہے شاپنگ کرنے کوئی عام لڑکی نہیں..." زویا نے گردن اکڑا کر کہا تو سکندر حیات کو اپنی بیٹی کی اس بات پہ بے حد مان محسوس ہوا اور وہ خوشی سے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے۔

"ہاں بھئی بات تو سہی ہے... چلو اب اندر چلتے ہیں تمہاری ماں انتظار کر رہی ہے کب سے تم دونوں کا۔" سکندر حیات نے کہا اور زویا کے کندھے کے گرد اپنا بازو رکھ کر اُسکے ساتھ چلنے لگے، مہرو بھی پیچھے ہو لی۔ اندر رخشندہ بیگم صوفے پہ بیٹھی اُنکی منتظر تھیں، اُنہیں آتا دیکھ کر مخاطب ہوئیں۔

"شکر ہے کہ آج ہی واپسی ہو گئی تم دونوں کی... ورنہ میں تو سمجھی تھی کہ شاید ہفتہ لگ جائے گا واپسی میں..." اُنکے لہجے میں غصہ اور خفگی تھی۔ مہرو نے فوراً ہی ملبہ زویا پہ گرا دیا۔

"امی یہ آپکی لاڈلی ہے ناں اسکے ناک پہ کوئی چیز ہی نہیں چڑھتی جب تک پورے شاپنگ سینٹر کا دورہ نہ کر لے... پھر جا کر کوئی چیز پسند آتی ہے میڈم کو۔" مہرو نے صوفے پہ گرتے ہوئے کہا تھا جس پہ زویا بڑے پرسکون انداز میں بولی۔ "مما میں کیا کروں مجھے کوئی عام چیز پسند ہی نہیں آتی۔" زویا کے بے پرواہ انداز میں دیے گئے جواب پہ رخشندہ بیگم کو بہت غصہ آیا تھا۔ اُنہوں نے گھور کر زویا کی طرف دیکھا تو سکندر حیات ہنستے ہوئے اُسکی طرفداری میں بولے۔

"بھئی وہ بھی کیا کرے بالکل اپنے باپ پہ گئی ہے... ہاہاہا... اس عمر میں میرا بھی یہی حال تھا مجھے بھی کچھ خریدنا ہوتا تو گھنٹوں لگ جاتے تھے پھر جا کر کوئی چیز پسند آتی تھی۔"

"ہونہہ... وقت کے زیاں پہ فخر کر رہے ہیں دونوں باپ بیٹی..." رخشندہ بیگم نے خفگی سے کہا تو دونوں ہنسنے لگے۔ ملازموں نے

ساری شاپنگ لا کر رکھ دی تھی رخشندہ بیگم وہ دیکھنے میں مصروف ہو گئیں اور مہرو انہیں ہر چیز کے بارے میں بتانے لگی۔ زویا اپنے کمرے کی طرف چل دی اور سکندر حیات ٹی۔وی پہ خبریں دیکھنے لگے۔ دو دن کے بعد مہرو کی مایوں کی رسم تھی جس کے لئے زویا نے بہت سی تیاری کر رکھی تھی۔ اس نے اپنی تمام سہیلیوں کو بلایا ہوا تھا، گھر میں بہت رونق لگی ہوئی تھی ہر طرف قہقہے تھے خوشیوں کی جیسے برسات ہو رہی تھی۔ مہرو کا دل اُداس تھا لیکن وہ اپنے نصیب پہ راضی تھی اور اُسکی زبان پہ کوئی شکوہ تھا اور نہ ہی آنکھ میں کوئی آنسو۔ مایوں کے پیلے جوڑے میں سر جھکائے بیٹھی وہ بے حد حسین لگ رہی تھی، ایک معصومیت اور پاکیزگی اُسکی شخصیت سے جھلک رہی تھی۔ مہرو نے سر اُٹھا کر دیکھا تو تھوڑا فاصلے پہ سکندر حیات اپنے ایک عزیز کے ساتھ کھڑے قہقہے لگا رہے تھے، اپنے باپ کے چہرے اور لہجے سے پھوٹنے والی اس خوشی نے مہرو کو بھی سرشار کر دیا تھا کیونکہ یہ خوشی آج اُسکے باپ کے چہرے پہ اُسکی دی گئی قربانی سے آئی تھی۔ ملک فراز قصوری عمر رسیدہ اور پہلے سے شادی شدہ تھا۔ اور وہ دوسری شادی اولاد کی خاطر کر رہا تھا، اُسکا تعلق ایک سیاسی خاندان سے تھا اور وہ ایک بڑے زمیندار کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بہت سے مربعوں کا اکیلا وارث اور بہت سے علاقوں پہ جسکی سرداری چلتی تھی۔ اُسکی زمینوں پہ کام کرنے والے مزارے آنکھ بند کر کے اُسکے ایک حکم پہ ووٹ تو کیا جان بھی دے سکتے تھے۔ یہی بات تھی جو سکندر حیات کے فائدے میں تھی وہ اس سال الیکشن میں صوبائی اسمبلی کی نشست کے لئے کھڑے ہونے والے تھے، جس میں جیت کے لئے ملک فراز کے علاقے کے ووٹ بھی چاہیے تھے اور اُسکی زمینوں اور خاندانی اثر ورسوخ بھی سیاست میں کامیابی کے لئے ناگزیر تھا۔ سکندر حیات ایک کامیاب کاروباری شخصیت تھے اور انکے بنائے ہوئے ہر تعلق کی بنیاد منافع پہ ہوا کرتی تھی پھر زمیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اب وہ سیاست میں قدم رکھ چکے تھے جسکے لئے اُنہیں ملک فراز جیسے مضبوط سہارے کی ضرورت تھی جسکے لئے اُنہیں صرف مہرو کے کنوارے خوابوں کی قربانی دینی پڑی تھی جو وہ باآسانی دے سکتے تھے۔ مہرو لبوں پہ مسکراہٹ سجائے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک آتش بازی کی تیز آوازوں سے وہ خیالوں کی دنیا سے باہر نکلی تھی۔ سب لوگ آتش بازی سے محظوظ ہو رہے تھے اور حویلی کے کشادہ لان میں منعقد کی گئی یہ تقریب بہت پُر رونق تھی۔ مہرو کی نظر زویا پہ پڑی وہ سبز رنگ کے جوڑے میں بے حد حسین لگ رہی تھی، اپنی سہیلیوں کے ساتھ ڈھولک بجاتی... ہنستی مسکراتی، قہقہے لگاتی وہ بہت پُرکشش دکھائی دے رہی تھی۔ اُسکا حُسن اپنے عروج پہ تھا اور وہ سب لڑکیوں میں سب سے زیادہ جاذبِ نظر دکھائی دے رہی تھی جیسے بہت سے ستاروں میں چمکتا ہوا ماہتاب ہو.... مہرو کو اپنی لاڈلی بہن پہ بہت پیار آ رہا تھا مہرو نے دل ہی دل میں دعا کی خدا کرے کہ اُسکی بہن کو اُسکی طرح قربانی نہ دینی پڑے... خدا اُسے اُسکے ہر خواب کی تعبیر خوبصورت دکھائے۔ اگلے دن مہرو کی بارات تھی۔ زویا اور رخشندہ بیگم صبح ہی سے تیاریوں میں مصروف تھیں۔ دوپہر کے تین بج رہے تھے جب زویا، مہرو کو لیکر پارلر کے لئے روانہ ہو گئی۔ شام کے سات بجے دونوں تیار ہو کر پارلر سے شادی ہال پہنچ چکی تھیں اور ٹھیک آٹھ بجے بارات آ چکی تھی۔ ملک فراز واقعی ایک وجیہہ شخصیت کے مالک تھے اور وہ اپنی عمر سے کافی کم کے دکھائی دیتے تھے۔ زویا نے دولہا کو دیکھ کر سوچا تھا۔ مہرو اور ملک فراز کی جوڑی بہت جچ رہی تھی، مہرو دلہن بن کر بالکل ایک پری کی طرح لگ رہی تھی سرخ جوڑے میں اُسکا رنگ بہت کھل رہا تھا۔ بناری شیروانی میں ملبوس

ملک فراز بھی بہت پُرکشش لگ رہے تھے۔ ''اچھا...تو اس لئے مہرو کی بچی نے ملک فراز کے رشتے کو بلا کسی عذر کے قبول کر لیا تھا...'' زویا نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ اُسے دونوں کو خوش دیکھ کر اور اُنکی جوڑی کو جچتا دیکھ کر بے حد مسرت ہوئی تھی۔ نکاح کا دور شروع ہوا مہرو کو حق مہر میں پچاس مربعے زمین ملی جسکے کاغذات فوری طور پہ ادا کر دیے گئے۔ سکندر حیات کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور مہرو کو اس سے زیادہ کچھ چاہیے بھی نہیں تھا کہ اُسکا باپ اُسکی وجہ سے خوش ہے۔ دودھ پلائی کی رسم میں زویا نے اپنے بہنوئی کی جیب خالی کروانے کی ٹھان رکھی تھی لیکن ملک فراز نے اُسے حیرت میں مبتلا کر دیا اُس نے زویا کو ڈائمنڈ کا سیٹ تحفے میں دیا۔ سونے کے سیٹ میں جڑا ہوا ہیرا بے حد چمکدار تھا اور حیرت بھری مسرت سے زویا کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

''ارے واہ...جیجا جی آپ نے تو کمال کر دیا۔ بائی گاڈ میرے مطالبے کی رقم تو اس سیٹ کی قیمت سے بھی کہیں کم ہوتی تھی...'' زویا نے مسرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

''بھئی اب ہم اپنی اکلوتی سالی کو کیسے کر بھول سکتے تھے۔ اور ویسے بھی سالی آدھے گھر والی ہوتی ہے تو اتنا تو حق بنتا ہے ناں...'' ملک فراز نے شوخ لہجے میں کہا تو زویا کو مزید حیرت ہوئی کیونکہ وجیہہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ اچھا سینس آف ہیومر بھی رکھتے تھے۔

''واہ کیا بات ہے...آج پہلی بار مجھے اپنے لڑکی ہونے پہ خوشی محسوس ہوئی ہے...'' زویا نے ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا تو ارد گرد جمع ہوئے سب لوگ ہنسنے لگے۔ زویا کے دونوں بھائی بھی پاس کھڑے اس منظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اسفند حیات خان جو زویا سے بڑا لیکن مہرو اور جواد حیات خان سے چھوٹا تھا ملک فراز سے مخاطب ہوا تھا۔ ''فراز بھائی...سچ پوچھیں تو آج مجھے بھی اپنے سالے ہونے پہ افسوس ہوا ہے...کاش میں بھی آپکی سالی ہوتا...ہاہاہاہا۔'' اسفند نے کہا اور ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اُسکی اس بات پہ سب لوگ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مہرو رخصت ہو کر ملک فراز کے گھر آ گئی۔ ملک فراز ایک نفیس انسان تھے اور زویا کی اُمیدوں پہ پورا اُترے تھے...مہرو کے خدشات ایک ایک کر کے دور ہوتے گئے اور اب وہ ایک خوش و خرم زندگی گزارنے لگی۔ زویا چند دن آرام کر کے واپس یونیورسٹی کے ہوسٹل پہنچ گئی۔ چھٹیوں کے بعد نئے گریجوایشن کا آغاز ہوا تھا، وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ مل کر خوش تھی۔

باب ۲

انسان بھی عجیب مخلوق ہے۔اس کی عقل جتنی محدود ہے یہ اتنا ہی اپنی تدبیر پہ بھروسہ کرتا ہے۔اور اکثر انسانوں کی بربادی کا اصل سبب بھی اُنکی ناقص قسم کی تدبیریں ہی ہوا کرتی ہیں۔انسان یہ سمجھ ہی نہیں پاتا کہ اُسکی کی گئی تدبیر سے کہیں زیادہ طاقت ور خدا کی بنائی ہوئی تقدیر ہوتی ہے۔اپنے معاملات میں حتی المقدور کوشش کے بعد وہ خدا پہ توکل کرنے کی بجائے اپنی تدبیر پہ زیادہ بھروسہ کرتا ہے اسی لئے اپنی محدود سی عقل سے بنائی گئی تدابیر سے اکثر نقصان اُٹھاتا ہے۔توکل کرنا تو آج کا انسان بالکل بھول ہی بیٹھا ہے۔آج کا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اُسے وہی ملے گا جسکی وہ تدبیر کرے گا اور اگر وہ تدبیر نہیں کریگا تو اُسے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ایک حد تک تو تدبیر کرنی بھی چاہیے لیکن جب تدبیر،تقدیر سے آگے نکلنے کے لئے کی جائے تو انسان کا نقصان اُٹھانا یقینی ہو جاتا ہے۔

☆……☆……☆

عرشیہ کا سکول میں پہلا دن بہت دل چسپ گزرا تھا۔عرشیہ کی زندگی کا شاید یہ وہ پہلا دن تھا جو اس نے سب سے زیادہ آزاد اور خودمختاری سے گزارا تھا اسلئے وہ بہت خوش اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔اُسے اپنا آپ آج ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ہر چیز خوبصورت اور ہر بات اُسے اچھی لگ رہی تھی۔اُسکے اَنگ اَنگ سے خوشی اور طمانیت پھوٹ رہی تھی۔آج عرصے بعد اُسکے چہرے پہ سکون نظر آرہا تھا اور ایک لمبے عرصے کے بعد اس نے پھر سے ہنسنا مسکرانا شروع کر دیا تھا۔احمد صاحب اور حسیبہ بیگم بھی بیٹی میں آنے والے اس بدلاؤ کو خوش آئیند خیال کر رہے تھے۔اُنکے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ کم از کم اُنکی بیٹی کے چہرے کی مسکان لوٹ آئی تھی۔عرشیہ کو جاب پہ جاتے ہوئے دو ہفتے گزر چکے تھے اور اس دوران اُس نے سکول میں باقی ٹیچرز میں اپنی جگہ بڑی آسانی سے بنالی تھی۔ہر کوئی اُسکی خوش مزاجی کی تعریف کرتا تھا۔لیکن نائمہ اکرم کے ساتھ اُسکی دوستی کافی حد تک بڑھ گئی تھی۔نائمہ اکرم ایک لوئر مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی اور عرشیہ کے برعکس وہ گھر سے صرف تفریح اور ٹائم پاس کے لئے نہیں بلکہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیسے کمانے نکلی تھی۔نائمہ کے ڈھیر سارے بہن بھائی تھے جن میں اُسکے ابو کی تنخواہ بٹ جانے کی وجہ سے نائمہ کی تعلیم کے لئے پیسے نہیں بچتے تھے،اسلئے نائمہ نے اپنی تعلیم کا بیڑہ خود اُٹھاتے ہوئے پرائیویٹ سٹڈیز کے ساتھ ٹیچنگ کی جاب شروع کر دی تھی۔عرشیہ کو نائمہ کی بہت سی عادات اچھی لگی تھیں جن میں سے ایک عادت اُسکی خودداری بھی تھی اور زندہ دلی بھی۔۔بہت سے مسائل میں گھرے ہونے کی باوجود بھی نائمہ زندگی سے بھرپور تھی اور ہر وقت ہنسی مزاق سے اپنا اور دوسروں کا دل بہلانا اُس کی شخصیت کا نمایاں پہلو تھا۔وہ صبح سے دوپہر تک سکول میں پڑھاتی تھی،پھر سہ پہر کے چار بجے ایک اکیڈمی میں انگلش لٹریچر کی ماسٹرز کی کلاسز لیتی تھی اور شام چھ بجے گھر آ کر محلے

کے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھی۔ اُسکا سارا دن مصروف اور تھکا دینے والا ہوا کرتا تھا لیکن وہ پھر بھی اُمید اور زندہ دلی کا چلتا پھرتا نمونہ تھی۔ عرشیہ اُسکی بہادری سے بے حد متاثر ہوئی تھی اور اُسکے مخلص پن کی دلدادہ ہوگئی تھی۔ بہت جلد نائمہ اور عرشیہ میں گہری دوستی ہوگئی تھی اور دونوں ایک دوسرے کی غمگسار بن گئیں تھیں۔ عرشیہ جب بھی کبھی اُداس ہوتی تھی نائمہ سے اپنے غم بانٹ لیتی تھی اور جب بھی نائمہ کو کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ عرشیہ سے ضرور شیئر کرتی تھی۔ ایک دن کلاسز سے فارغ ہوکر جب دونوں سٹاف روم میں اکٹھی ہوئیں تو نائمہ کچھ پریشان سی دکھائی دے رہی تھی۔

"کیا بات ہے نائمہ؟ تم پریشان لگ رہی ہو..." عرشیہ نے نائمہ کو سوچ میں ڈوبے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"ہاں یار۔ پریشان تو ہوں۔" نائمہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"وہی تو پوچھ رہی ہوں۔ پریشانی کس بات کی ہے؟" عرشیہ نے کہا۔

"یار میرا ایک کزن ہے دور کا۔ وہ لوگ ہمارے محلے میں ہی رہتے ہیں۔ میں اُسکی وجہ سے پریشان ہوں۔" نائمہ نے بتاتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں پریشانی والی بات کیا ہے؟" عرشیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"پریشانی یہ ہے کہ وہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا...لیکن وہ آجکل روز ہی میرے آنے اور جانے کے وقت میرے راستے میں آکر کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور آتے جاتے روز اُس منحوس کی شکل دیکھنی پڑتی ہے...ہونہہ..." نائمہ نے غصے سے پھنکارا تھا۔

"ہاہاہاہاہا...اچھا تو یہ مسئلہ ہے۔ میں بھی پتہ نہیں کیا ہوگیا ہے...تم بھی ناں نائمہ..." نائمہ کی بات پہ عرشی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ جس پہ نائمہ کو مزید چڑ ہونے لگی۔

"کیا یار...اب تم بھی اس طرح ہنسو گی؟ ایک تو میں پہلے ہی اُس منحوس کی وجہ سے پریشان ہوں جو روز کالی بلی کی طرح میرا راستہ کاٹنے کھڑا ہوجاتا ہے اور تم ہو کہ مجھے اُس سے جان چھڑانے کا طریقہ بتانے کے بجائے خود بھی ہنسی جارہی ہو..." نائمہ نے خفگی سے منہ بناتے ہوئے عرشیہ سے کہا تھا جس پہ عرشیہ نے سنجیدہ ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اُس سے ہنسی کنٹرول ہی نہیں ہورہی تھی۔ نائمہ کو سخت چڑ ہوئی تو اُس نے ایک زوردار تھپڑ عرشیہ کے بازو پہ مارا جس سے وہ درد سے کراہتی ہوئی سنجیدہ ہوئی تھی۔

"ہائے نائمہ کی بچی... کتنی زور سے مارا ہے ظالم لڑکی۔"

"اب ہنسی تو اس سے بھی زور کا تھپڑ پڑے گا۔" نائمہ نے تنبیہ کی تھی۔

"اچھا بتاؤ یہ تمہارا دور کا کزن دیکھنے میں کیسا ہے؟" عرشیہ نے "دور" کو کچھ مزید لمبا کرتے ہوئے نائمہ کو پوچھا تھا۔

"بس ٹھیک ہی ہے..کوئی اتنا خاص بھی نہیں ہے۔ عام سا ہے۔" نائمہ نے خفگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں....اسکا مطلب لڑکی کو لڑکا بالکل بھی پسند نہیں...نو چانس فار لو میرج..." عرشیہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"جی ہاں۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہوسکتا۔ زہر لگتا ہے وہ مجھے..." نائمہ نے بھرپور غصے کا اظہار کیا تھا۔

"تو پھر اس میں پریشانی کی کیا بات ہے یار؟ چھوڑ دو جانے دو۔ کھڑا ہوتا ہے تو ہونے دو تمہارا کیا جاتا ہے؟" عرشی نے آسان ساحل بتاتے ہوئے کہا۔

"اتنے دنوں سے یہی تو کر رہی تھی لیکن وہ تو اپنی حرکتوں سے باز آنے والا نہیں لگتا۔ اب تو مجھے ڈر لگنے لگا ہے کہ کہیں کوئی بات ہی نہ بن جائے محلے میں... تمہیں تو پتہ ہے یہ گلی محلے والوں کو ایک دوسرے کی رپورٹ رکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہوتا۔" نائمہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔

"نائمہ اتنی ٹینشن نہ لو یار۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا جب تک تم اُس سے یا وہ تم سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ بس تم اُسکی طرف دیکھا بھی مت کرو۔ وہ خود ہی ایک دن پیچھے ہٹ جائے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" نائمہ نے کہا۔

"ورنہ ایک طریقہ اور بھی ہے اُس کالی بلی کو بھگانے کا..." عرشیہ نے سنجیدگی سے کہا لیکن شرارت اُسکی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔

"وہ کیا؟" نائمہ نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ یہ کہ تم اپنے ساتھ کوئی کتا... میرا مطلب ہے یار اپنا ایک آدھ بھائی لے کے گھر سے نکلا کرو۔" عرشیہ نے کہا اور زور سے ہنسنے لگی۔

"ہنسو، ہنسو اور ہنسو... جب تم پہ ایسا وقت آئے گا تب پوچھوں گی تمہیں۔" عرشیہ کے مزاق پہ نائمہ جذباتی ہو کر بولی۔

"اچھا بابا... چلو اب بس بھی کرو اور جانے دو غصہ..." عرشیہ نے اُسکا موڈ خراب دیکھ کر کہا۔

"چلو پھر چائے اور سموسہ کھلاؤ کینٹین سے۔ پھر مجھے اکیڈمی بھی جانا ہے وہ بھی بس پر۔" نائمہ نے عرشیہ کو بازو سے کھینچتے ہوئے کہا اور ایک نظر گھڑی پہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ہاں، ہاں ضرور۔ مجھے اپنا بیگ تو اُٹھانے دو یار..." عرشی نے نائمہ کے کھینچنے پہ کہا اور جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ اُٹھاتے ہوئے اُسکے پیچھے چل پڑی۔

"تم تو مزے سے گاڑی لے کر گھر چلی جاؤ گی اور مجھے شام ہو جاتی ہے گھر پہنچتے پہنچتے۔" نائمہ نے کہا۔

"اچھا بھئی چلو۔ میں نے کب انکار کیا ہے..." عرشی نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

نائمہ کے ساتھ چائے اور سموسے کھا کر عرشیہ نے اُسے بس سٹاپ تک ڈراپ کیا اور خود گھر کی طرف چل دی۔ آج ٹریفک معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی اور کانسٹیبل بھی کم ہی نظر آرہے تھے جسکی وجہ سے ٹریفک بے ہنگم انداز میں رواں دواں تھی۔ عرشیہ نے ٹیپ آن کی تو اُسکی پسندیدہ غزلوں کی کیسٹ چل پڑی۔ وہ سنتے سنتے جیسے کھو گئی تھی اور گھر کی طرف جو سڑک جاتی تھی اُسکا موڑ کچھ زیادہ ہی تیزی سے کاٹا لیکن اچانک ہی ایک کار اندر کی طرف سے نکلی تھی جسکی وجہ سے عرشیہ کو پوری طاقت سے بریک دبانی پڑی تھی لیکن پھر بھی دونوں گاڑیوں کے بمپرز کی آپس میں ہلکی سی ٹکر ہو ہی گئی تھی۔ عرشیہ کے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا اور ویسے بھی وہ غزلوں میں کھو کر بالکل ہی

غائب دماغی سے گاڑی چلا رہی تھی اسلئے وہ ہکا بکا سی سٹیرنگ پکڑے سامنے والی گاڑی کو تکے جا رہی تھی جس میں سے ایک تیس بتیس سال کا ایک وجیہ آدمی نکل کر اپنی گاڑی چیک کر رہا تھا کہ کتنا نقصان ہوا ہے۔ پھر وہ عرشیہ کی گاڑی کے قریب آ کر دروازے کے شیشے پہ نوک کیا۔ عرشیہ نے ڈرتے ڈرتے شیشہ نیچے کر کے اُسے دیکھا تھا۔ وہ کافی گھبرائی ہوئی تھی لیکن جیسے ہی اُس پہ نظر پڑی عرشیہ کو وہ بہت پُر کشش دکھائی دیا تھا۔ اُسکی آنکھیں ہلکے بھورے رنگ کی تھیں جن میں بہت کشش تھی عرشیہ اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔

''مس کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' اُس نے عرشیہ کو گھبرایا ہوا پا کر پوچھا۔

''جی؟'' عرشیہ کو جیسے اُسکے الفاظ سمجھ ہی نہیں آئے تھے۔

''میرا مطلب ہے آپکو چوٹ تو نہیں آئی؟'' اُس نے نرمی سے الفاظ بدل کر پوچھا۔

''جی نہیں تو... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' عرشیہ نے اٹکتے ہوئے کہا تھا۔

''ٹھیک گاڈ... آئی۔ ایم سوری میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے آ رہا تھا۔'' اُس اجنبی شخص نے کہا تھا۔ لیکن عرشیہ کو بھی اپنی غلطی کا ادراک تھا اسلئے وہ جلدی سے بولی۔

''جی نہیں... میں بھی کچھ غائب دماغی سے گاڑی چلا رہی تھی ساری غلطی آپکی بھی نہیں۔ اگر میں محتاط ہو کر چلا رہی ہوتی تو ایسا نہیں ہوتا۔'' عرشیہ نے خود کو سنبھال کر اپنی غلطی مان لی۔

''اوہ شکر ہے۔ ورنہ میں مجبور ہا تھا کہ ابھی مجھے گاڑی سے اتر کر آپ کہیں گی کہ اندھے ہو؟ تمہیں نظر نہیں آتا؟ تمہارے گھر ماں، بہن نہیں ہے جیسے جملے سننے کو ملیں گے۔'' اُس نے چہرے پہ دلکش مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا تھا جس پہ عرشیہ ہلکے سے ہنس دی تھی۔

''ارے نہیں۔ میں ایسی لڑکی نہیں ہوں۔ ویسے بھی میں ایک ٹیچر ہوں جو اتنی اَن ایجوکیٹڈ باتیں نہیں کر سکتی...'' عرشیہ نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ چلیں شکر ہے دونوں کا نقصان نہیں ہوا۔'' اُس نے کہا اور خدا حافظ کہتا ہوا اپنی گاڑی سٹارٹ کر کے زن سے چلا گیا۔ عرشیہ اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ وہ عرشیہ کو بہت اچھا لگا تھا لیکن اجنبی سے زیادہ بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی یہی سوچ کر عرشیہ نے اُسکا نام تک نہیں پوچھا۔ زندگی میں پہلی بار عرشیہ کا دل کسی کے لیے یوں دھڑکا تھا۔ پہلی بار اُسے کوئی اتنا اچھا لگا تھا کہ وہ بہت دیر تک اُسے سوچتی رہی تھی۔ کوئی اتنا اچھا پہلے کیوں نہیں لگا تھا عرشیہ سوچ رہی تھی، لیکن پھر وہ سب باتیں ایک طرف کر کے پھر سے اُسی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ عرشیہ کو اُس اجنبی کے مہذب قسم کے اندازِ گفتگو نے بے حد متاثر کیا تھا۔ عرشیہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ لیٹی یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ اُسکے کانوں میں رشتے والی خالہ کی آواز پڑی۔ ''اُف یہ منحوس عورت پھر سے آ گئی... اب پتہ نہیں کونسا شوشہ چھوڑنے آئی ہے۔'' عرشیہ زیرِ لب بڑبڑائی تھی۔

☆......☆......☆

نائمہ سکول کے لئے نکلی تھی، گھر سے تھوڑا دور آ کر جب گلی کے کونے پہ نظر پڑی تو آج پھر سے وہ اُسکا منتظر تھا۔ نائمہ کو دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی اور نائمہ نے دل ہی دل میں سوچا تھا کہ "یہ کالی بلی کی دُم کسی دن مجھ سے پٹے گا"۔ نائمہ نے اُسکے پاس سے گزرتے ہوئے اپنے قدموں کی رفتار کچھ زیادہ ہی تیز کر دی تھی اور آنکھیں بھی زمین میں گاڑ دیں تھی کہ کہیں خدانا خواستہ نظر ملنے پہ وہ آواز دے کر روک ہی نہ لے۔ نائمہ جب وہاں سے کافی دور نکل آئی تو رک کر ایک لمبا سانس لیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کہیں کوئی تماشہ نہیں بنا۔ سکول پہنچی تو سٹاف روم سے لیکر پورے سکول تک گھوم کر دیکھ لیا لیکن عرشیہ کہیں نظر نہیں آئی۔ پھر نائمہ نے سوچا شاید وہ آج دیر سے آئے کیونکہ آج کے دن اُسکا پہلے پیریڈ میں کوئی لیکچر نہیں ہوتا تھا۔ سو نائمہ اپنی کلاس کے بچوں کو پڑھانے میں مصروف ہو گئی۔ بریک کے وقت نائمہ جب سٹاف روم میں آئی تو عرشیہ اُسکی منتظر تھی۔

''کہاں ہو بھئی صبح سے؟'' نائمہ نے اُسے دیکھتے ہی پوچھا۔

''بس یار۔ آج صبح جلدی آنکھ نہیں کھلی اسلئے تھوڑی دیر ہو گئی۔'' عرشیہ نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔ تو نائمہ اپنی روایتی شرارتی انداز میں ذرا اُسکے قریب آ کر اُسکی آنکھوں میں جھانکا اور بولی "خیریت تو ہے؟ یہ آنکھیں آج اتنی سرخ اور نشیلی کیوں ہو رہی ہیں؟'' نائمہ کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ عرشی پہ شک کر رہی ہے۔ عرشیہ ہلکے سے مسکرا دی کیونکہ نائمہ کی نظروں نے اُسکے دل کی بابت معلوم کر لی تھی۔ ''اوہ... ہلکی تو سمجھو پھنسی... ہے ناں؟'' نائمہ نے شرارتی انداز میں کہا۔ ''خیر اب ایسا بھی نہیں کہ پھنسی۔ میں تو صرف ہلکی ہوں۔'' عرشی نے بات گھماتے ہوئے کہا۔ "یہ گول مول باتیں نہ کرو اور یہ بتاؤ کس گلفام نے تمہاری راتوں کی نیندیں چرا لی ہیں؟'' نائمہ نے آنکھ دباتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو مجھے بھی نہیں پتہ کہ وہ کون تھا۔'' عرشی نے بجھے ہوئے انداز سے کہا۔ "ہائے میرے ربا... کسی اجنبی پہ دل ہار گئی ہو لڑکی... یہ تم نے کیا کیا؟'' نائمہ نے فکر مند لہجے میں مزاحیہ انداز میں کہا۔ ''چھوڑو یار... کیوں دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہو؟'' عرشی نے دکھی انداز میں کہا۔ ''کہاں دیکھا تھا؟'' نائمہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ''دیکھا نہیں، ملا تھا... کل گھر کی طرف جو موڑ جاتا ہے وہاں پہ اُسکی گاڑی سے ٹکر ہوئی تھی میری گاڑی کی...'' نائمہ ہمہ تن گوش سن رہی تھی۔ ''مجھے لگا تھا گاڑی سے اُتر کر مجھے برا بھلا کہے گا لیکن وہ بہت ڈیسنٹ اور میچور انسان تھا بہت ادب سے پیش آیا۔'' عرشی نے بتایا۔ ''واہ... اتنی اچھی سچویشن بنی اور پھر بھی وہ اجنبی ہی رہا؟'' نائمہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''ظاہر ہے اب سڑک پہ کسی اجنبی سے آپ اور کیا بات کر سکتے ہو؟'' عرشی نے کہا۔ ''ارے یار اور کچھ نہیں تو نام ہی پوچھ لیتی کم از کم اُسکا نام لیکر ہی میں تجھے چھیڑ لیا کرتی اور کچھ نہیں تو...'' نائمہ نے بے بسی سے کہا۔ "جانے دو یار... میری زندگی تو ویسے بھی خزاں کی مانند بے رونق تھی اور شاید آئندہ بھی...''

عرشی کی بات ابھی منہ میں ہی تھی کہ نائمہ بول پڑی "اوہ بڑی بی... خدا کا واسطہ ہے اب شروع نہ ہو جانا پھر سے اپنا اُداسی نامہ پڑھنے... سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نائمہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور عرشی دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئی۔ کتنا اذیت دیتا ہے یہ احساس کہ آپ محض ایک 'شو پیس' کی طرح لوگوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہو اور لوگ آپکو واقعی ایک شو پیس کی طرح بے جان سمجھ کر ریجکٹ

کر جاتے ہیں۔ یہ احساس اور بھی زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے جب آپ اپنے ناپسند کیے جانے کی وجہ بھی نہیں جان پاتے۔۔۔ عرشیہ ایک بار پھر اُسی اذیت کو محسوس کر رہی تھی جو اُسے اکثر ایسے لوگوں کے سامنے جانے سے ہوا کرتی تھی۔ ایک بے نام سی خواہش عرشیہ کے دل میں انگڑائی لیکر رہ گئی کہ کاش اُسے کوئی پسند آ جاتا یا اُسے کسی سے محبت ہوتی تو وہ اُسے خود شادی کے لئے پرپوز کر دیتی تاکہ وہ کسی لڑکے کے گھر والوں کے سامنے شو پیس بنا کر پیش کیے جانے کے بجائے اپنی تمام تر سچائیوں کے ساتھ جس سے شادی کرنا چاہتی صرف اُسی کے سامنے جا کر اپنی محبت کا اقرار کر کے جیون بھر کے لئے اُسکا ساتھ مانگ لیتی تب اگر انکار بھی ہوتا تو اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا لوگوں کے عجیب و غریب قسم کے سوالات اور ڈیمانڈز سے ہوتا ہے۔ عرشیہ کو اپنا آپ ایک ایسے مجرم کی طرح نظر آتا تھا جسے یہ بھی نہ پتہ ہو کہ اُس نے جرم کیا کیا ہے اور اُسے سزا سنا دی گئی ہو۔ اُس اجنبی کے دل کو بھانے کے بعد پھر سے عرشیہ اُسی کرب اور ڈپریشن کا شکار ہو گئی تھی جو جاب سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ تنہائی کا احساس مزید بڑھ گیا تھا اور چار سو جیسے بس اُداسی ہی اُداسی چھا گئی تھی۔ گھر آ کر بھی دل بوجھل سا ہی تھا اور ہر چیز بے مزہ اور بے کیف لگ رہی تھی۔

عرشیہ اپنے کمرے میں لیٹی چھت کو گھور رہی تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی، عرشیہ جلدی سے اُٹھ کر دوپٹہ لیتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ دروازہ کھولا تو سامنے امی کھڑی تھیں۔ "ارے امی آپ؟ اندر آ جائیں۔" عرشیہ امی کو دیکھ کر فوراً ایک طرف ہٹ کر انہیں اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔ "میں نے سوچا اب تم آرام کر چکی ہو گی سکول سے آ کر تو تم سے کچھ باتیں ہی کر لوں۔" صبیحہ بیگم نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "جی امی کہیے کوئی خاص بات تھی تو مجھے بلا لیتیں؟ آپ نے تکلیف کیوں کی۔۔۔؟" عرشیہ نے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "نہیں اپنی بچی کے پاس آنے میں کیسی تکلیف؟" صبیحہ بیگم نے عرشیہ کے چہرے پہ محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تو عرشیہ نے اُنکا ہاتھ چوم لیا۔ "عرشی ایک لڑکا دیکھا ہے ہم نے تیرے لئے۔۔۔ اپنا کاروبار کرتا ہے، اور گھر بھی اپنا ہے۔" صبیحہ بیگم نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "یہ کونسی کوئی نئی بات ہے امی۔۔۔ ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔" عرشی نے جلے ہوئے دل سے کہا۔ "کل تم سکول سے چھٹی لے لینا، شام کو وہ لوگ ہمارے گھر آئیں گے تمہیں دیکھنے کے لئے۔۔۔ انشاءاللہ اس بار ضرور بات بن جائے گی۔" صبیحہ بیگم نے کہا۔ عرشیہ دل ہی دل میں کُڑھ کر رہ گئی لیکن زبان سے کچھ نہ بولی۔ صبیحہ بیگم بیٹی کی خاموشی کو اُسکی رضامندی سمجھ کر چل دیں۔ اور عرشیہ بیٹھی سوچتی ہی رہ گئی کہ وہ کیا کہے اور کیا کرے۔ بادلِ ناخواستہ عرشیہ نے سکول سے چھٹی لے لی اور مہمانوں کے سامنے تیار ہو کر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ لڑکے کی ماں اور بہنیں آئیں تھیں جو مزاج سے کافی سڑیل دکھائی دیتی تھیں اور وہ اس طرح بیٹھی تھیں جیسے اُنہیں زبردستی بھیجا گیا ہو اور عرشیہ سے جیسے اُنہیں کوئی سروکار ہی نہ ہو۔ عرشیہ ہر بات محسوس کر رہی تھی اور لوگوں کے ایسے ہی عجیب و غریب رویے ہی اُسکے لئے تکلیف کا باعث بنتے تھے۔ کچھ لوگ تو یوں سوال کرتے تھے جیسے اُسکا "کورٹ مارشل" کرنے آئے ہیں اور کچھ لوگ یوں ظاہر کرتے تھے جیسے کوئی خاص لگاؤ ہی نہیں۔ شاید ہی کوئی ایک آدھ فیملی ایسی ہوگی جو عرشیہ کو بھلی معلوم ہوئی تھی ورنہ یہ نجو خالہ تو اپنے جیسے پاگل لوگوں کو ہی اُٹھا لاتی تھی اپنے ساتھ۔ مہمانوں کے جانے کے بعد عرشیہ نے اطمینان کا سانس لیا کہ جان چھوٹی اور اپنے کمرے میں جا کر بچوں کے ٹیسٹ چیک کر کے

نمبرنگ کرنے لگ گئی۔ صبح اُسے سکول جا کر کلاس کی ماہانہ رپورٹ پرنسپل کو پیش کرنی تھی۔ اس کام میں کافی وقت صرف ہو گیا اور رات کے گیارہ بجے عرشیہ کام ختم کر کے سوگئی اور آج کے مہمان اُسکے ذہن سے بالکل محو ہو گئے۔

☆......☆......☆

عرشیہ تھکی ماندی سکول سے واپس آئی تھی۔ آج کا دن اُسکا بہت مصروف گزرا تھا کیونکہ آج سکول میں پیرنٹس ٹیچر میٹنگ تھی۔ اسلئے سارا دن اُسکا بچوں کے والدین سے بچوں کے مسائل ڈسکس کرتے گزرا تھا۔ گھر آ کر وہ نہانے کے بعد کچھ دیر کے لئے سوگئی تھی، شام کے پانچ بجے وہ اُٹھ کر جب لونگ روم میں آئی تو بھابھی امی، ابو کو چائے دے رہی تھیں۔

"بھابھی ایک کپ مجھے بھی پلیز... بلکہ بڑا مگ ہو چائے تو کا بہتر رہے گا سر بہت درد ہو رہا ہے۔" عرشیہ نے بھابھی کو کہا۔ "ٹھیک ہے ابھی لاتی ہوں۔" بھابھی نے کہا اور کچن کی طرف چل دیں۔ "کیا ہوا آج بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو؟" ابو نے پوچھا تھا۔ "جی بابا جان... سارا دن بچوں کے والدین سے سر کھپاتی رہی ہوں ناں اسی لئے..." عرشیہ نے بتایا۔ "میں تو کہتی ہوں جان چھڑاؤ اپنی اس جاب سے... دن بھر سر کھپاتے رہو لوگوں کے بچوں کے ساتھ... ہونہہ۔" امی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔ "ارے امی پلیز ایسے نہ کہیں... پڑھانا... لوگوں کو علم سکھانا تو نبیوں اور پیغمبروں کا کام تھا۔" عرشیہ نے امی کے اعتراض پہ کافی معقول دلیل پیش کی تھی جس پہ ابو نے اُسکی خوب حمایت کی تھی۔ اتنے میں بھابھی چائے کا مگ لے آئیں تھیں۔ عرشیہ چائے پینے اور ٹی۔وی دیکھنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فون کی بیل بجی اور امی نے فون اُٹھایا۔ شاید نجو خالہ کا فون تھا اور وہ جو مہمان اُس دن ہو کر گئے تھے اُنکے بارے میں کچھ بتا رہی تھیں۔ صبیحہ بیگم نے کن اَکھیوں سے عرشیہ کی طرف دیکھا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بات کر کے فون کریڈل پہ رکھ دیا لیکن عرشیہ نے کوئی انٹرسٹ ظاہر نہ کرتے ہوئے خود کو ٹی۔وی دیکھنے میں مصروف کیا ہوا تھا کہ اچانک ہی صبیحہ بیگم نے عرشیہ کے سر پہ جیسے بم گرا دیا۔

"احمد صاحب سنئے... نجو خالہ کہہ رہی ہیں کہ اُن لوگوں کو ہماری عرشی پسند ہے اور وہ جلد از جلد بات پکی کر کے نکاح کی تاریخ بھی رکھنا چاہتے ہیں..." عرشیہ کو جیسے امی کی بات سن کر کرنٹ سا لگا تھا کیونکہ اُسے ایسی کسی بات کی بھی توقع نہیں تھی۔ وہ تو اُن لوگوں کو بھلا بیٹھی تھی اور یہی سمجھی تھی کہ باقی لوگوں کی طرح وہ بھی آئے گئے ہو گئے ہیں لیکن اس بار سب باتیں اُسکے خلاف توقع ہو رہی تھیں۔ عرشیہ ہونقوں کی طرح امی کی طرف دیکھ رہی تھی جو کہ اُسے دیکھ کر مسکرا رہیں تھیں۔ "ارے یہ تو بہت خوشی کی بات ہے..." احمد صاحب نے بیوی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "اچھا اب بتائیں کہ اُنکو کس دن بلائیں گھر پہ؟" صبیحہ بیگم نے سوال کیا۔ "اس ویک اینڈ پہ بلا لو... رات کے کھانے پہ مناسب رہے گا۔" احمد صاحب نے کہا۔ "جی یہ مناسب رہے گا۔ شیراز آتا ہے تو اُسے بھی خوشی کی خبر سناتی ہوں اور عرشی کی بہنوں کو بھی فون کرتی ہوں۔" صبیحہ بیگم خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہی تھیں۔ اور عرشیہ کو یہ سب ایک خواب کی طرح لگ رہا تھا، اُسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے۔ لیکن اُسکے دل میں یہ بات بھی کھٹک رہی تھی کہ آخر مجھ سے میری رضامندی کیوں نہیں پوچھی گئی اور نہ ہی مجھے اُس شخص کی کوئی تصویر دکھائی گئی ہے کہ کم از کم اُسے دیکھ ہی لوں جس کے کھونٹے سے باندھی جا رہی

ہوں.... صبیحہ بیگم بہو کو آوازیں دیتی اُسکو یہ خبر سنانے چل دیں اور احمد صاحب بھی باہر چل دیے لیکن عرشیہ اپنی جگہ ہی بیٹھی رہی۔ اُسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ خوش ہو، حیران ہو یا پھر دکھی ہو۔ عرشیہ کے ذہن میں ایک بار پھر اُسی اجنبی کا چہرہ گھوم گیا اور وہ ایک حسرت بھری آہ بھر کر رہ گئی۔ عرشیہ کے لئے اس وقت شادی مرگ کی سی کیفیت تھی۔

ویک اینڈ پہ وہ سب لوگ آئے اور عرشیہ کے ہاتھ پہ پیسے رکھ کر نسبت طے کر گئے اور ساتھ ہی اگلے مہینے کی پندرہ تاریخ کو نکاح کی ڈیٹ بھی رکھ دی گئی۔ عرشیہ کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ اتنا اچانک اور جلدی کیسے ہو رہا ہے۔ نہ جانے کیوں اُسے دال میں کچھ کالا محسوس ہو رہا تھا کیونکہ لڑکے والوں کے چہروں پہ کوئی خاص مسرت کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے جو عموماً ایسے موقوں پہ ہوا کرتے ہیں۔ رسم بخیر و خوبی انجام پا گئی اور سب لوگ اگلے مہینے نکاح کے انتظامات کے بارے میں فکر کرنے لگے۔ اب تک عرشیہ جو اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں جان پائی تھی وہ اُسکا نام اور کام ہی تھا... اسکے علاوہ اُسکو اپنے ہونے والے شوہر کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ پیر کے دن جب عرشیہ سکول پہنچی تو نائمہ اُسکی منتظر تھی۔ نائمہ سے عرشیہ کی فون پہ بات ہو چکی تھی جس میں اُسے عرشیہ کی نسبت طے پا جانے کا علم ہو گیا تھا۔ عرشیہ کے آتے ہی نائمہ نے اُسے مبارک باد دی اور کلاسز سے فارغ ہو کر اُسے ٹریٹ دینے کا بھی کہا۔ کلاسز سے فری ہو کر دونوں ایم۔ ایم عالم روڈ کے ایک مشہور ریسٹورنٹ پہ بیٹھی تھیں اور عرشیہ نے نائمہ کی پسند کا کھانا آرڈر کر دیا تھا۔ نائمہ ستائشی نظروں سے ریسٹورنٹ کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

"ہائے عرشی... کتنا خوبصورت ماحول ہے یہاں کا اور کتنی مہنگی جگہ ہے۔" نائمہ نے کہا تو عرشی پھیکی سی مسکراہٹ سے ہنس دی۔ "ہائے اگر تم مجھے یہاں نہ لاتی تو پتہ نہیں میں یہاں کبھی آ بھی پاتی یا نہیں..." نائمہ نے کہا۔ "فکر نہ کرو اب تم یہاں آ گئی ہو۔ میرے ساتھ آئی ہو یا کسی اور کے ساتھ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عرشی نے نائمہ سے بڑے پیار سے کہا۔ "ہاں... یہ بات تو ہے یار۔ اللہ تم جیسی سہیلی ہر کسی کو دے..." نائمہ نے اپنے مخصوص انداز میں شوخی اور فخر کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔ اتنے میں آرڈر آ گیا اور دونوں کھانے میں مصروف ہو گئیں۔ کھانے سے فارغ ہو کر عرشیہ نے چائے منگوائی۔ نائمہ نے بغور عرشیہ کو دیکھتے ہوئے کہا "کیا بات ہے عرشی تم اتنی خوش نظر نہیں آ رہی جتنا تمہیں ہونا چاہیے؟" "اس طرح کی سچویشن میں کوئی جتنا خوش ہو سکتا ہے میں بھی اُتنی ہی خوش ہوں یار..." عرشیہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا۔ "تو پھر تمہاری آنکھوں میں یہ اُداسی اور ملال کیسا ہے؟" "معلوم نہیں یار... بس عجیب شادی مرگ کی سی کیفیت ہے۔ خوشی کا موقعہ ہے لیکن دل میں کوئی چیز ہے جو کھٹکے جا رہی ہے..." "ایسی کیا بات ہے؟" نائمہ نے فکر مندی سے پوچھا۔ "ہمارا معاشرہ بھی عجیب روایتیں رکھتا ہے... ساری زندگی ہمارے والدین ہمیں غیروں اور اجنبیوں سے بچاتے رہتے ہیں، چھپا چھپا کر رکھتے ہیں لیکن جب شادی کا وقت آتا ہے تو فوراً اُسے پیشتر کسی اجنبی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر گھر سے خیر باد کہہ دیتے ہیں... کہ لو بھئی یہ پوری کی پوری تمہاری ہے لے جاؤ اسے اپنے ساتھ اور جو چاہو کرتا... ہونہہ..." عرشیہ نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہاں یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو... یہ واقعی ایک المیہ ہے۔" نائمہ نے بھی تائید کی۔ "نہ ہم اُسے جانتے ہوتے ہیں اور نہ ہی کبھی دیکھا ہوتا ہے بس اچانک ہی ایک اجنبی کو

ہمارے سامنے لا کر کہا جاتا ہے یہ لو یہ تمہارا شوہر ہے مجازی خدا... بالکل ایسے جیسے کوئی اپنے پالتو جانور کو اچانک کسی کے ہاتھ بیچ کر کہہ دے کہ اب یہ تمہارا مالک ہے... جاؤ اسکے ساتھ۔" عرشیہ کا دل کٹ رہا تھا۔ "فکر نہ کرو یار سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے اس میں کوئی مصلحت ہو خدا کی..." نائمہ نے کہا۔ دونوں چائے پی کر اپنی اپنی راہ پہ چل پڑیں۔ اس انجانے شخص کے بارے میں سوچ کر عرشیہ کے دل کا بوجھ مزید بڑھ جاتا تھا۔ پتہ نہیں وہ کیسا ہوگا اور کیسا مزاج ہوگا اُسکا... عرشیہ سوچ رہی تھی۔ اور جتنا سوچتی تھی اُتنا ہی اُلجھتی جاتی تھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے جب عرشیہ پانی لینے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جا رہی تھی۔ امی ابو کے کمرے کے پاس سے گزر رہی تھی تو ایک آواز نے عرشیہ کے قدم روک لئے اور وہ آواز شیراز بھائی کی تھی۔ "اس وقت شیراز بھائی امی ابو کے پاس کیا کر رہے ہیں؟" عرشیہ نے سوچا اور کمرے کے دروازے کے پاس کھڑی ہو کر باتیں سننے لگی جو کہ بند تھا۔ "سوچ لیں آپ لوگ ایک بار میرا مشورہ دیکھ لیں ہے..." شیراز بھائی نے کہا تھا۔ "بیٹا اب کسی طرح تو بیٹی کا گھر بسانا ہے ناں... عمر گزرتی جا رہی ہے اُسکی اور کچھ سال گزر گئے تو رشتے بھی آنا بند ہو جائیں گے پھر کیا کریں گے ہم؟" امی نے فکرمندی سے کہا تھا۔ عرشیہ کی سماعتوں پہ ایسی باتیں بہت گراں گزرتیں تھیں اسلئے اُسکی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ "میں اس لئے کہہ رہا تھا کہ کل کو کوئی مسئلہ نہ ہو عرشیہ کو..." شیراز بھائی نے کہا۔ "چلو جب ایسی کوئی بات ہوگی تو دیکھ لینگے لیکن میرا نہیں خیال کہ ایسا کچھ ہوگا۔ تیمور ایک پڑھا لکھا صاحب روزگار انسان ہے، گھر، گاڑی اور کاروبار بھی اپنا ہے۔ پھر میرا نہیں خیال کہ ایسا کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے..." اس بار ابو نے اپنی رائے دی تھی۔ عرشیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ تینوں آخر کس مسئلے کی بات کر رہے ہیں۔ "آپکی بات سو فیصد درست ہے بابا جان لیکن اگر ایسا مسئلہ نہیں ہے تو پھر ایسی ڈیمانڈ بھی نہیں ہونی چاہیے تھی اُنکی۔ اور پھر نکاح بھی پہلے ہی رکھ لیا ہے اُنہوں نے..." شیراز بھائی کہہ رہے تھے۔ عرشیہ مزید اُلجھن کا شکار ہو رہی تھی، اُسکی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن صاف ظاہر تھا کہ اُس سے کچھ نہیں بہت کچھ چھپایا گیا ہے... "بیٹا اللہ مالک ہے۔ ہم خلوص نیت سے آگے بڑھتے ہیں باقی اللہ ہماری بچی کی قسمت اچھی کرے سب ٹھیک ہو جائے گا۔" امی نے کہا تو شیراز بھائی بھی راضی ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ باہر نکلتے عرشیہ جلدی سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی لیکن اُسکے دماغ میں وہ سب باتیں جو اُسنے سنی تھیں گھوم رہی تھیں اور اُسنے سوچ لیا تھا کہ وہ امی سے ساری بات معلوم کر کے رہے گی۔ اگلے دن معمول کے مطابق سکول پہنچ کر کلاس روم میں مصروف ہو گئی جب بریک ٹائم ہوا تو سٹاف روم میں نائمہ بیٹھی تھی لیکن وہ آج کچھ بدلی بدلی سی لگ رہی تھی اور آج موبائل بھی بار بار استعمال ہو رہا تھا۔ عرشیہ کو دال میں کچھ کالا لگا تو نائمہ سے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے نائمہ... لگتا ہے کالی بلی دل کو بھا ہی گئی؟" عرشیہ نے شرارتاً اُسے چھیڑا تھا۔

"ارے نہیں ایسی کوئی بات نہیں... وہ بلی تو اگر سو سال بھی میرے راستے میں پڑی رہے تب بھی مجھے کبھی نہیں بھائے گی... عادتاً بھی نہیں..." نائمہ نے اتراتے ہوئے کہا۔

"اتنا بڑا بول نہیں بولتے نائمہ... اللہ کو تکبر پسند نہیں..." عرشیہ کو نائمہ کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ "ارے یار میں نے تو صرف

تمہیں سمجھانے کے لئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا.. اور بس..." نائمہ نے بوکھلا کر کہا۔" اچھا تو بتاؤ پھر آج کہاں مصروف ہو؟"" ارے کہیں بھی نہیں یار... ایک فرینڈ میسیج کر رہی ہے بس اُسی سے بات کر رہی ہوں۔" نائمہ نے حقیقت چھپاتے ہوئے کہا۔" چلو ٹھیک ہے میں اب چلتی ہوں میں تو فری ہو گئی ہوں۔" عرشیہ نے کہا اور اپنا بیگ اُٹھاتے ہوئے چل دی۔ وہ تو خود اُلجھی ہوئی تھی تو نائمہ سے کیا پوچھتی اسلئے نائمہ کے ٹالنے پہ اُسے احساس نہیں ہوا کہ اُس نے ٹالا ہے۔

☆----☆----☆

"امی آپ لوگ میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں؟" صبیحہ نے عرشیہ کو حقیقت بتا ہی دی تھی جسے سن کر وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ اُسے غصے میں دیکھ کر صبیحہ بیگم نے اُسے سمجھانا چاہا تھا۔" بیٹا یہ سب ہم تمہاری بھلائی کے لئے ہی تو کر رہے ہیں... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟" صبیحہ بیگم نے نرمی سے کہا تھا لیکن عرشیہ اگلی بات سن کر مزید آگ بگولا ہو گئی۔" بھلائی...؟ کیسی بھلائی ہے امی اس میں... آپ لوگ اُنہیں پیسے دے کر میری شادی کروا رہے ہیں اس سے بڑی میرے لئے تذلیل کی بات اور کیا ہو گی؟" عرشیہ نے رندھی ہوئی آواز میں چلاتے ہوئے کہا تھا۔" بیٹا اس میں تذلیل کی کیا بات ہے؟ لوگ جہیز بھی تو لیتے ہی ہیں ناں... ہم اگر جہیز کے ہی کچھ پیسے اُنکو دے دیں گے تو کونسی بڑی بات ہے اس میں؟" صبیحہ بیگم نے سمجھانے کی کوشش کی۔" جہیز لوگوں کو نہیں اپنی بیٹی کو دے کر بھیجا جاتا ہے امی... آپ لوگ اُنہیں پیسے دے رہے ہیں.. صاف ظاہر ہے کہ وہ پیسوں کی خاطر شادی کر رہے ہیں..." عرشیہ نے روتے ہوئے کہا۔" نہیں میری جان.. ایسی بات نہیں ہے۔ ذرا سے پیسے ہمیں تیری خوشیوں سے زیادہ عزیز تو نہیں ہیں ناں؟" صبیحہ نے بیٹی کو سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔" آپ لوگوں نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا ہے امی... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں اتنی گئی گزری ہوں کہ پیسے دے کر میری شادی کروانی پڑے گی آپکو۔" عرشیہ بلک بلک کر رو رہی تھی، شدید ذلت کا احساس اُسکا دامن گیر تھا۔" ایسا مت سوچو میری بچی.. تم دیکھنا سسرال میں تیری کتنی عزت ہو گی۔ ہم تجھے اتنا کچھ دے کر بھیجیں گے کہ کسی کی مجال نہیں ہو گی تیرے سامنے کچھ کہنے کی۔" صبیحہ بیگم نے بیٹی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔" اس سے تو بہتر تھا کہ آپ مجھے گلا گھونٹ کر مار ڈالتیں... مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا جتنا آپ لوگوں نے مجھے یوں شرمسار کر کے دیا ہے۔ میری عزت نفس کا سودا کر دیا آپ لوگوں نے اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی..." عرشیہ سسک سسک کر کہہ رہی تھی، صبیحہ بیگم کی آنکھوں میں بھی نمی تیر گئی۔" عرشی میری بچی... مت رو۔ ایسا کچھ نہیں ہوا، تیمور کو کاروبار وسیع کرنے کے لئے کچھ رقم چاہیے تھی ہم بس وہی دیں گے اُسے... اور جو کچھ بھی دیں گے اپنے داماد اور بیٹی کو دیں گے... اس میں کوئی ذلت والی بات نہیں بیٹا..." صبیحہ بیگم آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔" اگر میرے ساتھ کچھ بُرا ہوا تو اسکے ذمہ دار صرف اور صرف آپ لوگ ہونگے... سب کچھ خرید کر دے سکتے ہیں اتنے امیر ہیں آپ.... لیکن کیا تقدیر بھی خرید کر دیں گے مجھے؟؟؟؟" عرشیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور تیزی سے قدم اُٹھاتی امی کے کمرے سے نکل آئی اور اپنے کمرے میں چیخ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اسکے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ سب فیصلے تو اُسکے ماں، باپ کر ہی چکے تھے اور اگلے ہفتے نکاح تھا۔

عرشیہ کے دل میں وسوسے اور خدشات طوفان مچا رہے تھے۔ اُسے اپنی زندگی ایک بھنور میں ہچکولے کھاتی کشتی کی سی لگ رہی تھی جو کسی بھی وقت تباہ ہو سکتی تھی، کسی بھی وقت گہرے سمندر میں غرقاب ہو سکتی تھی۔ اُسے نکاح کی کوئی خوشی نہیں تھی۔ چار و ناچار وہ سسرال سے آنے والے ساس کے زمانے کے بوسیدہ سے جوڑے میں تیار ہو گئی۔ لیکن اس میں بھی وہ ایک پری سی معلوم ہو رہی تھی۔ کمرے میں تیار ہو کر وہ یوں بیٹھ گئی جیسے سزائے موت کا قیدی غسل کر کے اپنے وقتِ پھانسی کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ ایک گھنٹے سے تیمور اور اُسکے گھر والے پہنچ چکے تھے۔ کچھ دیر بعد ابو، شیراز بھائی اور تیمور کا بڑا بھائی، مولوی صاحب کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ بھابھی، امی اور بہنیں پہلے سے عرشی کے کمرے میں موجود تھیں۔ مولوی صاحب نے نکاح کے کاغذات عرشیہ کے سامنے رکھے اور تمام وکیلوں کی موجودگی میں نکاح کی کاروائی شروع کی۔ ''عرشیہ احمد ولد احمد کامران آپکو تمام گواہان کی موجودگی میں ملک تیمور حسن ولد ملک حسن نواز کے نکاح میں باعوض پچیس ہزار حق مہر کے دیتا ہوں۔ کیا آپکو قبول ہے؟'' عرشیہ خاموش رہی اُسکے ہاتھ کانپ رہے تھے، مولوی صاحب نے پھر سے دہرایا ''کیا آپکو قبول ہے؟'' عرشیہ سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا ''قبول ہے'' کہنا چاہ رہی تھی لیکن جب کہنے لگی تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور بمشکل سر ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔ مولوی صاحب نے پین عرشیہ کی طرف بڑھایا جسے اُسنے کانپتے ہاتھوں سے تھام کر بمشکل سائن کیئے۔ اس وقت عرشیہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اُسنے نکاح نامے پہ نہیں اپنے موت کے پروانے پہ دستخط کیئے ہوں۔ سب لوگ اب عرشیہ کے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں آ گئے جہاں دولہا سے ایجاب و قبول اور دعا کروائی جانی تھی۔ دعا کرواتے ہی ہر طرف مبارک ہو، مبارک ہو کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ دیر بعد سب عرشیہ کو بھی ڈرائنگ روم لے آئے میں جہاں تیمور اور اُسکے گھر والے بیٹھے تھے۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے عرشیہ کی نظر جب سامنے کاؤچ پہ گلے میں پھولوں کا ہار پہنے بیٹھے ہوئے تیمور پر پڑی تو وہ اپنی پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی۔ عرشیہ اپنی جگہ سے ہل نہیں پا رہی تھی اور سامنے بیٹھے شخص کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

باب نمبر ۳

ہوسٹل میں آج رات بہت چہل پہل تھی کیونکہ آج وہاں گولڈن نائٹ منائی جا رہی تھی جو ہر مہینے کے لاسٹ ویک اینڈ پہ ہاسٹلز میں مزے دار پکوان بنا کر اور بہت سا ہلا گلا کر کے منائی جاتی تھی۔ سب لڑکیاں بہت خوش دکھائی دے رہیں تھیں اور بہت سے مزے دار کھانوں کی خوشبو میس سے ہاسٹل کے لان تک پہنچ رہی تھی۔ زویا بھی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گپیں لگانے اور اپنی بہن کی شادی کے قصے سنانے میں مصروف تھی۔ رات دیر تک کھانا پینا اور ہلا گلا ہونے کے بعد سب اپنے کمروں میں جا کر سو گئے کیونکہ صبح تھرڈ ائیر کی کلاسز کا آغاز ہو رہا تھا۔ زویا اور اُسکی سہیلیوں نے نیو سٹوڈنٹس اور فرسٹ ائیر سٹوڈنٹس کو تنگ کرنے کا اچھا خاصا پلان بنا رکھا تھا۔ زویا کا گروپ کلاس کا سب سے زیادہ ایکٹیو اور شرارتی تھا۔ ان میں چار لڑکیاں اور تین لڑکے شامل تھے۔ صبح ہوئی تو زویا اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہاسٹل سے یونیورسٹی آ گئی اور آ کر بہت سارے مزاحیہ پوسٹرز جو انہوں نے تیار کر رکھے تھے ان پہ گلیو لگانے لگیں۔ اور پھر جیسے ہی کوئی نیا سٹوڈنٹ یونیورسٹی کا گیٹ کراس کر کے کلاسز کی تلاش میں وہاں پہنچتا یہ پیچھے سے اُسکی کمر پہ زور کا ہاتھ مار کر پوسٹر چپکا دیتے تھے۔ زویا نے ایک لڑکے کو اندر آتا دیکھا تو چپکے سے اُسکا تعاقب کرنے لگی اور جیسے ہی موقعہ پایا اُسکی کمر پہ پوسٹر چپکا دیا اور دور جا کر اپنے گروپ کے ساتھ زور زور سے قہقہے لگانے لگی۔ پوسٹر پہ لکھا تھا "میں گدھا ہوں مجھے گھاس ڈالو۔" ایک اور پوسٹر جو زویا نے ایک لڑکی کے پیچھے چپکایا اُس پہ لکھا تھا "ملی جوڑی" وہ لڑکی جہاں سے بھی گزر رہی تھی سب اُس کو دیکھ کر آوازیں لگاتے اور اُسے دیکھ کر زور زور سے قہقہے لگاتے تھے۔ اور بھی بہت سے یونیورسٹی کے اولڈ سٹوڈنٹس نئے آنے والوں کے ساتھ ایسے کام کر رہے تھے۔ اور بیچارے نئے سٹوڈنٹس جو فرسٹ ائیر اور تھرڈ ائیر میں آئے تھے پرانے سٹوڈنٹس کے مذاق کا نشانہ بن رہے تھے اور اُنکے معصوم چہروں پہ بکھری مظلومیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

"بس بھئی۔ آج کے لئے اتنا بہت ہو گیا۔ میرا تو ہنس ہنس کے بُرا حال ہو گیا ہے۔" قہقہے لگا کر ہنستے ہوئے زین نے اپنے پیٹ پہ ہاتھ رکھ کر سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "لیکن ابھی تو اور بہت سے سٹوڈنٹس نے آنا ہے یار۔ تھوڑا مزہ اور کرنا چاہیے۔" زویا نے زین سے کہا۔ "ہاں یار زویا بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے آج کے دن ہی تو سب کو مزہ آتا ہے بعد میں تو وہی بورنگ روٹین شروع ہو جائے گی۔" رابعہ نے بھی زویا کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "اور سب سے بڑی بات تو اپنا بدلہ چکانے کی ہے یار۔ یاد نہیں ہمارے سینئرز نے ہمارا کیا حال کیا تھا؟" اس بار ایمن بولی تھی۔ "تو اور کیا یار۔ اس موٹے زین کو تو ہم نے لپ اسٹک لگا منہ چھپا کر روتے ہوئے دیکھا تھا تب اس کو بھی اپنے جیسا مظلوم سمجھ کر اپنا دوست بنایا تھا۔" اسد نے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے تھے۔ "اور زویا بیچاری تو اپنے گیلے کپڑے سوکھا رہی تھی ایک جگہ چھپ کر... ہاہاہا۔" سارہ نے بھی اپنا حصہ ڈالا۔ "اور سارہ میڈم آپکو کون بچا کر لایا تھا اتنے سارے لڑکوں کے گروپ میں

سے..." طلحہ نے سارہ کو نیچا دکھایا تو سب پھر کھل کھلا کر ہنس دیے۔ اتنے میں ایک لڑکا جو شکل سے انتہائی لچڑ اور سڑیل دکھائی دے رہا تھا سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اسد نے زویا کو چیلنج کیا کہ اگر وہ اس لڑکے کے سامنے جا کر اُسکے منہ پہ پانی کا بھرا ہوا گلاس اُنڈیلے گی اور فرسٹ ایئر فول تین بار کہہ کر اپنا بدلہ لے گی تو وہ اُسے منہ مانگا انعام دے گا۔ "ہاں زویا جی ۔اب دیکھتے ہیں زویا سکندر میں کتنا ہے دم...؟" زین نے زویا کو چڑھایا ۔زویا سکندر نے بھی کبھی کسی کا چیلنج نہیں ٹھکرایا تھا، سو پانی بھرا گلاس اُس لڑکے کے منہ پر انڈیلنے کے لئے آگے بڑھی۔ اُسکے سامنے پہنچ کر زویا رُکی اور پوری قوت سے پانی اُسکے منہ پہ اچھال دیا۔ اور زور سے بولی 'فرسٹ ایئر فول' ابھی دوبارہ ہی بولا تھا کہ وہ لڑکا آپے سے باہر ہو گیا " تمہاری یہ مجال..." ایک زوردار تھپڑ زویا کے منہ پہ مارنے کے لئے اُس نے اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا تو زویا نے آنکھیں بھینچ لیں ۔اس سے پہلے کہ اُسکا تھپڑ زویا کے حسین چہرے پہ پڑتا کسی نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ جب تھپڑ نہ پڑا تو زویا نے بند آنکھیں کھولیں ، دیکھا تو ایک لڑکے نے اُس کا ہاتھ روک رکھا تھا۔ زویا کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا کیونکہ اُسکو ایسی کسی بات کی توقع نہ تھی۔ "شرم نہیں آتی تمہیں لڑکی پہ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے...؟" اُس نے کہا تھا اور زویا پھٹی آنکھوں سے اُسکو دیکھ رہی تھی۔ زویا نے اُسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا شاید وہ بھی کوئی نیا سٹوڈنٹ ہی تھا لیکن وہ دیکھنے میں بہت وجیہہ اور پُرکشش تھا۔ اُسکا متناسب جسم اُسکی دراز قامت کے ساتھ بہت بارعب دکھائی دے رہا تھا۔ زویا اُسے دیکھتی ہی رہ گئی۔ "اس بدتمیز لڑکی نے مجھ پہ پانی پھینکا ہے۔ تم ہوتے کون ہو میرا ہاتھ روکنے والے...؟" فرسٹ ایئر فول نے جذباتی ہو کر کہا۔ "مرد کے بچے ہو تو آئندہ کسی لڑکی پہ ہاتھ مت اُٹھانا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھے؟ چلو اب نکلو یہاں سے..." اُس نے کہا تو وہ فرسٹ ایئر فول منہ ہی منہ میں گالیاں بکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

دور کھڑے زویا کے سب دوست بھی یہ سب دیکھ کر اُسکے پاس دوڑے چلے آئے۔ "زویا تم ٹھیک تو ہو نا؟" زویا کی سہیلیوں نے پوچھا۔ "ہاں..." زویا نے بمشکل کہا تھا۔ "آپکا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے ہماری دوست کی مدد کی..." اسد نے اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا جو زویا کی طرف دیکھ رہا تھا۔ "یہ تو میرا فرض تھا... کچھ بھی ہو اُسے اِن پہ ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے تھا۔" اُس نے کہا تو زویا نے ممنونیت سے اُسکی طرف دیکھا۔ "اینی ویز... مجھے اسد کہتے ہیں۔ ہم سب دوست ہیں اور تھرڈ ایئر کے سٹوڈنٹس بھی۔" اسد نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا تو اُس نے بھی مسکرا کر ہاتھ ملایا۔ "میرا نام حیدر علی گیلانی ہے اور میں بھی تھرڈ ایئر کا سٹوڈنٹ ہوں یہاں نیا آیا ہوں۔" اپنا تعارف کرواتے ہوئے اُس نے بتایا زویا پھر سے اُسے بغور دیکھنے لگی اور جتنا دیکھتی گئی وہ اُتنا ہی دل میں اترتا گیا۔ اسد نے سب گروپ ممبرز کا تعارف کروایا اور طے یہ پایا کہ آج کے بعد حیدر علی گیلانی بھی اُنکے گروپ کا حصہ اور اُنکا دوست ہے۔ "تھینکس..." زویا نے حیدر کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہا تھا۔ وہ سب اب اپنی تھرڈ ایئر کی پہلی کلاس کے لئے جا رہے تھے۔ "تھینکس فار واٹ؟" حیدر نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ "اُس بدتمیز سے مجھے بچانے کے لئے..." زویا نے مسکرا کر کہا۔ "ویسے تو اس میں تھینکس والی کوئی بات نہیں... لیکن پھر بھی یو آر موسٹ ویلکم..." اُس نے مسکرا کر کہا تو زویا بھی ہنس دی۔ کلاس میں لیکچر کے دوران بھی زویا بار بار حیدر کو دیکھتی رہی۔ حیدر بھی کئی بار اُسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ آج کا دن زویا کی زندگی کا یادگار ترین دن تھا، وہ بار بار اُس وقت کو یاد کر کے مسکرا رہی تھی۔ ہاسٹل میں اپنے کمرے میں لیٹی

وہ حیدر کے بارے میں ہی سوچتی رہی اور تمام رات نیند آنکھوں میں نہ اتری تھی بس حیدر کی باتیں، اُسکی مسکراہٹ اُسکا سراپا آنکھوں میں بسا رہا تھا۔ زویا ایک نئے تجربے سے گزر رہی تھی... محبت کے تجربے سے، جو دنیا کا سب سے حسین ترین تجربہ ہے۔

"زویا میڈم... اب اُٹھ بھی جائیں ورنہ آج کا پہلا لیکچر نہیں لے سکیں گے۔" رابعہ نے زویا کے منہ سے کمبل کھینچتے ہوئے کہا تو وہ بدمزگی سے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ "کیا یار... اتنا اچھا خواب دیکھ رہی تھی..." زویا نے منہ بگاڑتے ہوئے کہا۔ "چلو جلدی تیار ہو جاؤ میں میس سے تمہارے لئے کچھ چیزیں لے آئی تھی، اب انہی سے ناشتہ کر لینا۔" رابعہ نے جلدی سے کہا اور تیار ہونے لگی۔ زویا بھی واش روم فریش ہونے چل دی اور تھوڑی دیر بعد دونوں تیار ہو کر یونیورسٹی میں اپنی کلاس میں تھیں۔ باقی دوست بھی پہنچ چکے تھے لیکن حیدر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اسلئے زویا کے چہرے پہ اُداسی چھانے لگی تھی کیونکہ اُسکی آنکھیں اب صرف حیدر علی گیلانی کی منتظر تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک سے آ پہنچا جب زویا سر جھکائے سلیبس آؤٹ لائن دیکھ رہی تھی جو اُسے زین نے دی تھی۔ "ہیلو فرینڈز... کیسے ہو آپ سب؟" حیدر نے زویا کے قریب کھڑے ہو کر کہا تھا، سب گروپ ممبرز اُس سے علیک سلیک کرنے لگے۔ "آپ کیسی ہیں زویا؟" حیدر نے زویا سے پوچھا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں..." زویا نے کہا تو طلحہ کو شرارت سوجھی وہ جھٹ سے بولا۔ "حیدر صاحب... اب یہ آپ جناب چھوڑ دیجیا دوستوں والا رویہ اپنائیے... یعنی تم کہیے..." طلحہ نے اپنے مخصوص اردو لہجے میں کہا تو سب ہنسنے لگے۔ یونیورسٹی میں اب زیادہ تر وقت حیدر، زویا کے ساتھ ہی گزارتا تھا۔ حیدر علی گیلانی بھی زویا سکندر کی طرح ایک سیاسی خاندان کا چشم و چراغ تھا اور اُسکے بابا اپنے علاقے کے گدی نشین اور مائی باپ کہلاتے تھے۔ زویا اور حیدر دونوں ہی اپنے خاندانی اثر و رسوخ اور سیاسی رنجشوں کی وجہ سے باغی تھے۔ دونوں اپنے خاندان کے رسم و رواج اور مفاد پرستی کی دنیا کو چھوڑ کر اپنی ایک الگ ہی دنیا بسانا چاہتے تھے جہاں نہ دشمنی ہو، نہ سیاست اور نہ ہی اپنے مفادات کی خاطر خون خرابا..... دونوں کی دوستی اب گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ دونوں کی زندگی کے مشترکہ نظریے نے اور اُنکی سوچ کی ہم آہنگی نے اُنکی دوستی کو مزید گہرا کیا تھا بلکہ اب دوستی میں محبت کے جذبات بھی شامل ہونے لگے تھے۔ حیدر جب یونیورسٹی سے باہر نکلتا تھا تو اُسکے بابا کے مسلحہ گارڈز گاڑی سمیت موجود ہوا کرتے تھے۔ اکثر وہ ان چیزوں سے چڑ کھانے لگتا تھا۔ ذرا دیر ہو جاتی تو فون پہ فون آنے لگتے تھے۔ حیدر کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ایک قیدی ہے اور اُسکی زندگی کا دائرہ بہت ہی محدود ہے۔

"زویا خدا کی قسم... میں ان گارڈز کے سائے میں زندگی گزار کر تنگ آ گیا ہوں یار..." حیدر نے کہا تو زویا ہنس دی۔ "ہاں بچہ... ہنسو، ہنسو اور ہنسو... اگر تمہارے اردگرد بھی یہ سب ہوتا ناں تو پوچھتا تمہیں..." حیدر نے مظلومیت سے کہا۔ "تو چلو آج ایسا کرتے ہیں کہ ہم ان سب سے چھپ کر کہیں دور جا کر زندگی کے چند پل آزادی کی فضا میں سانس لیتے ہیں...؟" زویا نے حیدر کو آفر دی، وہ ہمیشہ سے ہی باغی اور آزاد طبیعت کی مالک تھی اور ایسی شوخ باتیں اور جذباتی حرکتیں اُسکا پرانا شیوہ تھیں۔ "مذاق اُڑا رہی ہو میرا؟" حیدر نے سنجیدگی سے پوچھا۔ "ارے نہیں بابا... میں سچ کہہ رہی ہوں... چلو ایسا کرتے ہیں فوڈ سٹریٹ چلتے ہیں۔ وہاں کھائیں گے پیئیں گے سوچ کریں گے..." زویا نے پل بھر میں سارا پلان بنا لیا۔

''نہیں زویا... میں اپنی خاطر تمہاری جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا... میرے بابا کے اس شہر میں بہت سے دشمن ہیں اور ویسے بھی جہاں بھی جائیں گے یہ مسلح گارڈز ساتھ ہونگے اور مجھے پبلک پلیسز پہ بہت آکورڈ فیل ہوتا ہے انکی وجہ سے...'' حیدر نے بے بسی سے کہا۔''اوہو بھئی کچھ نہیں ہوتا دشمن ہر جگہ نہیں بیٹھے ہونگے ڈرپھوک... اور رہا گارڈز والا مسئلہ تو ہم آج پچھلے گیٹ سے باہر نکلتے ہیں کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔'' زویا نے کہا اور حیدر کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی اُسے پچھلے گیٹ سے باہر لے گئی۔ یونیورسٹی کے باہر والے بس سٹاپ سے دونوں بس میں بیٹھے اور سید حافوڈ سٹریٹ اتر گئے۔ وہاں زویا نے بہت سے مزے کے کھانے آرڈر کیے تھے اور بہت سی چیزوں کے بارے میں سوچ کر ابھی سے اُسکے منہ میں پانی آرہا تھا۔''اُف ابھی تو مجھے گول گپے بھی کھانے ہیں اور چٹپٹی لاہوری چرغہ اور قلفی والا فالودہ اور... اور...'' زویا تو بس کھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی اور حیدر کو اُسکی ایسی بچگانہ حرکتوں پہ بے حد پیار آرہا تھا وہ بس اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور اُسکی باتیں اُسے زندگی سے بھرپور محسوس ہو رہیں تھیں۔ آج وہ حقیقی معنوں میں خود کو بہت ہلکا اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔'' حیدر کھانے کے بعد میں تمہارے ساتھ ریس لگاؤں گی گول گپے کھانے میں... دیکھیں گے بچو کس میں کتنا ہے دم... ہاں جی...'' زویا ابھی سے حیدر کو چیلنج کر رہی تھی۔''ہاں، ہاں ضرور دیکھ لینا... پہلے کھانا تو کھالو۔'' حیدر نے کہا تو وہ جلدی جلدی کھانا کھانے لگی۔ کچھ دیر بعد انہوں نے گول گپے کھانے کی ریس لگائی جس میں زویا نے حیدر کو ہرا دیا۔''بس بھئی زویا... میں اس سے زیادہ نہیں کھا سکتا۔ تم جیتی میں ہارا...'' حیدر نے پیٹ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''ہاہاہا... دیکھا ناں ہرا دیا میں نے تمہیں۔ زویا سکندر سے تم کبھی نہیں جیت سکتے سمجھے مسٹر حیدر علی گیلانی...؟'' زویا نے فخریہ لہجے میں کہا تھا۔ حیدر کے موبائل کی بیپ بہت دیر سے بج رہی تھی اُسکے گارڈز اُسکے لئے خاصے پریشان ہو رہے تھے کیونکہ وہ معمول سے تین گھنٹے لیٹ ہو چکا تھا۔''چلو زویا۔ بہت دیر ہو گئی ہے اب واپس چلیں۔'' حیدر نے اُٹھتے ہوئے کہا۔''کیا؟؟؟ لیکن ابھی تو ہم نے قلفی بھی کھانی تھی حیدر...'' زویا نے بچوں کی طرح ضد کی تھی۔''اگلی بار کھا لینا موٹی... بہت پیٹو ہو تم۔'' حیدر نے ہنستے ہوئے کہا۔''اب ایسے تو نہ کہو...'' زویا مزید خفا ہوئی۔''اچھا اب چلو۔ کیوں میرا کورٹ مارشل کروانا چاہتی ہو؟'' حیدر نے کہا اور اُسے ہاتھ سے گھسیٹتا ہوا ساتھ لے گیا۔ دونوں بس سے واپس یونیورسٹی پہنچے اور پھر حیدر اپنے گارڈز کے ساتھ گھر چلا گیا اور زویا ہاسٹل واپس آگئی۔ محبت بھی عجیب احساس ہے۔ زندگی کے کسی بھی حصے میں ہم اسکا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسے کینسر کی طرح ہوتی ہے جسکا پتہ تب چلتا ہے جب یہ بالکل بے قابو ہو جاتی ہے اور ہمارے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہوتی ہے۔ محبت بھی کینسر کی طرح اپنی آخری سٹیج پہ اپنے مریض کو اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہے جو اس سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ زویا اور حیدر بھی محبت کے مرض میں مبتلا ہوتے چلے جا رہے تھے لیکن دونوں ایک دوسرے کے جذبات سے بے خبر تھے۔ اُنکی محبت لفظوں سے نہیں بلکہ ایک دوسرے کے لئے کیے جانے والے اعمال سے ظاہر ہوتی تھی۔ زویا اور حیدر جتنے جذباتی تھے اُتنی ہی اُنکی محبت لفظوں کے کھیل سے پاک تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے دل کی کیفیتوں سے بے خبر یک طرفہ طور پہ ایک ہی راہ پہ گامزن تھے۔

بہت زیادہ کھانا اور تلے کھانے سے زویا کی رات کے وقت طبیعت بگڑ گئی اور فوڈ پوائزننگ کی وجہ سے اُسکو ہاسپٹل لے جانا پڑا

جہاں اُسکو فرسٹ ایڈ کے ساتھ ایک ڈرپ بھی لگانی پڑی۔ رابعہ رات بھر اُسکے ساتھ ہاسپٹل میں رہی اور صبح تک زویا کی طبیعت سنبھلی نہیں تھی۔ اسلئے ڈاکٹرز نے اُسے کچھ گھنٹے انڈر آبزرویشن رکھا ہوا تھا اور شام کے وقت ڈسچارج کرنا تھا۔

دونوں اگلے دن یونیورسٹی نہیں پہنچیں تھیں تو حیدر سمیت سب دوستوں کو پریشانی ہو رہی تھی اور حیدر کا تو ایک ایک پل بھاری گزر رہا تھا۔ اُسے زویا کے بغیر کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا ہر کام بے مزہ اور ہر جگہ بے رنگ دکھائی دے رہی تھی۔ اُسے زویا کی کتنی عادت ہو گئی تھی یہ بات اُسے آج معلوم ہوئی تھی۔ زین کافی دیر سے زویا کو فون کر رہا تھا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ پھر اُس نے رابعہ کو کال ملائی تو اُنہیں معلوم ہوا کہ زویا کی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے وہ دونوں ہاسپٹل میں ہیں۔ حیدر کو پتہ چلا تو جیسے اُسکا سر چکرا سا گیا اور اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ سب دوست فکر مند تھے اسلئے سب ایک ساتھ ہی زویا کو دیکھنے ہاسپٹل پہنچ گئے۔ حیدر سب سے آگے تھا اور بے حد تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا وہ زویا کے روم پہنچا جہاں رابعہ اُن سب کی منتظر تھی۔ سب دوستوں نے حیدر کی بے قراری محسوس کی تھی اور سب نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں حیدر کو زویا کی محبت کا شکار قرار دیا تھا۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے اسلئے انہیں کسی اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ حیدر کی بے چینی اور فکر مندی نے اُسکی محبت کا راز افشاں کر دیا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوتا سیدھا بیڈ کے قریب پہنچا جہاں زویا کو ڈرپ لگی ہوئی تھی اور وہ کسی دوائی کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہی تھی۔ رابعہ اُنکو دیکھ کر کرسی سے اُٹھ گئی جس پہ وہ نیم دراز تھی۔

"رابعہ! اسے کیا ہوا تھا؟" حیدر نے نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پتہ نہیں کیا کھا لیا تھا اس نے... ڈاکٹرز کہہ رہے ہیں فوڈ پوائزننگ ہوئی ہے۔ رات کو بارہ بجے کے قریب وامٹنگ سے زویا کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی اسلئے اُسے ہاسٹل کی ایمبولینس میں ڈال کر ہاسپٹل لانا پڑا۔" رابعہ نے سب کو تفصیل سے بتایا تھا۔ "لیکن یہ اس طرح بے ہوش کیوں ہے؟" طلحہ نے فکر مندی سے پوچھا۔ "یار یہ بے ہوش نہیں ہے ڈاکٹرز نے اسے نیند کا انجکشن دیا ہے کیونکہ رات بھر بہت طبیعت خراب رہی تھی اسلئے کچھ دیر سونے سے یہ بہت بہتر فیل کرے گی۔" رابعہ نے بتایا۔ "کب ہوش آئیگا زویا کو؟ یہ ٹھیک تو ہو جائے گی ناں...؟" حیدر کی آواز لڑکھڑا رہی تھی سب اُسکی طرف دیکھنے لگے اُسکی آنکھوں میں اب واقعی آنسو تھے۔ "ارے... حیدر یہ اب بالکل ٹھیک ہے تم فکر نہیں کرو ابھی کچھ دیر میں ہوش آجائیگا زویا کو..." رابعہ نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے زویا کو..." حیدر کمرے سے باہر نکل گیا وہ اب باہر بیٹھ کر آنسوؤں سے رونے لگا۔ "حیدر تمہیں کیا ہو گیا ہے یار... تم خود کو قصور وار کیوں ٹھہرا رہے ہو؟" اسد نے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کل میں اور زویا فوڈ سٹریٹ گئے تھے جہاں وہ اُلٹا سیدھا کھاتی رہی میرے ساتھ... میرا دل بہلانے کے لئے... مجھے خوش کرنے کے لئے... سب میری وجہ سے ہوا۔ مجھے معلوم ہوتا کہ اُسکی طبیعت ایسے خراب ہو سکتی ہے تو میں اُسکی ایسی فرمائش کبھی پوری نہ کرتا..." حیدر ہچکیوں سے رو رہا تھا اور سب اُسے دیکھ رہے تھے۔ "جو بھی ہونا تھا سو ہو گیا لیکن اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں حیدر" اسد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "حیدر مجھے لگتا ہے تمہیں زویا سے محبت ہو گئی ہے... ورنہ تم اس طرح اُسکے لئے نہ روتے۔" زین نے سنجیدگی سے کہا تو حیدر اُسکی طرف

حیرت سے دیکھنے لگا۔"ہاں... مجھے بھی یہی لگتا ہے یار کیونکہ ایک مرد کی آنکھوں میں صرف دو عورتوں کے لئے آنسو آتے ہیں ایک اُسکی ماں ہوتی ہے اور دوسری وہ عورت جسے وہ اپنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے چاہتا ہے..." اسد نے زین کی تائید میں کہا تو حیدر اُن دونوں کو حیرت کا بت بنا دیکھتا گیا جیسے وہ اپنے اندر پلنے والے اس جذبے سے بے خبر رہا تھا اور اب جب اُسے اس بات کا احساس ہوا ہے تو وہ اس پہ یقین کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر بعد سارہ اور ایمن نے باہر آ کر بتایا کہ زویا کو ہوش آ گیا ہے سب باری باری اُس سے مل لیں کیونکہ ڈاکٹرز نے مریض کے قریب رش لگانے سے منع کیا ہے۔ اسد اور زین نے حیدر کو اندر جانے کا اشارہ کیا تو حیدر اُنکا شکریہ ادا کرتے ہوئے اندر چلا گیا۔ رابعہ بھی باقی دوستوں کے ساتھ باہر آ گئی تھی۔ حیدر نے زویا کا نام پکارا تو زویا نے آہستہ سے آنکھیں کھول کر اُسے دیکھا۔ حیدر کو دیکھتے ہی زویا کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی، وہ ہولے سے مسکرا دی تو حیدر اُسکے پاس بیٹھ گیا اور اُسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔"اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟" حیدر نے اُسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔"ٹھیک ہوں۔" زویا نے آہستہ سے کہا۔"تھینک گاڈ... تم نے جان ہی نکال دی تھی میری۔" حیدر نے کہا تو زویا مسکرا دی۔" آئی ایم سوری زویا... یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے میری وجہ سے یہ سب کیا اور تمہاری طبیعت خراب ہوئی..." حیدر سر جھکا کر کہا جیسے بے حد شرمندہ ہو۔"تمہیں کس نے کہا کہ یہ سب میں نے تمہارے لئے کیا تھا؟" حیدر نے سر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھا۔"کیا مطلب؟" نا سمجھتے ہوئے اُس نے زویا سے پوچھا۔

"یہ سب میں اپنے لئے کیا تھا تمہارے لئے نہیں۔ سمجھے؟" زویا نے کہا تو حیدر مسکرا دیا۔"اچھا اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔ ورنہ میرے ساتھ گول گپے کون کھائے گا؟" حیدر نے کہا تو زویا ہنس دی۔ شام کو زویا کافی بہتر تھی اسلئے اُسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا اور سب دوست اُسے اور رابعہ کو ہاسٹل ڈراپ کر کے اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

☆......☆......☆

کچھ دن بعد زویا بالکل صحت مند ہو کر پھر سے معمول کے مطابق یونیورسٹی جانے لگی تھی۔ اپنے گھر میں اُس نے جان بوجھ کر اپنی بیماری کی خبر نہیں دی تھی کیونکہ وہ گھر جانا بھی نہیں چاہتی تھی اور نہ ہی چاہتی تھی کہ بابا اُسے زبردستی آ کر گھر لے جائیں۔ پہلے وہ مہروکی وجہ سے دو ہفتوں یا مہینے بعد چلی جایا کرتی تھی لیکن اب اُسکا اتنی جلدی جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا سو وہ نہیں گئی۔ لیکن حیدر کو چند دنوں کے لئے گاؤں جانا پڑا کیونکہ اُسکے والد پیر شہباز علی گیلانی نے اُسے کسی کام سے بلایا ہوا تھا۔ حیدر شام کے وقت ملتان کے قریب گاؤں میں جو اُسکا آبائی گاؤں تھا، پہنچ چکا تھا۔ بابا حویلی کے لان میں ہی اُسکے منتظر تھے، اُسے دیکھتے ہی وہ اپنے چہیتے بیٹے کے استقبال کے لئے کھڑے ہو گئے تھے۔ حیدر اپنے باپ پیر شہباز علی گیلانی کا چھوٹا اور بے حد لاڈلا بیٹا تھا۔ حیدر جب چھوٹا تھا تب ایک حادثے میں اُسکی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ تب سے پیر شہباز علی گیلانی نے اپنے چھوٹے بیٹے کو نا صرف باپ بلکہ ماں کا پیار بھی دیا تھا۔ حیدر کا ایک بڑا بھائی بھی گاؤں میں بابا کے ساتھ رہتا تھا لیکن دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا کیونکہ شہاب علی گیلانی اپنے بابا کے ساتھ گاؤں کے سخت ماحول میں پلا بڑھا تھا اور اُنکے ساتھ سیاسی معاملات اور گاؤں کے لوگوں کے معاملات میں ہمیشہ پیش پیش رہا کرتا تھا۔

حیدر جب بھی گاؤں آتا تھا شہاب اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پہ گیا ہوتا تھا یا پھر جا رہا ہوتا تھا۔ حیدر کو اُسکے بابا نے شروع سے ہی شہر میں رکھا تھا جسکی دو بڑی وجوہات تھیں ایک تو وہ اُسے بہت زیادہ پڑھانا لکھانا چاہتے تھے اور دوسری وجہ سیاسی دشمنیوں سے اُسے دور رکھنا۔ حیدر کو اُسکے بابا اپنی گدی کا وارث بنانا چاہتے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ پڑھ لکھ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ اپنے علاقے کے لوگوں کے مسائل حل کرے اور اُنکی خوشحالی کے لئے اقدامات کرے۔ شہاب بچپن ہی سے پڑھائی میں کمزور تھا اور دوسری سرگرمیوں میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ اور اُسکا مزاج بھی شدت پسند تھا اسلئے پیر شہباز علی اُسکو اپنی گدی کا وارث نہیں بنانا چاہتے تھے ورنہ اصولاً بڑا بیٹا ہی گدی نشین ہوتا تھا۔ آج اُنہوں نے حیدر کو اسلئے بلایا تھا کیونکہ وہ حیدر کو اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی 'سوہائی' کے ساتھ منسوب کرنے کا ارادہ رکھتے تھے تاکہ خاندان میں منسوب ہو کر حیدر کی حیثیت اور مضبوط ہو جائے۔ لیکن وہ حیدر کے دل میں بستی زویا کی محبت سے بالکل بے خبر تھے۔

''حیدر میں چاہتا ہوں کہ اس ہفتے میں تمہاری اور سوہائی کی رسم نسبت ادا کر دوں...'' کھانے کی میز پہ بابا نے اُسکے سر پہ اچانک ہی جیسے بم پھوڑ دیا تھا اور حیدر اُنہیں ہونقوں کی طرح دیکھنے لگا جیسے اُسے اپنے کانوں پہ یقین ہی نہیں آیا تھا۔ ''ہاں پتر... سوہائی تمہارے چاچا کی بیٹی ہے اور سلجھی ہوئی سمجھدار لڑکی ہے۔ بے شک وہ تمہارے لئے بہترین شریکِ حیات ثابت ہوگی۔'' بابا نے اُسکی حیرت بھانپتے ہوئے اپنی بات کو تفصیلاً دوہرایا تھا۔ ''لیکن بابا اتنی جلدی کیا ہے؟ ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں اور ویسے بھی مجھے لاء کرنے میں کم از کم تین سال لگ جائیں گے...'' حیدر نے دلیل پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں تو اس میں کیا مسئلہ ہے؟ منگنی کر دیں گے اور شادی تب ہوگی جب تم ان کاموں سے فارغ ہو جاؤ گے...'' بابا اپنی بات پہ قائم تھے۔ ''بابا میں ابھی اس قسم کے کسی بھی بندھن میں بندھنا نہیں چاہتا کیونکہ میں اپنی پوری توجہ پڑھائی کو دینا چاہتا ہوں۔ پلیز مجھے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔'' حیدر سخت اُلجھن کا شکار تھا وہ کسی قیمت پہ سوہائی سے شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اُسکے دل کے سنگھاسن پہ صرف اور صرف زویا کا راج تھا اور وہ اپنی زندگی میں بھی صرف اُسی کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھا جو محبت کسی اور سے کرتے ہیں اور شادی کسی اور سے... لیکن ابھی فی الحال وہ بابا کو زویا کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا وہ خاندان سے باہر شادی پہ ہرگز نہیں مانیں گے۔ حیدر اُس نظام سے جڑا ہوا تھا جہاں لڑکیوں کی شادی خاندان سے باہر نہیں کی جاتی چاہے وہ عمر بھر کنواری رہیں یا کسی مرد کی دوسری تیسری یا چوتھی بیوی بنیں لیکن شادی صرف اور صرف خاندان کے مرد سے ہی ہوگی۔ حیدر شہر کا پڑھا لکھا لڑکا تھا اور اپنے ساتھ جڑے نظام سے اُسے سخت چڑ اور کوفت محسوس ہوتی تھی۔ وہ اپنے بابا کی ریاست کا ایک باغی باشندہ تھا لیکن ابھی اُس نے بغاوت کا اعلان نہیں کیا تھا۔ ''میرے پتر... میں جانتا ہوں تم شہر کے پڑھے لکھے بندے ہو یہ سب باتیں اچانک تمہیں سہی نہیں لگیں گی لیکن تم اس بارے میں سوچو... اور میں مثبت جواب کا انتظار کرتا ہوں۔'' پیر شہباز علی نے حیدر کو سوچ میں ڈوبا دیکھ کر کہا اور اُسکے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہہ کر چل دیے اور حیدر وہیں گم صم بیٹھا رہا جیسے کچھ بھی سمجھ نہ پایا ہو... وہ اُسے سوچنے کا وقت دے کر چلے گئے لیکن بنا کسی چوائس کے۔ اگلے دن حیدر واپس شہر چلا آیا تھا کیونکہ وہ زیادہ دیر زویا سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ حیدر کا ذہن بابا کی باتوں میں بے حد اُلجھ رہا تھا وہ جانتا تھا کہ اپنے ساتھ جڑے اس نظام کو بدلنا ناممکن ہے اور زویا کے بغیر رہنا بھی

ممکن نہیں رہا تھا۔ ایسے میں سوائے بغاوت کے اُسکے پاس کوئی چارہ نہیں تھا لیکن ایک موہوم سی اُمید تھی کہ شاید بابا مان جائیں کیونکہ وہ اُنکا بہت چہیتا بیٹا تھا اور گدی کا وارث تو شہاب کو بننا تھا اسلئے کہ وہ بڑا بیٹا تھا۔ پھر ایسے میں سوہائی اور شہاب کی شادی کروا کر اُسے گدی نشین بنا دینا چاہیے۔ اگر ایسا ہو جائے تو بابا کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور حیدر پر کوئی دباؤ بھی نہیں رہے گا۔

حیدر آجکل یونیورسٹی میں بھی انہی باتوں میں کھویا رہتا تھا کہ کس طرح اپنی محبت کی راہیں ہموار کرے۔ ''کیا بات ہے حیدر... جب سے گاؤں سے ہو کر آئے ہو کھوئے کھوئے سے رہتے ہو... سب ٹھیک تو ہے ناں؟'' زویا نے آخر پوچھ ہی لیا تھا۔ ''ہاں... سب ٹھیک ہے۔'' حیدر نے بات چھپاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم پریشان ہو؟'' زویا نے اُسکی پریشانی بھانپتے ہوئے کہا تھا لیکن حیدر ابھی اُسے کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا جب تک کہ وہ زویا سے اقرارِ محبت نہیں کر لیتا اور اظہارِ محبت نہیں سن لیتا۔ ''نہیں بھئی... ایسی کوئی بات نہیں تمہیں وہم ہوا ہے۔'' حیدر نے اُسے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ ''اچھا تو پھر آج لاسٹ لیکچر کے بعد سب دوستوں کے ساتھ کہیں لنچ پہ چلتے ہیں اسطرح سب کا موڈ فریش ہو جائے گا۔ واٹ یو سے؟'' زویا نے چٹکی بجاتے کہا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میرے گارڈز؟؟؟'' حیدر نے بے بسی ظاہر کی لیکن زویا کہاں رکنے والی تھی۔ ''اوہو بھئی... ہم پچھلے گیٹ سے نکلیں گے... بس ڈن ہو گیا۔'' زویا نے حتمی انداز میں کہا اور سب دوستوں کے موبائل پہ میسج کر دیا۔ لاسٹ لیکچر دوپہر ایک بجے ختم ہوا تھا اور پھر سب اکٹھے ہو کر لنچ کے لئے نکل گئے۔ سب نے مل کر خوب ہلا گلا کیا جس سے حیدر کا موڈ بہت فریش ہو گیا تھا اور اسی موج مستی میں وہ بالکل ہی بے فکر ہو گیا تھا اور اُسے یاد بھی نہیں رہا کہ وہ گارڈز سے چھپ کر خود کو خطرے میں ڈالے یہاں بیٹھا ہے۔ کچھ دیر بعد سب دوست ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھر جانے لگے رابعہ زین کے ساتھ چلی گئی اور زویا کو حیدر نے روک لیا تھا۔ کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ آج اُس سے اپنی محبت کا برملا اظہار کر دے اور اُس سے اُسکا ساتھ مانگ لے۔ حیدر اور زویا بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ حیدر اپنی محبت کے اظہار کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب کرنے کا سوچ رہا تھا کہ حیدر نے چند مشکوک لوگوں کو ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے دیکھا تو خطرے کو بھانپتے ہوئے زویا کو لیکر ریسٹورنٹ سے باہر پارکنگ میں آ گیا جہاں اسد اپنی گاڑی کے ساتھ اُنکا انتظار کر رہا تھا۔ حیدر نے جلدی سے اُسے گاڑی نکالنے کا اشارہ کیا لیکن اس سے پہلے کہ اسد گاڑی لیکر پہنچتا وہی مشکوک دونوں آدمی بھی پہنچ گئے۔ حیدر کو دیکھتے ہی ایک نے پستول نکالی، حیدر کا چہرہ دوسری طرف تھا کیونکہ وہ اسد کو گاڑی جلدی نکالنے کا اشارہ کر رہا تھا، لنچ کا ٹائم ہونے کی وجہ سے پارکنگ میں گاڑیوں اور لوگوں کا بہت رش تھا قریبی آفسز سے بھی لوگ اس وقت لنچ کرنے یہاں آتے تھے۔ زویا نے اُس آدمی کو دیکھ لیا اور اس سے پہلے کہ وہ حیدر پہ فائر کرتا زویا حیدر کے آگے آ گئی اور گولی جو حیدر کی جان لینے کے لئے چلائی گئی تھی وہ زویا کو لگ گئی۔ گولی چلنے کی آواز پہ حیدر نے مڑ کر دیکھا تو زویا زمین پہ خون میں لت پت پڑی تھی اور ہر طرف بھگدڑ مچ چکی تھی۔ ریسٹورنٹ کے سیکورٹی گارڈ نے اپنی گن تان لی تھی لیکن وہ دونوں آدمی بھیڑ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھاگ چکے تھے۔ حیدر نے زویا کو خون میں لت پت دیکھا تو اُسکے منہ سے دل خراش چیخیں نکلی تھیں جو بھگدڑ کے شور میں کہیں دب گئیں تھیں۔ ''زویا...... یہ تم نے کیا کیا... زویا......'' زویا مکمل طور پہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی تھی۔

☆......☆......☆

دوپہر کے تین بج رہے تھے جب موبائل بجنا شروع ہوا تھا لیکن مسلسل پندرہ منٹ تک فون کال آنے کے بعد آخر اُسکی نیند ٹوٹی تھی۔اُس نے ناگواری سے موبائل کی سکرین پہ نمبر دیکھا اور اپنے سینے سے لڑکی کو پرے ہٹا کر فوراً اُٹھ بیٹھا کل رات بہت زیادہ شراب پی لینے سے اُسکا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔لڑکی نے ناگواری سے بڑبڑاتے ہوئے کروٹ بدلی تھی۔

اُس نے کال ریسیو کی تھی "ہاں بول...کام ہو گیا؟" اُس نے پُر اعتماد لہجے میں سوال کیا۔"پیر صاحب...کام نہیں ہو سکا..." دوسری طرف سے بوکھلائی ہوئی آواز آئی۔"اوئے کیا مطلب ہے تیرا...؟" اُس نے غصے سے پوچھا۔"پیر صاحب..میں نے ٹھیک نشانہ لیا تھا لیکن اچانک ہی ایک لڑکی سامنے آ گئی اور گولی اُسکو جا لگی...پیر صاحب میرا کوئی قصور نہیں..." ڈری ہوئی آواز میں کہا گیا تھا۔"سالے کتو...تم لوگوں نے ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی تھیں جو نشانہ چوک گیا ہاں...؟؟ مرو اب جا کر کہیں چھپ جاؤ اور جب تک میں نہ کہوں باہر نہ نکلنا..." غصے سے اُسکی سانس پھول رہی تھی۔سائیڈ ٹیبل پہ پڑی شراب کی بوتل اور گلاس اُس نے اُٹھا کر زمین پہ دے مارا اور جلدی سے قمیض پہن کر بستر سے اُٹھ گیا۔ڈیرے پہ باہر کھڑے دو محافظوں میں سے ایک نے آواز دے کر خیریت معلوم کی۔پاس لیٹی ہوئی لڑکی بھی ہڑبڑا کر اُٹھ چکی تھی اور حیرت سے اُسے غصے سے پھنکارتا ہوا دیکھ رہی۔"کیا ہوا پیر صاحب...سب خیریت تو ہے؟" اُس نے اپنے کپڑے درست کرتے ہوئے پوچھا۔"حرامیوں سے کوئی کام ڈھنگ کا نہیں کیا جاتا...چھوڑوں گا نہیں اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو..." اُس نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔باہر کھڑے محافظ فوراً متوجہ ہوئے تھے۔"اوئے بشیرے...میری گڈی لے آ..." اُس نے حکم دیا تو ملازم گاڑی لانے کو دوڑا۔"اوئے خیرو...نازو تیار ہو جائے تو اُسے کوٹھے پہ واپس چھوڑ آنا۔میں حویلی جا رہا ہوں..." اُس نے دوسرے ملازم کو حکم دیتے ہوئے کہا اور خود گاڑی میں بیٹھ کر حویلی کی طرف چل دیا۔اُسے اپنے مقصد میں ناکام ہونے کی وجہ سے بے حد غصہ آ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ مسئلہ زیادہ طول نہ پکڑے۔گولی جس لڑکی کو لگی ہے اگر وہ مر گئی یا کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہوئی تو معاملہ بہت بگڑ جائے گا...اور بہت سی باتیں اُسکے ذہن کو حادثے کے دے رہی تھیں۔لیکن وہ بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا اور ہر کام میں پڑنے سے پہلے اُسکا اختتام کیسے کرنا ہے یہ بھی ذہن میں رکھا کرتا تھا۔اُسے زیادہ غصہ اسلئے آ رہا تھا کیونکہ اُسکا کام نہیں ہو سکا تھا۔اگر پیر حیدر علی گیلانی مارا جاتا تو اُسکے راستے کی ہر رکاوٹ دور ہو جاتی اور وہ ہر اُس چیز کو حاصل کر لیتا جو حیدر کے ہوتے ہوئے حاصل کرنا ناممکن تھا۔اب اُسے پہلے سے زیادہ محتاط ہو کر ایک نیا پلان بنانا تھا اپنے دشمن سے جان چھڑانے اور اُسے راستے سے ہٹانے کے لئے لیکن وہ پہلے اس مسئلے کے ٹھنڈے ہونے کا انتظار کرے گا اور پھر اپنے نئے منصوبے کے بارے میں سوچے گا۔اپنی حویلی کے گیٹ پہ پہنچ کر گاڑی کی بریک لگنے سے اُسکی سوچوں کا تسلسل ٹوٹا تھا۔گاڑی اب حویلی کے اندر داخل ہو چکی تھی اور ایک ملازم نے آ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور ایک ہاتھ سے سلام کیا۔وہ گاڑی سے اُتر کر اپنے کاندھوں پہ چادر رکھتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

باب نمبر ۴

انسان کی ساری زندگی ہی ایک آزمائش ہوتی ہے۔ پیدائش سے لیکر موت تک انسان کو پے در پے آزمائشوں کا سامنا ہی رہتا ہے اور جب تک جیتا رہتا ہے زندگی اُسے آزماتی رہتی ہے۔ کبھی خدا اُسے دے کر آزماتا ہے اور کبھی چھین کر آزماتا ہے لیکن یہ انسان پہ منحصر ہے کہ وہ اپنے رب کی تقسیم پہ راضی رہ کر سرخرو ہو جاتا ہے یا پھر اپنی تقدیر سے لڑ کر رب کی تقسیم سے بڑھ کر پانے کی کوشش کرتا ہے۔

☆.....☆.....☆

تبریز کی زندگی میں جدائی کا زہر گھولنے والا اور کوئی نہیں اُسکا اپنا باپ تھا۔ لیکن روی نے بھی اس جنگ میں اُسکا ساتھ نہیں دیا تھا۔ رومیسہ تھی ہی ایسی... دوسروں کی خاطر اپنا حق چھوڑ دینے والی... خود سے بڑھ کر دوسروں کا خیال رکھنے والی۔ تبریز نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ اُسکے لئے سب کو چھوڑ دے گا اور دونوں اپنی دنیا الگ بسائیں گے لیکن روی کسی طور بھی تبریز کے گھر والوں سے الگ ہو کر گھر بسانے پہ آمادہ نہیں تھی۔ اُس نے اس جدائی کو ہی اپنا مقدر سمجھ کر تقدیر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چار سال کی کوششوں سے آخر وہ عاجز آ چکی تھی اب اُس میں مزید ایسی باتیں برداشت کرنے کا مادہ نہیں رہا تھا اور اب وہ زیادہ دیر تک اپنے والدین کو بھی نہیں روک سکتی تھی۔

"روی... میں سب کچھ چھوڑ دوں گا تمہاری خاطر... مجھے زندہ رہنے کے لئے صرف اور صرف تمہاری ضرورت ہے اور کسی چیز کی نہیں..." تبریز نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا تھا۔

"نہیں... ایسا کچھ نہیں کرو گے تم۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے لئے کچھ بھی چھوڑو..." روی نے حقیقت پسندانہ انداز میں اُسے کہا تھا لیکن تبریز کہاں سمجھنے والا تھا۔ "نہیں جان... میں تمہارے لئے اپنے ماں باپ تو کیا... دنیا بھی چھوڑ سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں کھو کر میں جی نہیں پاؤں گا۔" تبریز کے درد بھرے لہجے نے روی کا دل چیر دیا تھا لیکن وہ جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتی تھی سو خود کو سنبھال کر پھر سے اُسے سمجھانے لگی۔ "تبریز... میں یہ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے تم اپنے حقیقی رشتوں سے کٹ جاؤ... اگر میں اپنے ماں باپ کو تمہاری خاطر نہیں چھوڑ سکتی تو میں یہ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ تم میرے لئے اپنے ماں باپ کو چھوڑو..." روی نے اٹل لہجے میں اُسے حقیقت بتائی تھی۔ "لیکن مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا... مجھے صرف اور صرف تمہارا ساتھ چاہیے روی۔ تمہارے سوا مجھے کسی کی پرواہ نہیں..." تبریز اپنی بات پہ قائم تھا۔ "نہیں تبریز... میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ کیونکہ جو چیز میں خود اپنے لئے پسند نہیں کرتی وہ میں تمہیں بھی کرنے نہیں دوں گی۔" روی نے بھی اٹل فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ تبریز کو کبھی بھی اُسکے والدین سے جدا نہیں کرے گی۔

"روی تم کچھ بھی کہو لیکن میں تمہیں کسی قیمت پہ بھی نہیں چھوڑوں گا۔ تم صرف میری ہو... صرف میری سنا تم نے...؟" وہ

جذبات سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ رومیسہ کو اُسکا لہجہ اندر تک ہلا گیا تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ تبریز اپنی دھن کا پکا تھا۔ لیکن روی نے بھی کبھی اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کیا تھا وہ ایک حساس دل کی لڑکی تھی اور کبھی بھی کسی پہ زیادتی ہرنے والوں میں سے نہ تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ تبریز اپنے گھر اور والدین کو اُسکی خاطر چھوڑے اور اُنکے بغیر اپنی خوشیوں کو حاصل کرے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ والدین کی دعاؤں کے بغیر اُنکی آہوں کے ساتھ جو بچے اپنی زندگی کا آغاز کرتے ہیں کبھی خوش نہیں رہتے۔ "تبریز یہ سب غلط ہے۔ پلیز سمجھنے کی کوشش کرو... تم اپنی کزن سے شادی کرلو۔ میں تمھیں کبھی بھی بے وفا نہیں کہوں گی... میری طرف سے تم آزاد ہو۔" روی نے دل پہ پتھر رکھ کر اس سے کہا تھا۔ یہ سب کتنا تکلیف دہ تھا وہی جانتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اپنی چاہت کسی اور کو پلیٹ میں سجا کر دے رہی ہے لیکن اسکے سوا وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی...؟ "نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم آخر کرنا کیا چاہتی ہو ہاں...؟ اگر نہیں دے سکتی میرا ساتھ تو بتا دو مجھے... لیکن اس طرح میرے پیار کی توہین کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تمھیں سمجھی تم...؟" تبریز اُسکی بات پہ اب بھڑک اُٹھا تھا اور غصے سے چلا رہا تھا۔ "ہاں... ہاں نہیں دے سکتی میں تمہارا ساتھ اب۔ نکل جاؤ میری زندگی سے... کرلو اپنے ماں باپ کی پسند سے شادی..." روی میں اب مزید برداشت نہیں رہی تھی وہ پہلے ہی یہ سب دل پہ ایک بھاری سل رکھ کر کر رہی تھی ایسے میں وہ بھی خود پہ قابو نہ رکھ سکی اور جو منہ میں آیا بول کر فون بند کر دیا۔

تبریز مسلسل کال بیک کر رہا تھا لیکن وہ کال ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ روی نے اپنا سیل فون آف کر دیا تھا تا کہ تبریز اُسے فون ہی نہ کر سکے اور فون آف کر کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کس قدر بے بس تھی وہ کہ رونے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ چاہتی تو اُسکے ماں باپ سے چھین لیتی اُسے... جو چاہتی تبریز سے کروا لیتی۔ لیکن وہ ایسی فطرت کی لڑکی نہیں تھی کہ کسی سے اُسکی اولاد کو چھین لیتی۔ جو کام وہ خود بھی نہیں کر سکتی تھی وہ تبریز سے کیسے کروا لیتی۔ روی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اُسکے والدین اپنی بیٹی کی چاہت کو ترجیح دے کر اُسکی شادی کر کے اُسے اپنے پاس رکھ لیتے یا تبریز اُسے الگ گھر لے دیتا جہاں دونوں اپنی مرضی کی زندگی جیتے... لیکن روی کی حساس فطرت اُسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ وہ کسی کی آہ لیکر اپنی زندگی شروع نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اُسے رہ رہ کر تبریز کی بچپن کی منگیتر کا خیال آتا تھا پھر اُسکے والدین کے بارے میں سوچتی تھی کہ جب وہ اُنہیں چھوڑ آئیگا تو اُن پہ کیا گزرے گی... اُنکے دل سے بددعائیں نکلیں گی، اُسکی ماں آہوں اور سسکیوں سے اُسے بے بسی سے جاتا دیکھتی رہے گی... ایسی بہت سی سوچیں اُسکے ذہن کو ماؤف کیے دے رہی تھیں۔ وہ تبریز کو چھوڑ کر بھی دکھی تھی اور پا کر بھی دکھی... ایسے میں یہی بہتر تھا کہ وہ اُسے چھوڑ دے تا کہ کسی کی آہیں اور سسکیاں اُسکا پیچھا نہ کرتی رہیں... وہ کچھ بھی کر سکتی تھی لیکن اتنی خود غرض نہیں ہو سکتی تھی کہ کسی کے والدین سے اُنکی اولاد کو دور کر دے۔ روی کے لئے آگے سمندر اور پیچھے آگ والی بات تھی۔ وہ خود کو ایک گہری کھائی میں گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ کافی دن سے اُس نے تبریز سے ہر رابطہ منقطع کر رکھا تھا کیونکہ وہ اُسے چھوڑنے کا ارادہ کر چکی تھی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ اب نہ وہ خود یہ اذیت سہے گی اور نہ ہی تبریز کو دو حصوں میں بانٹیں گی۔

شام کا وقت تھا جب روی اپنے والدین کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی کہ ڈور بیل بجی تھی۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے بتایا کہ محمود صاحب آئے ہیں اور ملنا چاہتے ہیں۔ روی کے ابو نے اُنہیں ڈرائنگ روم میں بٹھانے کو کہا اور خود چائے ختم کر کے اُن سے ملنے

ڈرائنگ روم میں آ گئے جہاں وہ اُنکا انتظار کر رہے تھے۔ روبی کو لگا شاید تبریز کے بابا کا دل نرم ہو گیا ہے اور وہ رشتے کی بات کرنے آئے ہیں اسلئے وہ ڈرائنگ روم کے باہر کھڑی ساری باتیں سن رہی تھی اور اُنکی باتوں سے اُسے پتہ چلا کہ یہ اُسکی خام خیالی ہی تھی... پتھر پہ بھی گلاب نہیں کھلتا۔ ''میرا بیٹا آپکی بیٹی کی وجہ سے باغی ہوا ہے۔ وہی اُسے ہمارے خلاف چلنے پہ اُکسا رہی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آپ اُسے سمجھائیں کہ ہمارے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دے۔'' تبریز کے والد نے روبی کے ابا سے شکایتاً کہا تھا جسے سن کر روبی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''دیکھئے محمود صاحب... آپ میرے گھر میں بیٹھ کر میری بیٹی کے کردار پہ اُنگلی نہیں اُٹھا سکتے۔ اسلئے تمیز کے دائرے میں رہ کر بات کیجئے۔'' روبی کے ابا کو بھی اُنکی بات بے حد ناگوار گزری تھی۔ ''میں تو صرف اتنا کہنا آیا ہوں کہ آپ کے اور ہمارے درمیان رشتہ جڑنا ناممکن ہے کیونکہ میں تبریز کے لئے اپنی بہن کو زبان دے چکا ہوں اور ہمارے ہاں خاندان سے باہر رشتے نہیں جوڑے جاتے... اسلئے آپ اپنی بیٹی کو سمجھائیے کہ وہ میرے بیٹے سے کوئی تعلق نہ رکھے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' تبریز کے والد اب دھمکیاں دینے پہ آ گئے تھے۔

رمیشہ جو باہر کھڑی یہ سب سن رہی تھی برداشت نہ کر سکی اور ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اندر آ گئی۔ ''یہ بات آپ جا کر اپنے بیٹے کو سمجھائیے کیونکہ وہ مجھ سے شادی کرنے کا خواہشمند ہے میں نہیں... اور رہی خاندان کی بات تو آپ جا کر اپنے بیٹے کو بتائیے کہ اُسکے خاندان میں رشتے باہر نہیں کیے جاتے ہمیں کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے سمجھے آپ...'' روبی نے تڑختے ہوئے اُنکو کھری کھری سنا دیں۔ ''روبی تم باہر جاؤ میں بات کر رہا ہوں۔'' روبی کے بابا نے اُسے تنبیہ کی تھی لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ ''میں آپکے بیٹے کے پیچھے نہیں پڑی وہ مجھ سے شادی کرنے کے لئے مرا جا رہا ہے۔ اسلئے بہتر ہوگا کہ آپ اپنے گھر میں جا کر یہ خاندانیت اور شرافت کا سبق پڑھائیے اُسکی وہاں زیادہ ضرورت ہے۔ اب آپ جا سکتے ہیں اور آئندہ یہاں آنے کی زحمت نہ کیجئے گا... خدا حافظ۔'' روبی اپنی اور اپنے والدین کی بے عزتی برداشت نہ کر سکی اور محمود صاحب کو کھری سنا کر چلتا کر دیا۔ محمود صاحب اُسکی باتیں سن کر غصے میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے چلے گئے۔ روبی کے ابا بہت غصے میں تھے کیونکہ تبریز کے والد اُنکی بے عزتی کر کے گئے تھے اور اُنکی بیٹی کی کردار کشی کرنے میں بھی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

''بابا... میں سچ کہہ رہی ہوں میرا یقین کریں میرا تبریز سے کوئی تعلق نہیں ہے اب۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اُسکے والد کی یوں انسلٹ کر کے انہیں گھر سے نہ نکالتی۔'' روبی نے روتے ہوئے ابا کو منانے کی کوشش کی تھی۔ ''آج تم نے مجھے ایک گھٹیا شخص کے سامنے شرمندہ کروا دیا روبی... مجھے افسوس ہے کہ میں تمہاری اچھی تربیت نہ کر سکا۔'' روبی کے ابا نہایت دل گرفتہ تھے۔ ''نہیں بابا پلیز ایسا مت کہیں ورنہ میں مر جاؤں گی۔ بابا آپ جیسا کہیں گے میں ویسا ہی کرونگی آپ جس سے کہیں گے میں شادی کر لوں گی۔ میں نے تو پہلے ہی تبریز کو چھوڑ دیا تھا... مجھے نہیں پتہ کہ وہ کیوں آئے ہیں... پلیز بابا مجھے معاف کر دیں میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔'' روبی ابا کے آگے زار و قطار روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''روبی کے بابا... یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس نے کچھ غلط نہیں کیا اور وہ اپنے بیٹے کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہاں آئے تھے اس میں ہماری بیٹی کا کیا قصور؟ اس نے تو وہی کیا جو اچھی بیٹیاں کیا کرتی ہیں...'' روبی کی امی نے شوہر کو سمجھاتے ہوئے بیٹی کی

حمایت کی تو روی کے بابا نے اُسے قدموں سے اُٹھا کر گلے سے لگا لیا اور رو دیئے۔ ''بابا مجھے معاف کر دیں... مجھے پتہ ہوتا کہ یہ لوگ ایسے ہیں تو میں کبھی تبریز سے شادی کرنے کا نہ سوچتی.. اب آپ جس سے کہیں گے میں شادی کر لوں گی... بس آپ مجھے معاف کر دیں۔'' روی نے روتے ہوئے کہا تو بابا نے اُسکا ماتھا چوم لیا، وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور اُسکی خوشی سے بڑھ کر اُنکے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہی اُنکی متاعِ حیات تھی اور وہ اُسکی خوشیوں کے لئے سب کچھ کر سکتے تھے لیکن روی بھی اپنے والدین کو کسی کے ہاتھوں بھی ذلیل ہونے نہیں دے گی چاہے وہ خود گھٹ گھٹ کر کیوں نہ مر جائے۔

☆......☆......☆

تبریز کے والد کے اس طرح روی کے گھر آنے پہ اُن دونوں کے بیچ دوریاں مزید بڑھ گئیں۔ رومیسہ نے تبریز کو سب باتیں بتا دیں اور اُس سے ہر تعلق ختم کر دیا۔ تبریز جو پہلے ہی اپنی محبت کی کشتی کو بھنور سے نکال کر کنارے لگانے کی تگ و دو میں لگا تھا اپنے باپ کی اس حرکت پہ سر پیٹ کر رہ گیا۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی باپ اپنے بیٹے سے یوں بھی دشمنی نبھا سکتا ہے..؟ آخر وہ کیوں اُسے ایک زبردستی کے بندھن میں باندھنے پہ تلے ہیں... وہ غصے سے آگ بگولا ہو رہا تھا اُسکی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کرے تو کیا اور کہے تو کیا؟

''بابا آپ کو کیا حق پہنچتا ہے کہ آپ کسی کو اس طرح ذلیل کرنے چل پڑے..؟'' تبریز آخر باپ کو دیکھ کر پھٹ پڑا تھا۔ ''اب تو مجھے بتانا پڑے گا کہ مجھے کس بات کا حق ہے اور کس بات کا نہیں؟'' محمود صاحب نے تڑخ کر کہا تھا۔ ''آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا بابا... آپکو کیا لگتا ہے آپ اس طرح مجھے زبردستی قائل کر لیں گے؟'' تبریز کی آنکھیں دکھ اور ملال سے سرخ ہوئے جا رہی تھیں۔ بلقیس بیگم خوفزدہ سی باپ اور بیٹے کو لڑتا دیکھ رہی تھیں اور وہ کر بھی کیا سکتی تھیں..؟ ''میں تیرا باپ ہوں اور تیرا اچھا برا میں تجھ سے بہتر سمجھتا ہوں ۔ اور تجھے وہیں شادی کرنی ہوگی جہاں میں چاہوں گا... آئی سمجھ؟'' محمود صاحب اپنی دھن کے پکے تھے لیکن تبریز بھی اُنہی کا بیٹا تھا۔ ''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی چالیں چل کر آپ مجھے اپنی بات ماننے پہ مجبور کر سکتے تو یہ آپکی بھول ہے...'' تبریز نے اٹل لہجے میں کہا تو محمود صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور ایک زوردار تھپڑ تبریز کی چہرے پہ دے مارا۔ ''بدتمیز... اپنے باپ سے بات کرنے کی تمیز بھی بھول گیا تو نا ہنجار۔'' تبریز کی آنکھوں سے آنسو نکل کر اُسکے چہرے کو بھگو گئے۔

شور سن کر شاریز اور رضا بھائی بھی اپنے کمرے سے باہر آ گئے۔ ''بابا جان کیا ہوا ہے؟ آپ اتنے غصے میں کیوں ہیں..؟'' رضا جو تبریز سے بڑا تھا باپ کو پھنکارتے دیکھ کر پوچھا تھا۔ ''پوچھو اپنے اس نا ہنجار بھائی سے... ایک دو ٹکے کی چھوکری کے لئے اپنے باپ سے زبان درازی کر رہا ہے۔ پوچھو اسکو...'' محمود صاحب نے کینہ توز نظروں سے تبریز کو دیکھا جو اپنی محبت کی اس قدر توہین پہ تلملا رہا تھا۔ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے تبریز...؟'' رضا نے تبریز کو پوچھا۔ ''مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟ پوچھو اپنے باپ سے جو اس وقت معصوم بن رہے ہیں اور رومیسہ کے گھر جا کر کیسی گھٹیا حرکت کر کے آئے ہیں..'' تبریز نے تڑختے ہوئے کہا۔ ''تمیز کے دائرے میں رہو تبریز۔'' رضا نے اُسے ڈانٹ پلائی۔ ''بابا جان... یہ کیا کہہ رہا ہے؟ کیا آپ واقعی اُنکے گھر گئے تھے؟'' اب رضا باپ سے مخاطب تھا۔ ''ہاں گیا تھا۔ تا کہ اُس لڑکی

سے اسکا پیچھا چھڑا سکوں..." محمود صاحب نے آخر سچ اُگل ہی دیا۔" آپکو کیا ضرورت تھی ان لوگوں کے گھر جانے کی؟ آپ سے اپنا بیٹا نہیں سمجھایا جا رہا تو دوسروں کو کیا سمجھائیں گے؟ پہلے اس کو تو سمجھا لیں آپ..." رضا نے ناگواری سے کہا۔" ہونہہ۔ سہی کہہ رہے ہو۔ اپنا سکہ ہی کھوٹا ہو تو کسی سے کیا گلہ کرنا..؟" محمود صاحب کو آخر ندامت ہوئی تھی۔" جی ہاں۔ یہی کہتا آرہا ہوں میں کب سے آپ کو کہ یہ تبریز ہے رضا نہیں جس پر آپکی مرضی چلے گی...اسلئے کہتا ہوں جانے دیں اسے جہاں جانا چاہتا ہے۔" رضا نے اپنے دل میں چھپا ہوا زہر آخر اُگلنا شروع کر ہی دیا۔ تبریز اُسکی طرف دیکھتا ہی رہ گیا کہ آج اسکا بھائی کس لہجے میں بول رہا ہے۔" میں نے آپکو کہا تھا بابا جان مت کسی کو زبان دیں..مت کسی کی بیٹی کو اسکے نام منسوب کریں یہ آپکو کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑے گا۔" رضا نے بھرپور بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ تبریز کے دل کو شدید ٹھیس پہنچی تھی کہ اُسکا بھائی اُسکے خلاف اس طرح باپ کو بھڑکاتا رہا تھا اور تبریز کو بھی خبر ہی نہ ہوئی تھی۔" اچھا تو یہ آپ تھے رضا بھائی جو ابو کو میرے خلاف پٹیاں پڑھاتے رہے تھے...میں بھی کہوں کہ آخر ابو کے دل میں میرے لئے ایسی تلخی آئی کہاں سے..." تبریز نے آخر بول ہی دیا۔" اپنے کرتوتوں کے نتیجے مجھ پر ڈالنے کی کوشش نہ کرو تم..." رضا نے بھرپور تردید کی تھی۔" کیا کیا ہے میں نے؟ صرف اپنی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہوں ناں...میرا مذہب میرا قانون مجھے اس بات کی اجازت دیتا ہے تو پھر آپ سب کیوں میری خوشیوں کے دشمن ہو گئے ہیں؟ کیوں میرے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کر رہے ہیں آپ سب...کیوں؟" تبریز نے نم آنکھوں سے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔" دشمن ہم نہیں ہوئے تو ہو گیا ہے ہماری عزت کا...خاندان میں بدنام کرنا چاہتا ہے ہمیں... ہر کوئی مجھ پر تھوکے گا اگر میں اپنی زبان سے پھر گیا تو..." محمود صاحب نے کہا تھا۔" آپ لوگ سمجھتے کیوں نہیں ہیں..؟ میں کیسے اُس لڑکی کو خوش رکھ سکوں گا جس سے میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتا..." تبریز نے دھیمے لہجے میں سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

" یہ سب ڈائیلاگ شادی سے پہلے ہی اچھے لگتے ہیں بعد میں سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں چاہے پسند ہو نہ ہو۔ ہم سب کی شادیاں بھی تو ابو جی کی مرضی سے ہوئیں ہیں ہم بھی تو گزارہ کر رہے ہیں کہ نہیں؟" رضا نے فوراً دلیل پیش کی تھی۔" ہر کوئی آپ جیسا نہیں ہو سکتا۔ میں نہیں سوچ سکتا کسی کو نہ دیکھ سکتا ہوں روبی کے علاوہ کسی کو اپنی بیوی کے روپ میں...دوسری لڑکی سے آپ زبردستی شادی کر دا بھی دیں تو بعد میں وہ سر پکڑ کر روئے گی آپ سب کو تو سکی رہیں گے آپ؟ تب عزت رہ جائے گی خاندان میں جب وہ میرے ساتھ ناخوش ہو گی...بتائیں؟" تبریز نے بھی معقول دلیل پیش کی لیکن اُسکی کوئی بھی دلیل کارگر ثابت نہیں ہوئی۔" بس تبریز... بہت بحث ہو گئی۔ جو میں نے کہہ دیا ہے وہی ہو گا اور اگر تمہیں اس فیصلے سے انکار ہے تو نکل جاؤ میرے گھر سے..." محمود صاحب اپنی برداشت کی تمام حدیں پار ہونے پہ بیٹے سے دو ٹوک الفاظ میں کہا اور گھر سے باہر نکل گئے۔ رضا بھی کینہ توز نظروں سے دیکھتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور بلقیس بیگم بیٹے سے جا لپٹی۔" بس کر دے تبریز...تو ہی ضد چھوڑ دے بیٹا۔ ویسے بھی اب روبی کے والدین اتنی بے عزتی کے بعد یہاں رشتہ نہیں کریں گے۔ میری بات مان اور بھول جا اُسے..." بلقیس بیگم نے روتے ہوئے بیٹے سے کہا تھا۔ تبریز کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔" ماں خدا کی قسم اگر میرے بس میں ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا...روبی نے بھی مجھے یہی کہا ہے.....لیکن میں کیا کروں میرا خود پہ بس ہی

نہیں چلتا۔ میں جہاں دیکھتا ہوں مجھے روبی ہی نظر آتی ہے۔ اُسکے سوا میری زندگی میں کچھ بھی نہیں ہے۔ میں اُسے نہیں بھول سکتا۔" تبریز بلک بلک کر رو دیا۔ اُسے بلکتا دیکھ کر بلقیس بیگم کا کلیجہ پھٹنے لگا تھا۔ وہ اُسے دلاسہ دیتے دیتے خود سینے میں شدید درد اُٹھنے سے بے ہوش ہو گئیں۔ تبریز نے ماں کو بازوؤں میں اُٹھا کر گاڑی میں ڈالا اور رضا تیز تیز گاڑی دوڑاتا ہوا ہسپتال لے آیا۔ بلقیس بیگم کو ایمرجنسی میں داخل کیا گیا اور کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ "اگر میری ماں کو کچھ ہوا تبریز تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" رضا نے انگارہ آنکھوں سے تبریز کو گھورتے ہوئے کہا تھا۔ "بھائی وہ میری بھی ماں ہیں۔ ایسا مت کہیں خدا کے لئے۔" تبریز نے روتے ہوئے کہا تھا۔ "کچھ تو خیال کریں رضا بھائی ہم سب ہسپتال میں ہیں۔ اس وقت امی کے لئے دعا کرنی چاہیے نہ کہ آپس میں جھگڑا۔" صبا نے دونوں بھائیوں کو سمجھایا تو رضا نے گھورتے ہوئے پہلو بدل لیا۔ محمود صاحب تو پہلے ہی منہ موڑے بیٹھے تھے سب سے۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹر آئی سی۔ یو سے باہر آیا تھا اور سب بے تابی سے لپکے تھے۔ "ڈاکٹر صاحب۔ میری امی کیسی ہیں؟" تبریز نے جلدی سے سوال کیا۔ "آپکی والدہ اب خطرے سے باہر ہیں۔۔۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں اب it waa a minor attack" ڈاکٹر نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا تھا۔ "کیسا اٹیک ڈاکٹر؟" صبا نے پوچھا تھا۔ "آپکی والدہ کو مائنر ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ویسے تو اب وہ خطرے کی بات نہیں لیکن آئیندہ کے لئے بہت احتیاط برتنی ہوگی۔" ڈاکٹر نے بتایا۔ "کیا ہم اُن سے مل سکتے ہیں؟" رضا نے پوچھا۔ "ابھی نہیں۔۔۔ ایک رات انڈر آبزرویشن رکھا جائے گا اُسکے بعد روم میں شفٹ کرینگے تو پھر آپ لوگ مل سکیں گے۔" ڈاکٹر نے کہا اور چلا گیا۔ صبا اور تبریز شکر ادا کرنے لگے کہ اب اُنکی ماں خطرے سے باہر ہے۔ "سن لیا ناں تم نے۔۔؟ اب اگر امی کو کچھ ہوا تو اسکی ذمہ داری تم پہ ہوگی۔" رضا نے تبریز کو تنبیہ کی تھی۔ "بس بھی کردیں رضا بھائی۔ کیا ہو گیا ہے آپکو؟" صبا نے بھائی کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔ "امی کی ان حرکتوں کی پریشانی سے امی اس حال کو پہنچیں ہیں۔ اس سے کہو کہ یہ باز آجائے ورنہ۔" رضا دانت پیستے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "اچھا بس کریں بھائی۔ میں سمجھا دونگی۔" صبا نے کہا تھا۔

☆......☆......☆

ایک ہفتہ ہسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد بلقیس بیگم گھر لوٹ آئیں تھیں۔ تبریز بھی اب بہت خاموش رہنے لگا تھا یوں جیسے سمندر کی سطح پُر سکون ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک طوفان چھپائے ہوئے ہو۔ اب اُس نے ہر کسی سے کنارا کر لیا تھا اور اب کسی سے بھی اپنی خوشیوں کی بھیک مانگنا چھوڑ دی تھی، یہاں تک کہ بلقیس بیگم اور صبا کو بھی اب دل کی کوئی بات نہیں بتاتا تھا۔ لیکن ماں اپنی اولاد کے چہرے سے اُسکا غم اچھی طرح جان سکتی ہے اسلئے بلقیس بیگم بھی اپنے خاموش بیٹے کے چہرے سے عیاں ہونے والے دُکھ کو اچھی طرح جانتی تھیں۔ ایک کرب اور تکلیف کا احساس تبریز کی آنکھوں سے جھلکتا تھا۔ وہ بظاہر خاموش تھا لیکن اُسکے اندر جدائی کے طوفان نے جو تباہی مچار کھی تھی یہ صرف وہی جانتا تھا۔ وقت اپنی رفتار سے چلتا رہتا ہے کبھی نہیں رکتا۔ روبیہ نے تبریز سے تمام رابطے ختم کر دیئے تھے اور تبریز کا ہر راستہ جو اُسکی طرف آتا تھا اُس نے بند کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال ہونے والا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے تبریز پہ جدائی

کی کئی صدیاں بیت گئیں ہوں۔ محمود صاحب سے بھی اب رسمی سلام دعا کے سوا کوئی بات نہیں ہوتی تھی اور شادی کے بارے میں تو تبریز کوئی بات سنتا ہی نہیں تھا۔ اُسکا زیادہ تر وقت آفس کے کاموں میں باہر گزرتا تھا یا پھر دوستوں کے ساتھ۔ گھر میں کبھی کبھار ہی نظر آتا تھا۔ اور جب بھی نظر آتا تھا چلتی پھرتی لاش کی مانند لگتا تھا جس سے اُسکی روح نکال کر بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا گیا ہو۔ آنکھیں ایسی ویران کہ جیسے بینائی بھی چھین لی گئی ہو۔ سگریٹ کے دھوئیں سے اٹا ہوا بے رونق چہرہ اور شراب کی بدبو سے بھری گاڑی کو وہ گھر والوں سے چھپاتا پھرتا تھا اگر گھر آ جاتا تھا تو۔

"ابا جان... تبریز کی گاڑی سے یہ ملا ہے مجھے..." رضا نے ایک شیشے کا گلاس محمود صاحب کے سامنے کرتے ہوئے بتایا تھا۔ "یہ کیا ہے؟" محمود صاحب نے نہ سمجھنے والے انداز میں پوچھا تھا۔ "یہ گلاس اور یہ شراب کی بوتل..." رضا نے کہا تو محمود صاحب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ "اچھا... تو نوبت یہاں تک آ گئی ہے۔ اس لڑکے نے مجھے کہیں منہ دکھانے لائق نہیں چھوڑا... کوئی اپنی بیٹی نہیں دے گا اس بد بخت کو۔" محمود صاحب پیچ وتاب کھا کر رہ گئے اور ایک کرب سا اُنکے دل پہ چھانے لگا۔ "جہاں سے لائے ہو وہیں چھوڑ آؤ اسے۔ اور اپنی ماں کو مت دکھانا اُسکے لاڈلے کی کرتوت ورنہ جیتے جی مر جائے گی۔" محمود صاحب نے رضا کو ہدایت کی تھی۔ "ٹھیک ہے ابا جان... لیکن اب ہم تبریز کو کیسے سمجھائیں کہ وہ سدھر جائے...؟" رضا نے باپ سے پوچھا۔ "بات کر کے دیکھ لینا ورنہ مجھے تو کوئی اُمید نظر نہیں آتی..." محمود صاحب نے مایوسی سے کہا۔ اور ایک درد سا اپنے دل میں اُٹھتا محسوس کیا۔ جوان اولاد خود کو روگ لگا کر سیدھے راستے سے بھٹک جائے اس سے بڑھ کر والدین کے لئے اور کیا سزا ہو گی... محمود صاحب نے سوچا تھا۔ پیار سے، مار سے، سختی سے ہر طرح سے اُسے سمجھا کر دیکھ چکے تھے لیکن تبریز تھا کہ اپنی ضد سے ہٹتا ہی نہ تھا۔ وہ جسے چاہتا تھا اُسے تو حاصل نہ کر سکا تھا لیکن جو اُسکے گھر والے چاہتے تھے وہ وہ بھی نہیں بن پا رہا تھا۔ اُسکی حالت بیچ منجدھار میں پھنسی ہوئی کشتی کی سی تھی جو نہ ساحل تک پہنچ پا رہی تھی نہ غرقاب ہو رہی تھی۔

تبریز آفس میں فون کالز پہ مصروف تھا جب رضا بھائی اُسکے روم میں آئے تھے۔ فون سے فارغ ہو کر اب وہ بھائی کے سامنے ہمہ تن گوش تھا۔ "جی بھائی... کہیے کیا بات ہے؟" تبریز نے رضا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "تبریز ہمارے ماں باپ اب بوڑھے ہو چکے ہیں... اُنہیں ہماری بہت ضرورت ہے۔ اُنکی بوڑھی ہڈیوں میں اب ہماری پریشانیاں سہنے کی طاقت نہیں ہے۔" رضا نے تمہید باندھی تھی تا کہ اُسے اچھے طریقے سے سمجھا سکے۔ "آپ کھل کر بات کریں ناں بھائی... کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ کیسی پریشانی؟" تبریز نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا۔ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے جو اپنا حال بنا رکھا ہے اُسے ٹھیک کر لو۔ شراب اور سگریٹ نوشی سے تمہیں کیا مل جائے گا؟ کیوں اپنی دنیا اور آخرت بھی تباہ کرنے پہ تُلے ہوئے ہو؟ کبھی سوچا ہے والدین پہ تمہاری ایسی حالت دیکھ کر کیا گزرتی ہو گی؟" رضا نے جذباتی انداز میں ساری بات کہہ ڈالی تھی۔ "کبھی آپ لوگوں نے سوچا ہے کہ مجھ پہ کیا گزرتی ہے...؟ کبھی سوچا ہے میرے اس حال کے ذمہ دار کون لوگ ہیں...؟ کس نے میری زندگی میری دنیا تباہ کر ڈالی کبھی سوچا ہے بھائی آپ نے...؟" تبریز کی آنکھوں میں کرب کی نمی تیر گئی اور ایک تلخ مسکراہٹ چہرے پہ لئے وہ رضا کی آنکھوں میں اپنے سوالوں کے جواب کا منتظر تھا۔ تبریز کے سوالوں اور

نظروں نے رضا کو گڑبڑا دیا۔ "گزری ہوئی باتیں بھول جاؤ تبریز اور زندگی میں آگے بڑھو۔ میں جانتا ہوں تم اپنی جگہ ٹھیک ہو لیکن ہم اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتے۔ اگر رومیسہ تمہارے نصیب میں ہوتی تو یہ سب ہوتا ہی کیوں؟" رضا نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "گزری ہوئی باتیں ہی تو نہیں بھول سکتا کیونکہ ہر روز مجھ پہ جو گزرتی ہے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ زندگی میں آگے کیسے بڑھوں...؟ میرا ماضی مجھے خود سے باہر آنے نہیں دیتا۔ میری روح تو کب کی فنا ہو گئی ہے بھائی... اب تو بس اپنے وجود کا لاشہ کاندھے پہ اُٹھائے پھرتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے بس میں کچھ نہیں۔" تبریز کے چہرے پہ کرب کے ہزاروں رنگ بکھر چکے تھے اور شکوہ کناں نظریں... جنہیں دیکھ کر رضا کا دل کٹ کر رہ گیا۔ "میرے بھائی... تو ایک موقعہ تو دے۔ دیکھنا تیری زندگی کو خوشیوں سے بھر دونگا۔ اس طرح ہمیں سزا نہ دے... ہم سب تجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بھول جاؤ سب کچھ اور ایک نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو۔" رضا نے اُمید بھرے لہجے میں کہا تو تبریز کے ہونٹوں پہ ایک تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ "کاش آپ نے مجھے میری زندگی جینے کا ایک موقعہ دیا ہوتا تو آج ایسا نہ ہوتا۔ میری زندگی کو سزا بنانے والوں کو اب کچھ تو سزا ملنی ہی چاہیے، چاہے وہ سزا میں خود ہی کیوں نہ بن جاؤں۔" تبریز نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس سے زیادہ وہ اپنے آنسوؤں پہ قابو نہیں پا سکتا تھا۔ رضا حیرت کا بت بنا اُسے جاتا دیکھتا رہا۔ آج پہلی بار رضا کو شدید احساس ہوا تھا کہ اُن سب نے مل کر تبریز کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ کیا ہو جاتا اگر وہ اُسکی پسند سے اُسے شادی کر لینے دیتے... کیا ہو جاتا اگر اُسکے بڑے اُسے اپنی طرح خاندان پہ قربان ہونے والا بکرا نہ بننے دیتے... تبریز کو کھو دینے کے ڈر سے اُسکی شادی پرائے لوگوں میں نہیں کی تھی لیکن کیا اس طرح نے تبریز اُنکا رہ گیا...؟ نا جانے کتنے سوال تھے جو دل و دماغ کو چوٹ پہنچا رہے تھے اور ایک شدید پچھتاوا تھا جو رضا کو محسوس ہونے لگا تھا۔ "کاش کہ ہم اُسکی بات مان لیتے..." رضا نے آہ بھر کر سوچا تھا۔ تبریز آفس سے باہر نکل کر سڑک کنارے کھڑا تھا اور آنسو اُسکی آنکھوں سے رواں تھے۔ وہ شکوہ کناں نظروں سے اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھ رہا تھا۔ "نصیب...." اُسنے سوچا تھا کہ کیا واقعی رومیسہ اُسکے نصیب میں نہیں تھی یا پھر لوگوں نے اُنکے درمیان جدائی کی سیسہ پلائی دیوار قائم کی تھی...؟ لوگ کسی کی خوشیاں اُس سے چھین کر کتنی آسانی سے کہہ دیتے ہیں کہ نصیب میں نہیں تھیں۔ تبریز جتنا سوچتا تھا اُتنا ہی خود کو اذیت سے دوچار کرتا تھا۔ یہ کیسا نصیب تھا جس نے اُسے اس حال میں پہنچا دیا تھا۔ یہ کیسا کمی کا احساس تھا جو اُسے ہر پل کچوکے لگا تا رہتا تھا...؟ یہ کیسی تڑپ تھی جو دل میں ٹیس بن کر اُٹھتی تھی...؟ اسی تڑپ کے ساتھ وہ کیسے زندگی گزارے گا...؟ دل اور دماغ میں اُٹھنے والے طوفان تبریز کی سانسوں میں بھی رکاوٹ پیدا کرنے لگے تھے۔ اُسکا دل چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے چیخے، چلائے اور خدا کو پکارے... اُس سے شکوہ کرے کہ یہ کیسا نصیب ہے...؟ یہ درد اور تڑپ اُسی کے لئے کیوں ہے...؟ کیوں میری پکار کا جواب نہیں دیتا...؟ کیوں میری تکلیف کو رفع نہیں کرتا اگر تو میری شہ رگ سے بھی قریب ہے تو...؟ تبریز سوچ رہا تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ اُسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے لیکن وہ خود پہ اختیار کھو چکا تھا۔

☆......☆......☆

بڑے سے کمرے میں ہر طرف تاریکی کا راج تھا۔گھپ اندھیرے میں کسی کی درد میں ڈوبی ہلکی ہلکی سسکیاں صاف سنائی دے رہیں تھیں۔بے بس اور لاچار آہیں ماحول کو کربناک اور افسردہ کیئے دے رہیں تھیں۔روی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہے جار ہے تھے وہ بس روتی چلی جارہی تھی۔لیکن اُسکا دل جانتا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے... ہاں وہ جانتی تھی کہ اُسکی آنکھوں سے بہنے والا ہر آنسو تبریز کا آنسو ہے...اُسکی آہیں تبریز کی سسکیوں کی وجہ سے ہیں۔لیکن بے بسی کا یہ عالم تھا کہ وہ اُس سے بات بھی نہیں کر سکتی تھی... اُسکو یہ تک نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ خود بھی اُسی کی طرح تڑپ رہی ہے۔وہی تکلیف وہ بھی سہہ رہی ہے۔کبھی کبھی زندگی انسان کو اتنا مجبور و لاچار بنا دیتی ہے کہ انسان مکمل اختیار رکھتے ہوئے بھی خود کو بے بس محسوس کرتا ہے۔یوں جیسے اُسکی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہو اور وہ صرف ایک کٹھ پتلی ہو۔شاید اسی کو مقدر کہتے ہیں۔۔یا پھر خدا کی مرضی کے آگے ہم یوں ہی بے بس ہو جاتے ہیں۔تبریز سے جدائی کا غم روی کے دل میں پلنے والا ایک ناسور بن چکا تھا۔ایک ایسا زخم جو شاید کبھی بھی نہیں بھرے گا اور اسی تکلیف کے ساتھ اُسے اپنی باقی زندگی گزارنی تھی۔روی کے والدین نے اُسکا رشتہ اپنی پسند کے گھرانے میں اپنی مرضی سے طے کر دیا تھا اور اُس نے بھی اپنی خوشیوں کو ماں باپ کی رضا کے سامنے قربان کر دیا تھا۔وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی اور کبھی انہیں دکھ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔روی نے وہی کیا تھا جو عام طور پہ سب مشرقی لڑکیاں کیا کرتی ہیں۔

اشعر کے ساتھ رومیسہ کی نسبت طے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو چکا تھا۔اور بہت جلد شادی بھی ہونے والی تھی۔اس دوران روی کی اشعر سے ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی نسبت طے ہونے کے وقت۔اشعر بے شک روی کے والدین کا بہترین انتخاب تھا۔روی کو کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں تھا۔اُس نے سب کچھ اپنی تقدیر کا لکھا سمجھ کر سر جھکا دیا تھا۔جب بھی تبریز کی یاد آتی تھی تو وہ رو رو کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی اور دعا کرتی تھی کہ تبریز اُسے بھول جائے تا کہ روی کے دل کو بھی سکون آجائے۔لیکن زندگی کب ہماری سوچوں کے مطابق چلا کرتی ہے...؟ تقدیر ہمارے بس میں کب ہے؟ کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہو جائے اور کون کس کے مقدر میں ہے یہ فیصلے تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔روی نے بے بسی سے اپنے موبائل کی طرف دیکھا۔اُسکا دل چیخ رہا تھا کہ وہ تبریز کو فون کرے لیکن ضمیر اُسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔وہ بہت دیر سے دل اور دماغ کی اس جنگ میں پس رہی تھی۔تنگ آ کر اس نے اپنا موبائل فون اُٹھا کر زور سے دیوار پہ دے مارا۔موبائل فون کے بہت سے ٹکڑے ادھر اُدھر بکھر گئے اور روی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔تبریز کی کہی ہوئی باتیں اُس کے ذہن میں گھوم رہیں تھیں اور دل اندر ہی اندر بے وفائی کے کچوکے لگا رہا تھا۔''تو یہ تھی تمہاری محبت رومیسہ...'' دل سے آواز آتی تھی۔''لیکن میں ماں باپ کے پیار کو کیسے بھلا دیتی؟ کیسے اُنھیں کسی کے ہاتھوں رسوا ہونے دیتی...؟'' ذہن سوال کرتا تھا۔دل و دماغ کی اس گھمسان جنگ نے روی کے ٹکڑے کر دیئے تھے۔وہ خود کو بے حد بکھرا ہوا محسوس کرتی تھی۔وہ بظاہر تو خوش اور نارمل نظر آتی تھی لیکن اُسکے دل پہ ایک بھاری بوجھ پڑا ہوا تھا جسے وہ چاہ کر بھی ہٹا نہیں پا رہی تھی۔

شام کا وقت تھا جب امی نے روی کو بلایا تھا۔''جی امی... آپ نے بلایا تھا مجھے؟'' روی نے ماں کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

ہاں بیٹا... تمہیں ایک ضروری بات بتانی تھی۔" امی کے الفاظ پہ روی کا دل زور سے دھڑکا تھا کہ آخر کونسی ضروری بات ہے جو بتانی ہے۔" جی کہیں.. میں سن رہی ہوں۔" رومیسہ نے کہا۔" کل شام اشعر اور اُسکی فیملی ہمارے یہاں ڈنر پہ آ رہے ہیں... تا کہ تمہارے نکاح کی تاریخ رکھی جا سکے۔" ماں نے کہا تو روی کو لگا جیسے کسی نے دل پہ ٹھوکر لگائی ہو۔ تبریز کا چہرہ روی کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا تھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی روی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔" جیسے آپ لوگوں کی خوشی..." بمشکل روی نے کہا اور اُٹھ کر جانے لگی تھی کہ امی نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔" ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ بیٹھ جاؤ۔" روی نے بہت مشکل خود پہ قابو پایا اور بیٹھ گئی۔" میری بچی.. میں جانتی ہوں کہ اس وقت تم خوش نہیں ہو... لیکن تم دیکھنا اشعر کے ساتھ تمہاری زندگی بے حد خوشگوار گزرے گی اور تم ساری پرانی باتیں بھول جاؤ گی۔" روی نے ماں کو حیرت بھری نظروں سے دیکھا تھا جیسے اُنکے لفظوں پہ یقین کرنے کے لئے تصدیق چاہ رہی تھی۔" ہاں میری لاڈلی.. دیکھنا اشعر تمہیں بہت خوش رکھے گا۔ بس اب تم سب کچھ بھلا دو اور اشعر کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز خوشی خوشی کرو۔" روی ماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔" مجھے آپ کے ہر فیصلے پہ اعتماد ہے امی جان۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہیں... آپ نے جو بھی کیا ہے بالکل درست کیا ہے۔" روی نے روتے ہوئے ماں سے کہا۔" بس پھر اگر ہم پہ اعتماد ہے تو سب پرانی باتیں بھلا دو۔ اور کل اشعر کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنا تا کہ تمہارے اور اُسکے درمیان اجنبیت نہ رہے۔" روی ایک جھٹکے سے ماں سے الگ ہوئی تھی جیسے کوئی ناممکن بات کہہ دی ہو۔" لیکن امی..." روی نے کچھ کہنا چاہا تھا۔" لیکن ویکن کچھ نہیں... یہ ہم بڑوں کا فیصلہ ہے اور اشعر بھی یہی چاہتا ہے کہ تم دونوں آپس میں بات چیت کرو تا کہ انڈرسٹینڈنگ ہو جائے... ویسے بھی شادی سے پہلے کا یہ وقت بہت خوبصورت ہوتا ہے اور اس طرح تمہیں تبریز کو بھلانے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگے گا۔" امی اپنی ہی دھن میں بولے چلے جا رہی تھیں۔ لیکن روی اُنکو کیسے بتاتی کہ یہ سب اتنا آسان نہیں تھا۔" ٹھیک ہے۔ جیسے آپکی مرضی۔" روی نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دی۔ دل و دماغ اُلجھ رہے تھے.. ایک انجانا سا خوف اُسے جکڑے ہوئے تھا۔ پتہ نہیں اشعر کیسی طبیعت کا مالک ہے اور اُسکی سوچ کیسی ہے... معلوم نہیں کہ اُس کے ساتھ میرا مزاج بھی ملے گا یا نہیں۔ یہ سب سوچیں روی کو پریشان کئے دے رہی تھیں۔ انہی سوچوں میں گم نا جانے رات کے کس پہر وہ نیند کی گہری وادیوں میں کھو گئی تھی۔

صبح کے دس بج رہے تھے جب اُسکی آنکھ شور سے کھلی تھی۔ امی اور ابو صبح سے رات کی دعوت کی تیاریوں میں مگن تھے اور گھر میں ایک گہما گہمی کا سماں تھا۔ امی سب نوکروں کی ہدایات دے رہی تھیں۔ کیا پکانا ہے کیا بنانا ہے سب کچھ تفصیل سے سمجھا رہی تھیں۔ روی خود کو کافی بہتر محسوس کر رہی تھی کیونکہ کافی دن بعد وہ اتنی گہری نیند سوئی تھی۔ شام ہوئی تو رومیسہ نے شاور لیا اور اپنی وارڈ روب کھول کر ڈریس منتخب کرنے لگی۔ نا جانے کیوں اُسکی نظر سیاہ رنگ کے لباس پہ جا ٹھہری تھی۔ روی نے سیاہ رنگ کا شفون کا بلکا کامدار جوڑا زیب تن کر لیا اور ہلکے سے میک اپ سے اُسکی شخصیت میں مزید نکھار اور کشش آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی پری زمین پہ اُتر آئی ہے اور ہر طرف اُسکے حسن کا سحر بکھر رہا ہو۔ اشعر اور اُسکی فیملی بھی پہنچ چکے تھے۔ روی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اشعر اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ روی سب

سے مل کر وہیں بیٹھ گئی اور اشعر کی والدہ اور بہن اُس سے باتیں کرنے لگیں۔ لیکن اشعر رومی سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔ رومی کا دل اُسکی نظروں کی تپش محسوس کرتے ہوئے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ کچھ دیر بعد رومی ڈنر کی تیاری دیکھنے کا بہانہ کر کے وہاں سے اُٹھ آئی کیونکہ اُس سے اشعر کی نظریں برداشت نہیں ہو رہی تھیں۔ ڈنر کرتے ہوئے بھی اشعر سے بار بار نظر ٹکرا جاتی تو رومی کا دل زور زور سے دھڑک جاتا تھا۔ اُسکی نظروں میں ایک والہانہ پن اور دیوانگی جھلکتی تھی۔ رومی دل ہی دل میں شرما جاتی تھی۔ ڈنر کے بعد رومی سب کے لیئے چائے اور کافی بنا کر لائی تو امی نے کہا" بیٹا ایسا کرو اشعر کو اپنا لان دکھاؤ جہاں تم نے گارڈننگ کی ہے... اشعر کو بھی پھول پودوں میں بہت دلچسپی ہے۔" رومی ایک دم گڑبڑا گئی۔" امی... ابھی تو چائے پی رہے ہیں۔" اُس نے بہانہ بنایا تھا۔" تو کوئی بات نہیں باہر لان میں ہی لے جاؤ وہیں بیٹھ کر پی لینا.... یہاں بڑوں میں تو بور ہی ہو گے۔" امی نے کہا تو رومی اور اشعر باہر لان میں آ گئے۔ اشعر تو خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔" بیٹھیے پلیز..." رومی نے لان میں رکھی میز اور کرسیوں پہ بیٹھنے کے لیئے کہا۔ دونوں خاموشی سے بیٹھ کر کافی پینے لگے اور ٹھنڈی ہوا ماحول کو مزید رومانوی کر رہی تھی۔ اشعر رومی کو دیکھ رہا تھا لیکن وہ نظریں چرا رہی تھی جیسے شرما رہی ہو۔ آخر اشعر نے ہی بات شروع کی۔" آپ ایسے ہی خاموش رہتی ہیں؟" اشعر کے سوال پہ رومی گڑبڑا سی گئی جیسے ایسا سوال غیر متوقع ہو۔" نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" اُس نے مختصر جواب دینے پہ ہی اکتفا کیا۔" مجھے لگا شاید آپ کم گو ہیں.... ویسے آپکا یہ چھوٹا سا گارڈن بہت خوبصورت ہے۔" اشعر نے کہا تو رومی ہولے سے مسکرا دی۔" بالکل آپکی طرح۔" اشعر نے معنی خیز نگاہوں سے رومی کو دیکھا تو رومی شرما گئی۔" تعریف کے لیئے شکریہ..." رومی نے بمشکل کہا۔" My pleasure."

اشعر کی نگاہوں میں شرارت بھر آئی تھی۔" نکاح کی ڈیٹ پہ آپکو کوئی اعتراض تو نہیں؟" اشعر نے پوچھا۔" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ جو بڑے مناسب سمجھیں۔" رومی نے سنجیدگی سے کہا تھا لیکن اعتراض کے نام پہ اُسکے دل پہ عجیب کیفیت گزری تھی۔" آپ کتنی سوبر اور ڈیسنٹ ہیں۔ میں اپنے آپکو بہت لکی فیل کر رہا ہوں۔" اشعر نے بے تابی سے کہا تو رومی کو ہنسی آ گئی۔" اتنی جلدی رائے قائم کر لی آپ نے میرے بارے میں...؟" رومی نے کہا۔

"تمہیں پتہ ہے رومیسہ... میرے اکثر دوست اپنی بیویوں سے بے زاری کا اظہار کرتے رہتے ہیں صرف اسی لیئے کہ وہ بہت زیادہ بولتی ہیں اور بے حد شوخ مزاج ہیں۔ اسلیئے میں خود کو بہت خوش قسمت محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے تم جیسی حسین سوبر اور ڈیسنٹ بیوی مل رہی ہے۔" اشعر اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا اور اُسے پتہ بھی نہیں چلا کہ اُس نے کب آپ سے تم تک کا سفر بھی طے کر لیا۔ رومی کو اُسکا "تم" کہنا بہت اچھا لگا تھا یوں جیسے دھیرے دھیرے اجنبیت کی سب دیواریں گر رہی ہوں۔" ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ شادی سے پہلے اُنکی بھی رائے ایسی ہو... اور شادی کے بعد آپکی رائے بھی اُن جیسی ہو جائے...؟" رومی نے اپنا نقطہ نظر بیان کیا تو اشعر اُسکی حاضر جوابی اور ذہانت پہ حیران رہ گیا۔" ارے واہ... ایسا تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ آپ تو بہت ذہین ہیں اسکا مطلب...؟" اشعر نے حیرت سے کہا تو رومی ہنس دی۔" میں نے تو ایک جنرل بات کی ہے کہ شادی سے پہلے سب ایسے ہی ہوتے ہیں اور شادی کے بعد تو نہیں یا میں نہیں والا

معاملہ ہوتے اکثر دیکھا ہے۔" روی نے کہا تو اشعر قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔" ماننا پڑے گا آج... میری فیملی نے واقعی بہترین انتخاب کیا ہے میرے لئے... اور جیسی تمہاری نیچر ہے ناں رومیسہ مجھے نہیں لگتا کہ میری رائے کبھی بھی اپنے دوستوں جیسی ہو سکتی ہے۔" اشعر نے امپائر ہوتے ہوئے کہا۔" یہ تو وقت ہی بتائے گا..." روی نے حقیقت پسندی سے کہا۔" کافی دن سے میں آپکا موبائل نمبر ٹرائے کر رہا تھا لیکن مسلسل آف آ رہا ہے... کیا آپ نے نمبر بدل لیا ہے؟" اشعر نے پوچھا تو روی دل ہی دل میں گڑبڑائی لیکن فوراً قابو پا کر بہانہ بنا دیا۔" نہیں نمبر تو نہیں بدلا لیکن میرا موبائل گر کر ٹوٹ گیا ہے اسلئے نمبر بند ہے۔" روی نے جلدی سے کہا۔" اوہ... تو یہ بات تھی۔ میں کل آپکو نیا سیل فون اور اپنی پسند کا نمبر ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دونگا... کوئی اعتراض تو نہیں؟" اشعر نے شرارتی لہجہ اپنا کر کہا۔" نہیں اعتراض کیسا...؟" روی نے کہا تو اشعر اُسکی آنکھوں میں دیکھ کر مسکرا دیا۔ اشعر کی نظروں کا والہانہ پن روی کے دل کو دھڑکا گیا۔" اب اندر چلنا چاہیے... سب ہمارا انتظار کر رہے ہونگے۔" روی نے کہا۔" جی میڈم... ایز یو وش۔" اشعر نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور دونوں اندر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے۔ دونوں کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر روی کے والدین کی آنکھیں خوشی سے جگمگا اٹھی تھیں اور اُنکے دل کے سکون سے روی کے دل کا بوجھ کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

کافی دیر سے رومیسہ کا موبائل فون بج رہا تھا لیکن وہ فون کال اٹینڈ نہیں کر پا رہی تھی۔ کیونکہ وہ پارلر میں تیار ہو رہی تھی۔ کچھ دیر بعد جب تیاری سے فارغ ہو کر اُس نے موبائل فون دیکھا تو اشعر کی بہت سی مسڈ کالز آئیں ہوئیں تھیں۔ رومیسہ نے جلدی سے کال بیک کیا۔" آخر خیال آ ہی گیا میڈم کو ہمارا...؟" اشعر نے کال اٹینڈ کرتے ہی کہا۔" ابھی میں تیار ہو رہی تھی پارلر میں..." روی نے کہا۔" اور ہم جو آپکی آواز سننے کو بے تاب ہیں اُسکا کیا؟" اشعر نے دیوانوں کی طرح کہا تو روی کو ہنسی آ گئی۔" آج ہمارا نکاح ہے۔ اب ایسی بھی کیا بے چینی ہے کچھ ہی دیر میں تو ساتھ ہونگے ہم۔" روی نے جواب دیا۔" یہ کچھ ہی دیر تو کاٹے نہیں کٹ رہی... وقت کی رفتار تھم سی گئی ہو جیسے۔" اشعر نے دکھی لہجے میں کہا۔" بالکل مجنوں معلوم ہو رہے ہیں آپ آج..." روی نے ہنستے ہوئے کہا۔" مجنوں بھی تو تم نے ہی کیا ہے مائی ڈیئر۔" اشعر نے کہا۔" اچھا اب شام کو ملاقات ہوگی۔ ڈرائیور آ گیا ہے مجھے پک کرنے... اوکے... بائے۔" روی نے جلدی سے کہا تو اشعر نے بھی ٹھنڈی آہ بھر کر فون بند کر دیا۔ یہ چند گھنٹے اُس سے کاٹے نہیں کٹ رہے تھے اور روی کو دیکھنے کے لئے اُسکا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام کے سات بجے اشعر اور اُسکے گھر والے روی کے گھر پہنچ چکے تھے۔ نکاح کی تقریب کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ رومیسہ سے ایجاب و قبول اور دیگر کاروائی کے بعد قاضی صاحب اشعر سے ایجاب و قبول کے لئے آئے تھے۔" اشعر رضا میر ولد رضا میر حیدری آپکو بعوض پچاس ہزار روپے حق مہر کے رومیسہ..." "قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے۔" اس سے پہلے کہ قاضی صاحب اپنا جملہ پورا کرتے اشعر نے پہلے ہی بول دیا۔ سب لوگ قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔" دیکھو تو کتنی جلدی ہے دولہے میاں کو..." اشعر کی بھابی نے کہا۔" ارے بھائی کے لئے تو رومیسہ کا نام ہی کافی ہے۔" اس بار اشعر کی بہن نے بولا تو سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ رکی

کاروائی کے بعد سب لوگوں کا منہ میٹھا کروایا گیا۔ "ارے بھئی اب میری بہو کو بھی لے آؤ۔ دیکھو تو میرا بچہ کتنا بے تاب ہو رہا ہے اپنی دلہن کو دیکھنے کے لئے..." اشعر کی والدہ نے اُسکی بے چینی بھانپتے ہوئے روحی کی والدہ سے کہا۔ "جی ضرور... ابھی لاتے ہیں۔" روحی کی والدہ نے کہا اور روحی کے کمرے میں اُسے لینے چلی گئیں جہاں وہ اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ "ماشاءاللہ۔ اللہ میری بچی کو نظرِ بد سے بچائے۔ آمین۔" روحی کی امی نے اُسے دیکھا تو خوشی سے آنکھیں جھلملا گئیں اور دل ہی دل میں دعا کی۔ رومیسہ دلہن بن کر بے حد حسین لگ رہی تھی بالکل کسی پری وش اپسرا کی مانند۔ نظر اُسکے حُسن پہ جیسے ٹھہر تی تھی۔ "چلو لڑکیوں۔ لے کر چلو روحی کو باہر لان میں سب انتظار کر رہے ہیں۔" روحی کی والدہ نے ہدایت دیتے ہوئے کہا تو سب اُٹھ گئیں۔ روحی نے باہر نکلنے سے پہلے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو اُسکی آنکھیں جھلملا گئیں۔ بے اختیار ہی خود کو دیکھ کر تبریز کی یاد آ گئی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل اُس نے خیال جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ روحی کو دیکھ کر اشعر کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور سب اُسے دیکھ کر سراہنے لگے۔ ڈھیروں نظریں اُتاری گئیں جب دونوں ساتھ بیٹھے تو یوں لگا جیسے ایک دوسرے کے لئے ہی بنے تھے۔ "ماشاءاللہ... چاند سورج کی جوڑی لگ رہی ہے۔" اشعر کے ابو نے احمد صاحب سے کہا تھا۔ "بس اللہ انہیں نظرِ بد سے بچائے اور اُنکے نصیب اچھے کرے۔ آمین۔" احمد صاحب نے دعا دی۔ "آج تو آپکا حُسن قیامت ڈھا رہا ہے بیگم صاحبہ..." اشعر نے پہلو میں بیٹھی رومیسہ کو کہا تو وہ شرم سے گلال ہو گئی۔ "کم تو آپ بھی نہیں لگ رہے کسی سے..." کالے رنگ کی ویلوٹ کی شیروانی میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا۔ "ارے ہم پہ تو آپکے حُسن کا لشکارا پڑتا ہے تو ہم بھی اچھے لگنے لگتے ہیں ورنہ کہاں میں کہاں آپ حسن کی دیوی..." اشعر نے شاعرانہ انداز میں کہا۔ "او میرے خدا... زمین و آسمان کے قلابے ملاتا تو کوئی آپ سے سیکھے۔ بہت مبالغہ کرتے ہیں آپ..." روحی نے ہنستے ہوئے کہا تو اشعر بھی ہنسنے لگا۔ "میری پیاری بیگم صاحبہ... آپ کیا ہیں یہ تو کوئی ہم سے پوچھے۔" اشعر نے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "کوئی پوچھ ہی نہ لے..." روحی نے شرارت بھری نگاہوں سے اشعر کو دیکھتے ہوئے کہا تو اشعر کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا۔ "ہائے میں تو گیا کام سے... یہ آنکھیں جان لیوا ہیں۔" اشعر نے شوخ لہجے میں کہا۔ "اللہ نہ کرے... کیسی بری باتیں کر رہے ہیں... اب ایسی بات نہ کرنا پلیز اشعر۔" روحی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "اچھا بابا... سوری۔ غصہ تو نہیں کرو یار... پلیز مسکرا دو۔" اشعر نے معافی مانگی اور کان کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا تو روحی دھیرے سے مسکرا دی۔

☆......☆......☆

ایک مہینے بعد روحی اور اشعر کی شادی کی تقریب بھی بخیر و عافیت انجام پا گئی۔ اشعر، روحی کو پا کر بے حد خوش تھا۔ اُسے جیسی جیون ساتھی کی خواہش تھی روحی بالکل ویسی ہی تھی۔ اشعر کی محبت اور چاہت نے روحی کے دل کے تمام خدشات اور تلخیاں مٹا دی تھیں۔ روحی نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اُسے تبریز سے زیادہ بھی کوئی چاہ سکتا ہے لیکن اشعر کے پیار نے اُسے تمام پچھلی باتیں بھلا دی تھیں۔ رات کے کھانے پہ سب لوگ اکٹھے ہوئے تو اشعر کی بہن نے اُنکے ہنی مون پہ جانے کی بات چھیڑ دی۔ "اشعر بھائی... ایک مہینہ ہو گیا ہے آپکی شادی کو... کیا بوڑھے ہو کر ہنی مون پہ جائیں گے؟" شیلا نے اُسے چھیڑا تو روحی منہ نیچے کر کے ہنسنے لگی۔ "ہنی مون پہ بھی چلے جائیں گے

یار۔" اشعر نے خجالت سے کہا۔ "ہنی مون پہ کب جائیں گے؟" شہلہ نے پوچھا۔ "تم کیوں بھائی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہو...میاں بیوی کا معاملہ ہے تم کیوں بول رہی ہو؟" امی نے اُسے ڈانٹ پلائی تھی۔ "کوئی بات نہیں مما جان... پوچھنے دیں۔" روحی کو اچھا نہیں لگا کہ شہلہ کو ڈانٹ پڑے۔ "ارے بیٹا لاڈ پیار نے اسے پہلے ہی بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ مجال ہے جو کبھی اپنی حد میں رہے۔" امی نے غصے سے شہلہ کو گھورا۔ "کوئی بات نہیں مما۔ یہ تو میری گڑیا ہے چھوٹی سی اسکا حق بنتا ہے پوچھنے کا۔" اشعر نے ماں سے کہا تو شہلہ خوش ہو گئی۔ "ہنی مون پہ بھی جلد ہی جاؤں گا۔ ابھی کچھ بزنس ڈیلز ہیں دو مہینے تک جا سکوں گا۔" اشعر نے تفصیلاً بتایا۔ "اوہ ہو بھائی... روحی بھابھی تو تب تک بور ہو جائیں گی۔" شہلہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "میرے اور تمہارے ہوتے ہوئے روحی بور ہو ہی نہیں سکتی... کیوں بیگم بتاؤ ناں؟" اشعر نے روحی کو پوچھا۔ "جی بالکل بجا فرمایا آپ نے..." روحی نے بہت عاجزی سے کہا۔ "بھائی کہنا پڑے گا بہت لکی ہیں آپ اتنی فرمانبردار بیوی ملی ہے آپکو... ورنہ کوئی میرے جیسی ہوتی تو سارے کام چھڑا کر لے جاتی۔" شہلہ نے کہا تو سب ہنس دیے۔ "یس مائی ڈیئر... آئی ایم ریلی ویری لکی۔" اشعر نے روحی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا تو روحی شرما گئی۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب لوگ اپنے کمروں میں آرام کرنے چلے گئے۔ روحی آئینے کے سامنے کھڑی بالوں کو برش کر رہی تھی کہ اشعر اسکے پیچھے آ کھڑا ہوا اور اُسے دیکھنے لگا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" روحی نے اپنا رخ اشعر کی جانب کرتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کتنا خوش نصیب ہوں میں..." اشعر نے روحی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں بھی کم خوش نصیب تو نہیں ہوں..." روحی نے اشعر کے ماتھے سے بال ہٹاتے ہوئے کہا تو اشعر نے اُسکی کمر کے گرد گھیرا ڈال کر اُسے اپنے قریب کھینچ لیا۔

"تمہیں برا تو نہیں لگ رہا کہ ہنی مون پہ ابھی نہیں لے جا رہا...؟" اشعر نے اُسے وارفتگی سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا جیسے کچھ شرمندہ ہو۔

"اس میں برا لگنے کی کیا بات ہے اشعر؟ میں آپکے ساتھ بہت خوش ہوں یہاں... ہنی مون پہ تو کبھی بھی جا سکتے ہیں۔" روحی نے سمجھداری سے کہا۔

"بس کچھ دنوں کی بات ہے پھر میں اور میری جان ہونگے اور ہنی مون ہوگا..." اشعر نے شرارتاً اُسکے گال پہ چٹکی بھر کر کہا تو روحی ہنستے ہوئے اُس سے لپٹ گئی۔

"ہاہاہا... ایک تو ہماری بیگم صاحبہ شرماتی بہت ہیں۔" اشعر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

"اشعر آپ میری زندگی کا حاصل ہیں... اگر آپ مجھ سے اتنی والہانہ محبت نہ کرتے تو پتہ نہیں میری زندگی کیسی ہوتی..." روحی نے جذبات بھری آواز میں کہا تو اشعر نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے اُسکی آنکھوں میں جھانکا جہاں نمی تیر رہی تھی۔

"اور یہ آپکو کس نے کہا محترمہ کہ ہم آپ سے محبت نہیں کریں گے...؟" اشعر نے کہا تو روحی کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے۔

"ارے..ارے..کیا ہوا جان..؟ کیوں رو رہی ہو..؟ پلیز چپ ہو جاؤ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" اشعر سے اُسکی آنکھوں میں آنسو برداشت نہیں ہو رہے تھے۔

"پتہ نہیں..بس میں اب آپکے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتی اشعر۔ پلیز مجھ سے کبھی ناراض نہ ہونا۔ کبھی مجھے خود سے جدا نہ کرنا.." روی نہ جانے کس خدشے سے خوف زدہ ہو کر یہ سب کہے جا رہی تھی اشعر کے سینے سے لگی وہ ہچکیاں لے رہی تھی اور اشعر کو لگ رہا تھا جیسے آسمان سر پہ آ گرا ہے۔

"جدا ہوں ہمارے دشمن۔ پلیز رونا بند کرو۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا روی...آئی نو یو سو چ...میں خود تمہارے بنا زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ایسا سوچوں بھی تو سانس رکنے لگتی ہے۔" روی کے آنسوؤں نے اشعر کے دل کو بھی پگھلا دیا اور اُسکی آواز بھی رندھ گئی۔

"میں بھی کتنی بُری ہوں..آپکو خوامخواہ پریشان کر دیا۔" روی نے آنسو پونچھتے ہوئے خجالت سے کہا۔

"کوئی شک نہیں اس میں..." اشعر نے روی کو مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے کہا تو دونوں ہنس پڑے۔

☆.....☆.....☆

"بس بھی کر دے یار...اور کتنی پیئے گا؟" سمیر پچھلے دو گھنٹوں سے تبریز کو شراب کے گھونٹ بھرتے دیکھ کر آخر کار کہا تھا۔

"جب تک پی سکتا ہوں۔ پیتا رہوں گا۔" تبریز نے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"کیوں خود کو اس زہر سے برباد کر رہا ہے میرے بھائی...؟ بس کر دے اب یار۔" سمیر سے اپنے دوست کی یہ حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"ہونہہ تباہ......وہ تو میں کب کا ہو چکا ہوں سمیر...اب تو بس ملبہ باقی ہے۔" تبریز نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تبریز یہ عادت تجھے کہیں کا نہیں چھوڑے گی یار۔ اتنی نہ پیا کر کہ تیری زندگی ہی ختم کر ڈالے یہ زہر۔" سمیر نے اُسے نصیحت کی تھی۔

"ہاہاہاہاہا..تو پاگل تجھے کس نے کہا ہے میں جینے کے لئے پیتا ہوں؟ اسی لئے تو پیتا ہوں کہ اس جینے سے میری جان چھوٹ جائے...اسی لئے تو پیتا ہوں کہ ہر دکھ درد بھول جاؤں...اسی لئے تو...پیتا ہوں کہ مجھے ہوش ہی نہ رہے کہ میں زندہ ہوں..." تبریز نے ایک تلخ قہقہہ لگایا تھا۔

"بس تبریز...اب میں تجھے اور نہیں پینے دوں گا۔ تو کس کے لئے خود کو اتنی کڑی سزا دے رہا ہے؟ وہ جو تجھے چھوڑ کر کسی اور کی ہو گئی...؟" سمیر نے تبریز کے ہاتھ سے گلاس کھینچتے ہوئے کہا۔

"اُس نے مجھے نہیں چھوڑا سمیر...وہ مجبور کی گئی ہے یہ سب کرنے کے لئے۔" تبریز نے بتایا

"ہونہہ...مجبور...میں نہیں مانتا یار ایسی مجبوری۔ اگر اُسے تجھ سے محبت ہوتی تو وہ تجھے کبھی ایسے حال میں نہ چھوڑتی چاہے کچھ

بھی ہو جاتا۔" سمیر نے تلخ لہجے میں حقیقت بیان کی۔

"وہ بے وفا نہیں تھی... میری روحی بھی بے وفا نہیں تھی۔ اُسکی معصومیت کا فائدہ اُٹھایا ہے ان محبت کے دشمنوں نے۔" تبریز کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تو سمیر نے اُسے گلے سے لگا لیا تھا۔

"اب جو ہونا تھا ہو چکا تبریز۔ بھول جاؤ سب پرانی باتیں۔ یہ تمہیں اذیت کے سوا کیا دیتی ہیں یار؟" سمیر نے اُسے سمجھانا چاہا تھا۔

"کیسے بھول جاؤں...؟ اور کیا کیا بھول جاؤں؟ میرے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے سمیر... میں بہت بے بس ہوں۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ خوش رہوں... سب کی طرح ہنسوں، مسکراؤں لیکن یہ سب شاید میرے نصیب میں ہی نہیں ہے۔" تبریز نے بے بسی کے عالم میں سمیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں ہے...؟ تم خود ہی خوش نہ رہنا چاہو تو پھر کوئی اور کیا کر سکتا ہے۔ تم خود ہی نئی زندگی شروع کرو گے تو یہ سب پرانی باتیں بھول لو گے ورنہ اسی اذیت میں مبتلا رہو گے۔" سمیر نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

"میں جب بھی سوچتا ہوں کہ میرا پیار، میری چاہت اب کسی اور کی ہے تو میرا خون کھولنے لگتا ہے... جب بھی سوچتا ہوں کہ میرے نصیب کی وہ بارش کسی اور کی چھت پہ برس رہی ہو گی تو میرا وجود ایک تپتے صحرا کی مانند جلنے لگتا ہے۔ پھر میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس پوری دنیا کو آگ لگا دوں۔ جلا دوں اپنی اس آگ میں اُن سب کو بھی جنہوں نے مجھے برباد کیا ہے۔" تبریز نے کھولتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یار جو شے ہمارے نصیب میں نہیں ہوتی، وہ کچھ بھی ہو جائے ہمیں نہیں ملتی اور جو ہمارا نصیب ہوتا ہے وہ پوری دنیا مل کر بھی ہم سے نہیں چھین سکتی کیونکہ اللہ نے ہر شے کی طرح ہر ذی روح کو بھی کسی دوسری روح کے لئے لکھ دیا ہے۔ بارش کا ایک ایک قطرہ، رزق کا ایک ایک دانہ اُسی کو ملتا ہے جسکے لئے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے۔ تو پھر جو وجود جس انسان کا مقدر ہوتا ہے اُسی کو حاصل ہوتا ہے... کبھی کسی دوسرے کا نہیں ہو سکتا۔" سمیر نے ایک بار پھر اُسے سمجھانا چاہا تھا۔

"روحی تو پھر میری تھی... وہ مجھ سے محبت کرتی تھی، میں اُس سے محبت کرتا تھا۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور کے نصیب میں لکھ دی جاتی؟ وہ میرا مقدر کیسے نہیں ہوئی جبکہ میں نے اُسے چاہت کی آخری حدوں تک چاہا ہے...؟" تبریز نے جراح کیا تھا۔

"کیونکہ وہ تمہارے لئے نہیں بنی تھی اور وہ جسکا مقدر تھی بالآخر اُسکی ہو چکی ہے۔ اب تم اس حقیقت کو جتنی جلدی قبول کر لو گے تمہارے لئے اُتنا ہی اچھا ہے تبریز۔" سمیر نے بے دردی سے یہ تلخ حقیقت اُسکے سامنے رکھ دی تو تبریز کی آنکھیں پھر سے چھلک پڑیں۔

"میں یہ کیسے مان لوں کہ وہ میرے مقدر میں نہیں تھی...؟ کیسے بھول جاؤں اپنے گھر والوں کے سخت رویے جنہوں نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی...؟ میں یہ مان ہی نہیں سکتا کہ وہ میرا مقدر نہیں تھی۔ اُسے مجھ سے چھینا گیا ہے... ہمیں اپنے مطلب، اَنا اور جھوٹی عزت و ناموس کی بھینٹ چڑھایا گیا ہے۔ میرے اپنے سگے باپ نے مجھ سے یہ دشمنی نبھائی ہے سمیر... میں یہ کبھی نہیں بھول سکتا۔" تبریز کسی طور بھی قائل ہونے کو تیار نہیں تھا جیسے ہر دلیل اُسکے سامنے بے سود تھی۔

"جو ہونا تھا ہو چکا تبریز... یہ سب کر کے تم خود کو مزید اذیت اور تکلیف کے سوا کیا دے رہے ہو؟ کیا فائدہ خود کو برباد کرنے کا...؟" سمیر نے بے بسی سے کہا۔

"یہ سب میں اُن لوگوں کو سزا دینے کے لئے کر رہا ہوں جو میری بربادی کا سبب بنے ہیں۔ جنہوں نے مجھے میری چاہت سے جدا کیا ہے۔ وہ کیا سمجھتے ہیں کہ مجھے رومی سے جدا کر کے یہ مجھ سے وہ سب کروالیں گے جو کروانا چاہتے تھے...؟ کبھی نہیں... میں کبھی اُنکی بات نہیں مانوں گا بلکہ میرا وجود اُن سب کے لئے ایک سزا ہو گا چلتی پھرتی سزا..." تبریز کا لہجہ اٹل تھا

"خدا کے لئے یار... تم کیوں اپنے ساتھ اتنی بڑی زیادتی کر رہے ہو؟ ٹھیک ہے تم گھر والوں کی بات نہ مانتا لیکن اس طرح سے خود کو تباہ تو نہ کرو... پلیز..." سمیر نے التجا کی۔

"اُنکو بھی تو پتہ چلے کہ اُنہوں نے میرا کتنا بھلا کیا ہے... اُنہیں بھی تو احساس ہو میری تکلیف کا... میرے درد کا... میرے ملال کا... وہ بھی تو خود کو قصوروار سمجھیں۔ انہیں بھی تو اذیت ہو... وہ بھی میری ہی طرح تڑپیں میں چاہتا ہوں۔" تبریز نے اذیت بھرے لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ مت بھولو وہ تمہارے والدین ہیں... بہن بھائی ہیں۔ خون ہو تم اُنکا..."

"ہونہہ... مجھے برباد کرتے ہوئے تو اُنہوں نے نہ سوچا کہ میں اولاد ہوں اُنکی... خون ہوں اُنکا۔ لوگ اپنی اولاد کی خوشی کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتے؟ لیکن میرے باپ نے ہمیشہ اپنے خاندان کو ہم پر ترجیح دی تو پھر میں بھی اُنکا لحاظ کیوں کروں...؟" تبریز کا لہجہ تلخ تھا۔ سمیر لاجواب ہو چکا تھا کیونکہ تبریز کوئی بات سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ تلخیوں سے اُسکا دل بھرا پڑا تھا کیونکہ زندگی کے تلخ ترین تجربے سے وہ گزر رہا تھا۔ ایسے میں اُسے اپنے سوا کوئی بھی صحیح نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ ہر کام میں خدا کی کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔

☆......☆......☆

"بابا جان... آپ تبریز سے بات کیوں نہیں کرتے ہو سکتا ہے آپ کی پیار سے کہی ہوئی بات اُس پہ اثر کر جائے...؟" رضا اور محمود صاحب کافی دیر سے بیٹھے تبریز کے بارے میں بات کر رہے تھے کیونکہ وہ بہت دیر سے گھر نہیں آیا تھا۔ دونوں باپ بیٹا بیٹھ کر تبریز کا انتظار کر رہے تھے۔

"تم نے اُس سے بات کی تھی۔ کیا اثر ہوا اُسکا جو میری بات کا ہو گا؟" محمود صاحب نے تلخی سے کہا۔

"میری بات اور ہے بابا... ویسے بھی زیادہ شکایت اُسکو آپ ہی سے ہے۔" رضا نے ڈرتے ڈرتے کہا تو محمود صاحب نے اُسے گھورا۔

"کیسی شکایت ہے اُسے مجھ سے... میں اُسکا باپ ہوں یا وہ میرا باپ ہے...؟"

"میرا مطلب ہے اگر آپ اُسکی بات مان لیتے تو شاید ایسا نہ ہوتا۔"

"مان لیتا اُس کی بات اور سارے خاندان سے کٹ کر رہ جاتا...؟"

"تو اب بھی تو وہ آپکی بات نہیں مان رہا۔اب بھی تو خاندان سے کٹ ہی رہے ہیں ناں آپ تو کیا ہو جاتا اگر آپ تبریز کی خوشی پوری کر کے اپنی اولاد کو کھونے سے بچ جاتے..."

"نہیں چاہیے مجھے ایسی نا ہنجار اور نافرمان اولاد جسے اپنے باپ کی عزت کی پرواہ نہیں۔" محمود صاحب نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا تھا اور رضا اُنکے ایسے جواب پہ افسردہ تو ہوا تھا لیکن حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ ہمیشہ سے ایسے ہی تھے۔ابھی رضا کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ گھر کی بیل بجی اور وہ باہر نکل گیا۔

"ارے سمیر...تم اس وقت....خیریت تو ہے؟" رضا نے سمیر کو گیٹ پہ دیکھا تو حیرانگی سے پوچھا۔

"جی رضا بھائی..وہ بات یہ ہے کہ تبریز نے..." سمیر اٹکتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تبریز نے کیا..؟ کیا کیا تبریز نے؟" رضا نے بے چینی سے پوچھا۔

"رضا بھائی تبریز نے آج بہت زیادہ شراب پی لی ہے...جسکی وجہ سے وہ نشے میں دھت ہے اور چل بھی نہیں پا رہا۔وہ گاڑی میں ہے میں اُسے گھر چھوڑنے آیا ہوں۔" سمیر نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"سمیر میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اُسے سمجھاؤ تم اُسکے سب سے قریبی دوست ہو..شاید تمہاری بات اُس پہ اثر کر جائے۔" رضا نے بے بسی سے کہا۔

"رضا بھائی میں نے اُسے سمجھانے کی ہر طرح سے کوشش کی ہے لیکن وہ مانتا ہی نہیں کوئی بھی بات سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں وہ۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ اب یہ لڑکا کیا کرے گا اپنے ساتھ..؟"

"وہ تو بس سیدھا سیدھا خود کو برباد کرنے پہ تلا ہوا ہے رضا بھائی...." سمیر ابھی کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ اُسکی آواز حلق میں ہی رہ گئی۔رضا نے مڑ کر دیکھا تو محمود صاحب کھڑے تھے۔

"لے کر آؤ اسے اندر آج تو میں اُس سے بات کر کے ہی رہوں گا۔آج فیصلہ ہو ہی جائے کہ یہ چاہتا کیا ہے...؟" محمود صاحب غصے میں آپے سے باہر ہو رہے تھے۔

"بابا جان آپ اندر جائیں میں اُسے لیکر آتا ہوں۔" رضا نے جلدی سے کہا۔محمود صاحب اندر چلے گئے تو رضا اور سمیر اُسے اندر لے آئے۔سمیر تبریز کو گھر چھوڑ کر خود چلا گیا۔

"بابا جان...یہ اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے میں اسے اسکے کمرے میں چھوڑنے جا رہا ہوں اس سے پہلے کہ امی اسے دیکھ لیں۔" رضا نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت کوئی تماشہ بنے اسلئے اُس نے محمود صاحب کو کوئی بھی بات کرنے سے روکنا چاہا تھا۔

"نہیں رضا۔۔ٹھنڈا پانی لا کر اس پہ ڈالو تا کہ یہ اپنے حواس میں آئے۔ میں آج اس سے بات کر کے ہی رہوں گا ورنہ یہ لڑکا شرابی مشہور ہو جائے گا اور میری عزت کا جنازہ نکال دے گا..." محمود صاحب بھی رکنے والے نہیں تھے۔

"لیکن بابا اسکی حالت تو دیکھیں..."

"جو کہا ہے وہ کرو۔تم سے مشورہ نہیں مانگا میں نے..."

"جی بہتر۔" رضا نے محمود صاحب کو ٹھنڈے پانی کا گلاس لا دیا تھا اور اُنہوں نے فوراً بلا کسی تردد کے تبریز کے منہ پہ اُلٹا دیا جس سے تبریز ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔سامنے باپ اور بھائی کو دیکھ کر وہ کچھ شرمندہ سا ہوا تھا۔

"کب تک چلے گا یہ سب کچھ تبریز آج مجھے صاف صاف بتا دو؟" محمود صاحب نے پوچھا لیکن تبریز کچھ نہ بولا۔"کیا چاہتے ہو... میری عزت کا جنازہ نکالنا؟"

"میں ایسا کچھ نہیں چاہتا تھا۔آپ ہی مجھے اس مقام تک لائے ہیں..." تبریز نے کہا۔

"تو اب میں ہی پوچھتا ہوں برخوردار اب کیا اسی طرح ذلیل و رسوا کرتے ہو پورے خاندان کو اپنی کرتوتوں سے.... یا زندگی میں کوئی اور کارنامہ بھی انجام دینا ہے؟" محمود صاحب نے طنز کیا تھا۔

"کچھ بھی کرلوں گا۔لیکن وہ نہیں جو آپ چاہتے ہیں۔" تبریز نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

"ہاں دردر کی ٹھوکریں کھاتے رہنا اُس لڑکی کے پیچھے لیکن اپنے باپ کی بات نہ ماننا...نافرمان اور ڈھیٹ اولاد کبھی خوش نہیں رہتی جو ماں باپ کو پریشان کرتی ہے۔"

"ہاں اب بددعاؤں کی کمی ہے وہ بھی پوری کر لیں...آپ اور دے بھی کیا سکتے ہیں مجھے؟"

تبریز نے چڑ کر کہا تھا اور محمود صاحب کا ہاتھ اُٹھ گیا اور ایک زناٹے دار تھپڑ تبریز کے چہرے پہ دے مارا۔تبریز گھوم کر پیچھے پڑے ہوئے صوفے پہ جا گرا اور رضا اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔تبریز چند لمحے صدمے کی سی حالت میں بیٹھا رہا اور کچھ دیر بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کچھ بھی کر لیں باباجان... میں کسی صورت بھی آپکی بہن کی بیٹی سے شادی نہیں کرونگا۔" تبریز نے ڈھٹائی سے کہا۔

"جو تیرے کرتوت ہیں کوئی بھی تجھے اب اپنی بیٹی نہ دے گا۔اور اگر تجھے میرے فیصلوں سے انکار ہے تو نکل جا میرے گھر سے...کوئی تعلق نہیں رہے گا تیرا مجھ سے اور اس گھر سے۔"

"ٹھیک ہے بابا...میرا ویسے بھی اب آپ سے تعلق رہ ہی کتنا گیا ہے؟ آپکو میری پرواہ نہ پہلے تھی اور نہ کبھی ہو گی..آپکو صرف اور صرف اپنی خاندانی رسومات اور جھوٹی عزت وناموس کے علاوہ کسی چیز کی پرواہ نہیں۔"

"تو کیوں کروں میں تجھ جیسی نافرمان اولاد کی پرواہ...؟ سارے خاندان کا نام ڈبو دیا ہے تو نے کم بخت شراب پیتا ہے رات رات بھر گھر نہیں آتا پتہ نہیں کہاں منہ کالا کرتا پھرتا ہے...؟" محمود صاحب غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے اور جو منہ میں آیا بولتے چلے گئے۔لیکن باپ کے منہ سے اپنے لئے ایسے الفاظ سن کر تبریز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ اُٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔

"رضا اسے کہہ دے یہ چلا جائے یہاں سے... میں اب اسکی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

رضا بھی جلدی سے تبریز کے پیچھے چل دیا تا کہ اُسے روک سکے۔ شور کی آواز سے شاریز بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ "کیا ہوا رضا بھائی... بابا کیا کہہ رہے ہیں؟" شاریز نے رضا سے پوچھا۔ "بابا تبریز کو گھر سے نکال رہے ہیں شاریز۔ اُسے روکو ورنہ وہ چلا جائے گا۔" رضا نے شاریز کو مختصر اً بتایا۔ "اوہ میرے خدایا..." شاریز پریشان ہو گیا۔

تبریز اپنے کمرے میں سامان پیک کر رہا تھا۔ غصہ اور غم سے اُسکی سانس پھول رہی تھی اور قدم شراب کے نشے کے زیر اثر ڈگمگا رہے تھے۔ رضا نے آکر اُسے روکنے کی کوشش کی اور بازو سے پکڑ کر پاس رکھی کرسی پہ بٹھا دیا۔

"تم پاگل ہو گئے ہو کیا...؟ بابا جان غصے میں ہیں اسلئے ایسا بول دیا اور تم چل پڑے..."

"آپنے نہیں سنا کیا...؟ انہوں نے مجھے صاف صاف یہ گھر چھوڑ دینے کو بولا ہے کیونکہ یہ انکا گھر ہے اور یہاں وہی رہے گا جو اُنکا ہر جائز اور ناجائز کام میں ساتھ دیگا..." تبریز نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔

"تبریز بھائی بابا غصے میں ہیں اسلئے ایسا کہہ رہے ہیں ورنہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ محبت آپ سے ہی کرتے ہیں۔" شاریز نے سمجھانا چاہا تھا۔

"کیا خاک محبت کرتے ہیں...؟ میری خوشیوں کو آگ لگادی اور اب کہتے ہیں دھواں بھی نہ اٹھے..." تبریز کا لہجہ کاٹ دار تھا۔

"انہیں دکھ پہنچا ہے تمہیں اس حال میں دیکھ کر... وہ نہیں جانتے کہ پیار کس طرح ظاہر کرتا ہے اسلئے وہ ہر بات اپنے انداز میں کرتے ہیں غصیلے لہجے میں کہ شاید تم اُنکی بات مان جاؤ۔" رضا نے اُسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں رضا بھائی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں... ورنہ یہ بات تو آپ خود بھی مانتے ہو کہ بچپن سے ہی اگر انہوں نے کسی کی خوشی کا خیال رکھا تو وہ آپ ہیں تبریز بھائی... کیا وہ وقت بھول گئے آپ جب بابا آپکی ہر ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیتے تھے اور آپکی خوشی پوری کرنے کے لئے وہ سب کی مخالفت مول لے لیتے تھے..." شاریز نے کہا تو تبریز کی نم آنکھیں پھر سے بہنے لگیں۔

"کاش کہ وہ میری بچپن کی کوئی ضد نہ مانتے لیکن میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی میں رکاوٹ نہ بنتے تو آج میں اس حال میں نہ ہوتا..." تبریز کی آواز میں دکھ جھلک رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے میرے بھائی کہ تو اس وقت بہت تکلیف میں ہے... لیکن اب گزرا ہوا وقت واپس نہیں لایا جا سکتا... کچھ بھی ہو ہمیں جینا تو پڑتا ہے ناں... ہمارے پیارے جو اس دنیا سے چلے جاتے ہیں ہم اُنکے بغیر بھی تو جیتے ہیں ناں مر تو نہیں جاتے نا..." رضا نے تبریز کو سمجھایا۔

"کاش میں بھی مر جاتا تو آپ سب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی سکون مل جاتا..." تبریز نے کہا

"اچھا اب بس کرو پلیز... اور کچھ دن کے لئے اسلام آباد چلے جاؤ۔ وہاں میرے کام کی ذمہ داری تم پہ ہے جب تک پراجیکٹ مکمل نہ ہو جائے تم وہاں سے نہ آنا۔ ماحول بدلے گا تو تمہیں بہتر محسوس ہوگا۔" رضا نے اُسکا دھیان بٹانے کے لئے کہا۔

"کاش جگہ بدلنے سے انسان کے احساسات بھی بدل سکتے..."

"احساسات بدلیں یا نہ بدلیں لیکن اُنکی شدت میں کمی ضرور آ جاتی ہے۔" رضا نے کہا۔

"جذبات کا تعلق انسان کی روح سے ہوتا ہے جسم سے نہیں۔۔اسلئے باہر کا موسم کچھ بھی ہو اندر کا موسم اُس پہ ہمیشہ حاوی رہتا ہے..." تبریز نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔باہر بلقیس بیگم کھڑی تمام باتیں سن رہی تھیں۔تبریز اُنہیں دیکھ کر ایک پل کے لئے رُکا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا کیونکہ اپنی ماں کی بے بس نظروں کی تاب لانا اُسکے بس میں نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

ہر طرف گہری رات کی تاریکی چھائی ہوئی تھی اور چاروں طرف ایک بھیانک جنگل میں آوازیں گونج رہیں تھیں۔۔رومیسہ کو لگا جیسے کوئی اُسے زور زور سے پکار رہا ہو۔وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اُس آواز کی جانب بڑھنے لگی۔تمام راستہ خاردار جھاڑیوں سے بھرا ہوا تھا اور ہر طرف قد آور درختوں کی پرانی شاخیں سانپوں کی طرح لٹک رہیں تھیں۔۔رومیسہ کو لگ رہا تھا جیسے یہ آواز تبریز کی ہے۔"روی۔۔مجھے بچا لو روی...مجھے بچاؤ۔" کی آواز نے روی کے دل کی دھڑکنیں تیز کر دیں تھیں۔وہ اب بھاگتے ہوئے تبریز کی آواز کے پیچھے دوڑنے لگی تھی۔"تبریز...تم کہاں ہو...؟" اب وہ اُسے باقاعدہ آوازیں دینے لگی تھی۔خاردار جھاڑیوں نے اُسکے پیر زخمی کر دیے تھے لیکن وہ پھر بھی مسلسل بھاگتی چلی جا رہی تھی۔۔بہت دور ایک کھائی نظر آئی جہاں سے تبریز کی دردناک آوازیں آ رہیں تھیں۔۔روی نے جھک کر کھائی میں دیکھا تو وہاں بہت سارے سانپ بچھو اور اژدھوں نے تبریز کو گھیر رکھا ہے۔۔وہ روی کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگا اور اُس سے مدد مانگنے لگا۔"روی مجھے بچا لو...صرف تم ہی مجھے بچا سکتی ہو۔" تبریز نے اپنے ہاتھ روی کی طرف بڑھائے تھے۔۔روی جو سکتے کی سی حالت میں کھڑی تھی اچانک چونکی تھی۔۔اور اس سے پہلے کہ وہ تبریز کو بچانے کے لئے اپنے ہاتھ بڑھاتی ایک آواز نے اُسے روک لیا۔"روی...کہاں جا رہی ہو؟" اشعر کی آواز پہ روی نے چونکتے ہوئے مُڑ کر دیکھا تھا۔اشعر کچھ گز کے فاصلے پہ کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا روی کے دیکھنے پہ اُس نے اپنے بازو پھیلا کر مسکراتے ہوئے کہا تھا "میرے پاس آ جاؤ روی۔" اس سے پہلے کہ روی اشعر کی طرف بڑھتی تبریز کی دل خراش چیخوں نے اُسکے قدم جکڑ لئے تھے۔"روی مجھے چھوڑ کر نہ جانا...میں مر جاؤں گا روی خدا کے لئے مت جانا..." روی کو شدید وحشت کا احساس ہو رہا تھا وہ پسینے میں شرابور ہو رہی تھی۔ایک طرف اشعر کی پکار تھی اور دوسری طرف تبریز کی...روی نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لئے اور ایک جانب بھاگنا شروع کر دیا۔۔وہ بہت تیز بھاگ رہی تھی اور کانٹے اُسکے پیروں کو چھلنی کئے جا رہے تھے اور تکلیف میں اُسکی آنکھوں سے آنسو شدت سے بہہ رہے تھے۔اچانک ہی اُسے لگا جیسے زمین اُسکے پیروں تلے نہیں رہی جیسے وہ ہوا میں تھی۔

روی نے دیکھا تو واقعی وہ ایک پہاڑ سے نیچے گر رہی تھی اسکا پورا وجود ہوا میں لہرا رہا تھا۔خوف سے اُسکے منہ سے چیخیں نکل رہی تھیں۔

"روی کیا ہوا میری جان۔آنکھیں کھولو پلیز۔" اشعر نے روی کے چہرے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تو روی ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہوا جان...کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا کیا...؟" اشعر نے پانی کا گلاس اُسکے منہ سے لگاتے ہوئے پوچھا۔روی کا پورا جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور وہ خوف سے کانپ رہی تھی۔اشعر نے اُسے اپنے ساتھ چمٹا لیا تھا۔

"بس میری جان... کچھ نہیں ہوا خواب تھا... میں تمہارے پاس ہوں۔" رومی بچوں کی طرح اشعر کے سینے سے چمٹی ہوئی رو رہی تھی۔ خواب کے مناظر اُسکی آنکھوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ وہ سخت خوفزدہ تھی اور فکرمند بھی کیونکہ اُسے تبریز کی حالت پہ بہت دکھ ہوا تھا اور پھر کھائی میں گرنے کے احساس سے اُسکے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ رات اشعر اور رومی دونوں پہ بہت بھاری گزری تھی۔ ہنی مون پہ ایسا ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ مری کے سرد موسم میں بھی رومی پسینے میں شرابور تھی اور اشعر اُسکی حالت دیکھ کر بے حد پریشان ہوا تھا۔ اُسے لگا شاید رومی کو یہاں خوف محسوس ہو رہا ہے اسلئے ڈراؤنے خواب اُسے پریشان کر رہے ہیں۔ خطرناک رستوں سے تو پہلے بھی بہت خوفزدہ ہوتی تھی اسلئے اشعر اُسے صرف مری تک لایا تھا ورنہ وہ خود سوات اور سکردو تک جانا چاہتا تھا۔ وہاں کی خوبصورت وادیوں میں اپنی محبوب بیوی کے ساتھ گھومنا چاہتا تھا لیکن وہ رومی کو خوفزدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اشعر رومی کو بے پناہ چاہتا تھا اور رومی کی سانسوں کی رفتار سے اُسکے دل دھڑکتیں چلتی تھیں وہ کبھی بھی اُسے کھونے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔ اشعر نے بہت مشکل سے اُسے دوبارہ سلایا تھا لیکن وہ خود نہیں سو سکا تھا۔ اُسے رومی کی بہت فکر ہو رہی تھی کیونکہ آج سے پہلے وہ کبھی اس طرح نہیں ڈری تھی وہ تو بہت بہادر اور سمجھدار لڑکی تھی۔ بہت دیر سوچوں میں غرق رہنے کے بعد آخر کسی پہر اشعر کو بھی نیند آ ہی گئی تھی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو رومی پہلے سے اُٹھ چکی تھی۔ وہ کمرے کی کھڑکی سے باہر پہاڑوں سے بہتے پانیوں کا خوبصورت منظر دیکھ رہی تھی۔ اشعر کو اُٹھتے دیکھ کر وہ اُسکے پاس آ گئی تھی۔

"مجھے جگایا کیوں نہیں... کب سے اُٹھی ہوئی ہو؟" اشعر نے فوراً سوال کیا۔

"میری وجہ سے آپ پہلے ہی رات بھر ڈسٹرب رہے تھے اسلئے میں نے نہیں جگایا آپکو..."

"آئندہ ایسا کبھی مت کہنا کہ میں تمہاری وجہ سے ڈسٹرب ہوا ہوں..."

"اچھا... آپ فریش ہو جائیں۔ میں آپکے کپڑے نکال دیتی ہوں۔" رومی نے کہا اور کپڑے نکالنے کے لئے مڑی ہی تھی کہ اشعر نے اُسکو بازو سے پکڑ کر اپنے پاس کر لیا۔

"کیا بات ہے... تم اب تک خواب کی وجہ سے پریشان ہو؟"

"نہیں اشعر... ایسی کوئی بات نہیں بس ایسے ہی طبیعت عجیب سی ہو رہی ہے..." رومی نے کہا تو اشعر نے اُسکے ماتھے پہ ہاتھ رکھ کر چیک کیا کہیں بخار تو نہیں۔

"اشعر میں بالکل ٹھیک ہوں آپ پریشان نہ ہوں پلیز..." رومی نے کہا۔

"میں تمہارے چہرے پہ ایک پل کے لئے بھی اُداسی نہیں دیکھ سکتا رومی... you know

whet i Love you more then my life..." اشعر نے اُسے وارفتگی سے دیکھا۔

"میں جانتی ہوں... آپکے دل کی ہر کیفیت سے واقف ہوں میں آپکی بیوی جو ہوں۔ آپکی سانسوں سے جان لیتی ہوں کہ کس وقت آپ پہ کیا کیفیت ہے۔" رومی نے اشعر کی آنکھوں میں محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اپنے چہرے سے یہ اُداسی ہٹا دو۔ مجھے یہ گوارہ نہیں کہ تمہارا دل کسی بات پہ بھی اُداس ہو..."

"جو حکم میرے سرتاج کا..." روحی نے سر جھکا کر کہا تو اشعر مسکرا دیا۔

"تمہاری یہی حرکتیں مجھے پیاری لگتی ہیں... تمہاری ایک مسکراہٹ ہی میرے اندر زندگی کی لہر دوڑا دیتی ہے اور میں ایک دم تازہ دم ہو جاتا ہوں۔" اشعر نے اُسے پیار سے دیکھتے ہوئے کہا تو روحی نے اُسے بازو سے پکڑ کر واش روم کی طرف دھکیل دیا۔ روحی، اشعر کے کپڑے نکال کر رکھ رہی تھی کہ موبائل فون بجنے لگا۔ روحی کی امی کی کال آ رہی تھی اُس نے فوراً فون آن کر کے کان سے لگایا تھا۔

"امی کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو میری شہزادی...؟" امی کی پیار بھری آواز نے روحی کے دل کو افسردہ کر دیا اور اُسکا دل چاہا کہ وہ اپنی ماں کی گود میں سر رکھ کر رو دے۔ کل رات کے خواب نے اُسے بہت پریشان کیا ہوا تھا۔

"امی... میں ٹھیک ہوں۔ ابو کیسے ہیں؟" روحی کی آواز لڑکھڑائی تھی۔

"تمہارے ابو تمہیں بہت یاد کرتے ہیں... ہر وقت تمہاری اور اشعر کی تصویریں دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے تم لوگ کب واپس آؤ گے...؟"

"ہم بہت جلد واپس آ جائیں... گے امی..." روحی نے بہت کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے آنسو روک نہیں پائی تھی۔

"تم رو رہی ہو کیا بیٹا؟" امی کی پریشان آواز اُبھری۔

"ارے نہیں امی... میں کیوں روؤں گی۔ ہم تو یہاں بہت مزے میں ہیں... اشعر کا تو دل ہی نہیں چاہ رہا واپس آنے کو..." روحی نے جلدی سے آنسو پونچھے اور بات بدل دی۔

"اچھا بیٹا... چلو خوب انجوائے کرو۔ یہی تو دن ہیں تم لوگوں کے انجوائے کرنے کے... بعد میں تو پھر وہی روٹین لائف ہو گی۔" امی نے خوشی سے کہا۔

"جی امی... ابو کو سلام کہیے گا اور اپنا خیال رکھئے گا ودعا دیں۔" روحی نے بمشکل کہا اور فون بند کر دیا۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کو بہت یاد کر رہی تھی۔ اشعر نے یہ سب سن لیا تھا وہ روحی کے پیچھے کھڑا اُسکی ساری کیفیات دیکھ رہا تھا جس سے وہ بے خبر تھی۔ لیکن اشعر کے دل کو روحی کے آنسو پگھلا گئے تھے۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ کل صبح ہی وہ واپسی کی راہ لے گا تا کہ جلد از جلد روحی کو اُسکے والدین سے ملوا سکے۔

"جان آج پیکنگ کر لینا رات کو... کل ہم واپس لاہور جائیں گے۔" اشعر نے ایسے کہا جیسے اُس نے روحی کو روتے ہوئے دیکھا ہی نہ ہو۔ روحی ایک دم چونک پڑی اور فوراً آنسو پونچھتی ہوئی اُٹھ کر اشعر کے پاس آ گئی جو آئینے کے سامنے کھڑا شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ ایک ہفتہ نتھیا گلی میں رکیں گے...؟"

"ہاں لیکن میرے خیال میں کافی دن ہو گئے ہیں... آفس کے بہت سے کام بھی پینڈنگ پڑے ہیں۔" اشعر نے ایسے کہا جیسے واقعی وہ یہاں رکنا نہیں چاہتا۔

"حیرت ہے۔آپ کا تو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا کہ آپ یہاں سے جاؤ اور اب آناً فاناً جانے کی تیاری... سب ٹھیک تو ہے ناں؟"

"ہاہاہا... روایتی بیویوں کی طرح شک کرتی ہوئی کتنی کیوٹ لگ رہی ہو..." اشعر نے بات ہنسی میں اُڑا دی۔

"آپ بھی ناں..." روی نے برا سا منہ بنایا تھا اور اشعر کو مزید ہنسی آ رہی تھی۔

☆....☆....☆

"تبریز بھائی صبح صبح کہاں کی تیاری ہے؟" شاریز کمرے میں داخل ہوا تو تبریز کو سامان اکٹھا کرتے دیکھ کر پوچھا۔

"بابا کی نظروں سے دور جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں..."

"اسلام آباد جا رہا ہوں... رضا بھائی کے پراجیکٹ کو لُک آفٹر کرنے۔"

"ارے واہ... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔"

"رضا بھائی تیار ہو گئے ہیں آفس جانے کے لئے؟" تبریز نے شاریز کی خوشی کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی وہ تیار ہیں... بس نکلنے ہی والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے پھر میں اُن سے مل لوں تو میں بھی نکلتا ہوں۔" تبریز نے کہا اور کمرے سے نکل کر ڈائننگ ٹیبل پہ آ گیا جہاں رضا بھائی اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ناشتہ کر رہے تھے۔

"ارے آؤ تبریز... ناشتہ کر لو۔" رضا نے اُسے دیکھتے ہی کہا۔

"نہیں بھائی آپ کریں۔ مجھے بھوک نہیں ہے... میں یہ بتانے آیا تھا کہ اسلام آباد کے لئے نکل رہا ہوں یہاں کے میرے کلائنٹس آپ دیکھ لیجئے گا جب تک میں وہاں ہوں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں... تم فکر نہ کرو میں دیکھ لوں گا۔" رضا نے خوشی سے کہا۔ اُسے تبریز میں بہتر تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔

"بہت شکریہ... اب میں نکلتا ہوں تاکہ وقت پہ پہنچ جاؤں۔ ابھی راستے میں ایک، دو جگہ کچھ لوگوں سے ملنا بھی ہے مجھے..." تبریز نے کہا تو رضا نے اُٹھ کر اُسے گلے لگایا تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری بات کا بھرم رکھ لیا... اور خود کو سنبھلنے کا ایک موقع دے دیا۔" رضا نے تبریز کو خوشی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"جی بھائی... اب میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ۔" تبریز نے کہا اور چلا گیا۔ لیکن اُسکے دل پہ کیا کیفیات تھیں یہ تو وہی جانتا تھا۔ وہ تو جیسے خود سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا کیونکہ وہ خود بھی اپنے اس جنون سے تنگ آ چکا تھا۔ روی کی یادوں سے پیچھا چھڑانے کا ایک طریقہ اُسے یہ بھی سمجھ آتا تھا کہ اُسکا شہر ہی چھوڑ دیا جائے جہاں جگہ جگہ اُسکی یادیں ہیں... اُسکی باتیں کرنے والے لوگ ہیں.. اُس سے جڑی ہوئی ہر چیز سے دور بھاگا جائے.. لیکن وہ کتنا بھی بھاگتا خود اپنے آپ سے تو نہیں بھاگ سکتا تھا۔ اور یہی چیز اُسکو سب سے زیادہ تکلیف

وہ گئی تھی کہ وہ اس دل کو کیسے نکال پھینکے جو صرف اتنا بھی شاید رومی کا نام لیکر تھا۔ بلقیس بیگم سے ملتے ہوئے اس نے کرسی پہ بیٹھے ہوئے محمود صاحب کو بھی ایک نظر دیکھا تھا جنکے چہرے پہ شاید کوئی ملال تو تھا لیکن اَنا نے اُسکو بے نیازی میں بدل کر اُنہیں اپنی اولاد کو نظر انداز کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ بلقیس بیگم نے روتے ہوئے اپنے لاڈلے بیٹے کو رخصت کیا تھا کہ شاید اُسکے دکھ میں کچھ کمی آ سکے۔ تبریز چلا گیا اور محمود صاحب اُسے جاتا دیکھتے رہے۔ اُنکی آنکھوں میں بھی ایک کرب اور ملال کی نمی تیر رہی تھی لیکن اب وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اپنے بیٹے کو خود اُنہوں نے اپنے آپ سے دور کر دیا تھا اور اب چاہ کر بھی وہ اُسے اُسکی خوشی لوٹا نہیں سکتے تھے۔ تبریز گھر سے نکل کر سب سے پہلے آفس آیا تھا جہاں سے پراجیکٹ کے کچھ ضروری کاغذات اُسے لینے تھے۔ اُسکے بعد وہ اپنے کلائنٹس کی ڈیٹیلز رضا کو دینے کے بعد اسلام آباد کے لئے نکل چکا تھا۔ راستے میں گجرانوالہ اور پھر کھاریاں میں چند لوگوں سے ملاقات کرتے ہوئے اُسے شام ہو گئی تھی۔ اب تبریز چاہ رہا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی منزل پہ پہنچ جائے۔

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے اور رات کی تاریکی میں چمکتا ہوا چاند بالکل اُسے اپنی رومیسہ کے چہرے کی طرح لگ رہا تھا۔ اُس نے راستے میں گاڑی روکی اور اُتر کر چاند کو یوں دیکھنے لگا جیسے وہ واقعی رومیسہ کا چہرہ ہو۔ "چودھویں کے چاند میں عجب سا سحر ہوتا ہے میرا دل چاہتا ہے گھنٹوں اسے دیکھتی رہوں..." رومیسہ کے الفاظ اُسکی سماعتوں میں گونجے تھے۔ تبریز کی آنکھوں میں ایک بے نام سی اُداسی اُتر آئی تھی۔ لیکن آج اُس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ خود کو سنبھالنے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہی سوچ کر وہ پھر سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور اپنی منزل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ایک جگہ رُکا اور کھانا کھا کر ایک کپ چائے پی تاکہ نیند نہ آ جائے۔ رات بہت گہری ہو چکی تھی اور جی۔ ٹی روڈ پر گاڑیوں کی تعداد معمول سے کچھ زیادہ ہی کم تھی۔ شاید سردی اور دھند کے باعث ٹریفک معمول سے بہت کم تھی۔ دور دور تک کوئی بندہ بشر دکھائی نہیں دیتا تھا اور گاڑیاں بھی اکا دکا کہیں کہیں نظر آتی تھی جن میں سے زیادہ تر سامان سے لدے ہوئے ٹرک یا پھر کوئی مسافر بس ہوتی تھی۔ تبریز اب اسلام آباد سے تھوڑے ہی فاصلے پہ تھا کہ ٹیکسلا کے قریب اُسے لاہور جانے والے راستے پہ ایک گاڑی اُلٹی ہوئی نظر آئی۔ تبریز نے فوراً بریک لگائی تھی اور اُتر کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ آس پاس کوئی دوسری گاڑی تھی نہ ہی کوئی بندہ بشر دکھائی دیا۔ شدید سردی اور دھند کی وجہ سے سڑکیں خالی پڑی تھیں۔ تبریز سڑک پار کر کے گاڑی کے قریب پہنچا تو گاڑی اُلٹی ہوئی تھی لیکن گاڑی کی پچھلی اور اگلی کچھ لائٹیں آن تھیں۔ سامنے کی طرف سے گاڑی بالکل تباہ ہو چکی تھی اور کسی کے بچنے کی اُمید بھی بہت کم لگ رہی تھی۔ تبریز نے جھک کر دیکھا تو دو لوگ گاڑی میں زخمی نظر آئے۔ اُس نے فوراً اُنہیں باہر نکالنے کی کوشش کی تھی۔ گاڑی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں سے اندر ہاتھ ڈال کر تبریز نے ایک سائیڈ سے دروازہ کھولا۔ ایک عورت بُری طرح زخمی تھی اور ڈرائیور سائیڈ پہ آدمی بھی بُری طرح خون میں لت پت پڑا تھا لیکن اُسکو نکالنا مشکل تھا کیونکہ گاڑی ڈرائیور سائیڈ پہ اُلٹی ہوئی تھی۔ تبریز نے جلدی سے عورت کو کھینچ کر باہر نکالا اور جونہی اُس نے اُسکا چہرہ دیکھا تو ایک دل خراش چیخ تبریز کے منہ سے نکلی تھی اور اُسکا وجود کانپ اُٹھا تھا اور تمام جسم پہ چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگی تھیں۔

باب نمبر۵

عرشیہ کو لگا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہے اور ابھی چیخے گی تو اُسکی آنکھ کھل جائے گی۔ وہ چیخنا چاہ رہی تھی لیکن اُسکی آواز گلے میں ہی دب کر رہ گئی اور وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی رہ گئی جیسے پتھر کی ہوگئی ہو۔ اُسے کچھ ہوش بھی نہیں رہا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور کیوں کھڑی ہے بس کسی نے بازو سے پکڑ کر اُسے سامنے بیٹھے شخص کے پہلو میں بٹھا دیا جسے دیکھ کر وہ سُن ہوگئی تھی۔ ''کیا یہ تیمور ہے۔ میرا شوہر۔؟'' عرشیہ کے کانوں میں جیسے کوئی سرگوشی ہوئی تھی۔ اُس کی گردن اچانک ہی اپنے پہلو میں بیٹھے شخص کی طرف مڑی تھی جیسے یقین کرنا چاہ رہی ہو کہ جسکو دیکھ کر یہ حالت ہوئی ہے کیا اُسی کے پہلو میں بیٹھی ہے۔ عرشیہ کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آرہا تھا۔ ''امی ابو میرے ساتھ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔۔ آخر یہ سب اتنے سنگدل کیسے ہوسکتے ہیں؟'' عرشیہ کا دل بین کر رہا تھا۔ پہلو میں بیٹھا تیمور عمر میں عرشیہ سے دوگنا تھا سر پہ بال بھی برائے نام تھے اور چہرے پہ سیاہ رنگت کے ساتھ ڈھلتی عمر کی چھائیاں اور ناگواری کی جھلک نے عرشیہ کو زمین بوس کر دیا تھا۔ اُسکا دل چاہ رہا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کہیں دور چلی جائے جہاں دنیا کے ظالم لوگ کبھی بھی اس تک نہ پہنچ سکیں۔ ساس اور نندوں کے چہروں پہ بھی وہی صدا کی بے زاری دکھائی دے رہی تھی۔ ''معلوم نہیں کہ یہ شادی ہو کیوں رہی ہے۔ کون خوش ہے اس نکاح سے۔؟'' عرشیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔ پھر ایک ایک کر کے اپنے گھر والوں پہ نظر دوڑائی۔ امی، ابو، شیراز بھائی اور بہنیں۔ ہر کوئی جیسے اپنا اپنا قصور چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جیسے ہر کوئی چاہتا ہو کہ عرشیہ اُن سے نظر نہ ملائے تاکہ ہر کوئی اُسکی گلہ کرتی نظروں سے بچ جائے۔ کہیں عرشیہ اُنکے چہروں پہ صاف نظر آنے والا گلٹ (Guilt) نہ دیکھ لے۔ پہلو میں بیٹھے ہوئے تیمور سے ایک عجیب قسم کی ناگواری سی پھوٹ رہی تھی جیسے وہ بھی اس رشتے میں عرشیہ کی طرح کسی مجبوری سے بندھا ہو۔ یا پھر عرشیہ کے لئے اُسکا وجود جیسے ناقابلِ قبول تھا ویسے ہی تیمور کے لئے اُسکا وجود بھی ناقابلِ قبول ہو۔ عجیب مشکل وقت تھا عرشیہ پہ کہ وہ حیرت اور دکھ کے گہرے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں خود کو غرقاب ہوتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ جلد از جلد وہاں سے اُٹھ جانا چاہتی تھی لیکن مجبوری نے اُسکے قدم جکڑ لئے ہوں جیسے۔ فوٹوگرافر اُسکی اور تیمور کی تصویریں بنا رہا تھا اور عرشیہ کو سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی۔

''اب ایسے پوز کریں کہ ایک دوسرے کی طرف دیکھیں اور تیمور بھائی آپ بھابھی کا ہاتھ پکڑیں۔'' فوٹوگرافر نے دونوں کو ہدایت دی تو عرشیہ گڑبڑا سی گئی۔ تیمور نے ہاتھ بڑھانا چاہا تھا لیکن عرشیہ نے منع کر دیا۔ تیمور کو سخت تذلیل محسوس ہوئی تھی۔

''بس ٹھیک ہے بہت تصویریں ہوگئیں۔ اب باقی فیملی کی بنا لیں۔'' تیمور نے فوٹوگرافر سے کہا تو وہ باقی مہمانوں میں مصروف ہوگیا۔ تیمور کو عرشیہ کا اجنبی اور سرد رویہ بے حد ناگوار گزرا تھا اسلئے وہ وہاں سے اُٹھ گیا اور مردوں میں جا کر بیٹھ گیا۔ عرشیہ نے اُسکی کیفیت

کو بھاپ لیا تھا لیکن اُسے خود پہ کوئی اختیار نہ تھا۔ غم اور حیرت کے جو پہاڑ اُس پہ ٹوٹے تھے وہ اُسے اس دنیا سے بیگانہ کئے دے رہے تھے۔ سب لوگوں کے جانے کے بعد عرشیہ بغیر کسی سے بات کئے اپنے کمرے میں آ گئی۔ آئینے کے سامنے کھڑی وہ خود کو دیکھ رہی تھی اور دیکھے ہی جا رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ خود میں کیا ڈھونڈ رہی تھی۔ اپنی عزتِ نفس..؟ اپنی خودداری...؟ یا پھر اپنا نصیب دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آنسوؤں کی دو نہریں اُسکی سمندر کی سی گہری آنکھوں سے بہنے لگی تھیں۔ خود پہ سجائی گئی ہر چیز اُس نے نوچ پھینکی تھی۔ "کیا یہ تھا میرے صبر کا پھل...؟" عرشیہ نے تلخی سے سوچا تھا۔ "کیا اسکے لئے میں نے خود کو تیس برس سنبھال کر رکھا تھا..؟" عرشیہ زور زور سے رو رہی تھی اور خود سے سوال کر رہی تھی۔ "کیا میں اتنی گئی گزری تھی کہ میری شادی پیسے دے کر کروائی جاتی وہ بھی ایک ایسے شخص سے کہ جسکی طرف میں دیکھوں تو احساسِ ذلت مزید بڑھ جائے؟" عرشیہ کا دل جیسے پھٹ رہا تھا اور وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔ دنیا میں شاید وہ پہلی لڑکی ہو گی جو اپنے نکاح کی رات اس طرح ٹوٹ کر روئی ہو۔ "میرے گھر والوں نے مجھے ایک کم شکل، کم پڑھے لکھے، کم حیثیت انسان کے قابل سمجھا.. بوجھ سمجھ کر جلد از جلد اتارنے کی خاطر یہ بھی نہیں سوچا کہ میں کیسے زندگی بھر اس تعلق کو نبھا پاؤں گی...؟ کیا اس طرح پیسے کی خاطر شادی کرنے والے مجھے میرا مقام اور عزت دے پائیں گے..؟" عرشیہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اُسکے ساتھ کیا ہو گیا ہے۔ "میں نے آخر ایسا کیا گناہ کیا تھا کہ جسکی مجھے ایسی سزا ملی ہے..؟ میں نے تو کسی کو کبھی نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا تھا تو پھر یہ کس گناہ کی سزا ہے میرے لئے..؟" عرشیہ کا دل کٹ رہا تھا۔ رات بھر وہ اپنے نصیب کا ماتم مناتی رہی۔ مسلسل روتے رہنے سے اُسکی آنکھیں سوج گئیں تھیں لیکن دل تھا کہ سنبھل ہی نہیں پا رہا تھا۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے اپنی قسمت پہ رو رہی تھی اور خدا سے گلہ کر رہی تھی کہ آخر اُسے کس بات کی سزا میں ایسی ذلت بھری زندگی سے نوازا گیا ہے۔ آخر اتنا صبر کر کے بھی اُسے یہی ملنا تھا تو اس سے بہتر تھا کہ کوئی بھی نہ ملتا کم از کم عزتِ نفس تو مجروح نہ ہوتی۔

☆......☆......☆

"سنئے جی... مجھے لگتا ہے کہ عرشی اس نکاح سے خوش نہیں ہے..." صبیحہ بیگم نے عرشیہ کی غیر معمولی خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا تھا۔

"ابھی اُسے ہمارا فیصلہ درست نہیں لگے گا لیکن جب کل کو وہ تیمور کے ساتھ خوش رہے گی تو اُسے سمجھ آ جائے گی کہ ہم نے جو بھی کیا اُسکی بھلائی کے لئے کیا تھا۔" احمد صاحب نے بیوی کو تسلی دی تھی لیکن صبیحہ بیگم کا دل مطمئن نہ ہو سکا تھا۔

"میں نے اُسکی خاموش نظروں میں ہزاروں گلے دیکھے ہیں جنہیں اُس نے کبھی زبان پہ نہیں آنے دیا۔ چپ چاپ ہمارے فیصلے پہ سر جھکا دیا میری بچی نے ایک بار بھی شکوہ نہ کیا۔" صبیحہ بیگم کی آواز رندھ گئی تھی۔

"اری نیک بخت۔ تو کیوں پریشان ہوتی ہے؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ عرشی کے سب بہن بھائی بال بچے دار اپنی اپنی زندگیوں میں مصروف رہتے ہیں... میرے اور تیرے بعد کون اُسکا خیال رکھے گا کبھی سوچا ہے تو نے؟" احمد صاحب نے بیوی سے سوال کیا تھا۔

"آپکی بات ٹھیک ہے لیکن ہمیں اُسکے برابر کا جوڑ ڈھونڈنا چاہیے تھا... آپکو نہیں لگتا کہ ہم نے اُسکے ساتھ زیادتی کر دی ہے؟" صبیحہ بیگم نے کہا تو احمد صاحب سوچ میں پڑ گئے۔

"ہم نے اُس پہ زیادتی نہیں کی... ہمارے بعد وہ اکیلی نہ رہ جائے اسلیے اُسکے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لئے ایسا فیصلہ مصلحتاً کیا ہے۔ اور انشاءاللہ ہماری بیٹی بہت خوش رہے گی۔" احمد صاحب نے پُرسوچ انداز میں کہا تھا۔

"اُسکی آنکھوں میں عجیب سا کرب دکھائی دیتا ہے جو مجھے خوفزدہ کر دیتا ہے۔ اور ایک عجیب سا احساسِ ندامت ہونے لگتا ہے اُسکی خاموش نگاہوں میں دیکھ کر..." صبیحہ بیگم نے کہا۔

"ہاں ایسا ہی ہے۔ لیکن میری ابتر ہوتی حالت اور ہمارا بڑھاپا مجھے اُسکی فکر میں مبتلا کر دیتا تھا۔ میں اُسکا باپ ہوں کیسے اپنی بچی کو بے سہارا چھوڑ جاتا..؟ اس طرح اُسکا گھر بسا ہوگا، شوہر بچے ہوں گے تو کم از کم وہ ہمارے اس دنیا سے جانے کے بعد خود کو اکیلا تو نہیں محسوس کریگی ناں..." احمد صاحب نے دُکھی لہجے میں بولا تھا۔

"ہاں سچ کہتے ہیں آپ عرشی کے ابا... بھابھیوں کے رحم و کرم پہ تو نہیں چھوڑا جا سکتا تھا اُسے۔ ہم آج ہیں کل کو نہیں ہونگے تو کون پوچھے گا.. کون ذمہ داری لے گا اُسکی...؟"

"اسلیے تو کہہ رہا ہوں نیک بخت... یہ وقتی ملال ہے۔ آئندہ آنے والی خوشیاں اُسکے دل سے ہر رنج و ملال کو نکال پھینکیں گی۔"

"انشاءاللہ ایسا ہی ہوگا۔ اللہ ہماری بچی کے نصیب اچھے کرے... آمین۔" صبیحہ بیگم نے دعا کی تھی۔ اتنے میں عرشیہ کی گاڑی کی آواز سنائی دی تھی۔

"لیجئے آ گئی ہے ہماری لاڈلی..." احمد صاحب نے کہا۔

"اچھا میں اُسکے لئے کھانا لگواتی ہوں۔" صبیحہ بیگم نے کہا اور فوراً کچن کی طرف چل دیں۔

عرشیہ گاڑی پورچ میں پارک کر کے لاؤنج میں داخل ہوئی تھی جہاں احمد صاحب مسکراہٹ کے ساتھ اُسکے منتظر تھے۔

"اسلام وعلیکم ابو۔" عرشیہ نے باپ کو دیکھتے ہی کہا۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو میری بچی۔" احمد صاحب نے دعا دی تھی۔

"امی کہاں ہیں؟" عرشی نے ماں کو نہ پا کر پوچھا تھا۔

"وہ تمہارے لئے کھانا لگوا رہی ہیں تم جا کر فریش ہو جاؤ پھر لنچ کر کے آرام کرنا سکول سے تھکی ہوئی آئی ہو۔" ابا نے کہا تو عرشی اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ "ماں، باپ اپنی اولاد کا خیال رکھنا اُس وقت بھی نہیں چھوڑتے جس وقت سب سے زیادہ انہیں خود آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔" عرشیہ نے منہ دھوتے ہوئے سوچا تھا اور آئینے میں اپنے عکس کو دیکھ کر ایک شرمندگی کا احساس ہوا تھا۔

"مجھے اب اپنے آپکو سنبھالنا ہوگا اور اس ملال سے خود کو باہر نکالنا ہوگا۔ تیمور جو بھی ہے جیسا بھی ہے اب میرا نصیب ہے۔ اور

مجھے اپنے نصیب پہ راضی رہنا چاہیے۔۔۔شاید میرے رب کی یہی رضا تھی اور شاید تیمور ہی میرے لئے بہتر ہو۔۔۔" عرشیہ نے خود کو سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن تیمور کا وجود جیسے ہی اُسکے ذہن میں آیا تو ایک عجیب سی ناگواری اور رنج محسوس ہوا تھا۔

"شکل سے کیا ہوتا ہے۔۔انسان کا کردار اور طبیعت نیک ہونی چاہیے۔۔" عرشیہ نے پھر سے دل میں سوچا اور تمام بُرے خیالات کو جھٹکتی ہوئی باہر آ گئی جہاں صبیحہ بیگم اُسکے کھانے پہ منتظر تھیں۔ "عرشی جلدی سے آ جاؤ بیٹا کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔۔" صبیحہ بیگم نے کہا تو عرشی جلدی سے ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھ کر کھانا کھانے لگی۔ صبیحہ بیگم کھانا کھاتے ہوئے بیٹی کے سپاٹ چہرے پہ جیسے دُکھ کی کوئی تحریر پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"عرشی بیٹا۔۔میں جانتی ہوں کہ تم اس نکاح سے خوش نہیں ہو۔" صبیحہ بیگم نے ہمت کر کے بولا تو عرشی کا ہاتھ کھانا کھاتے کھاتے ایک دم سے رُکا اور اُس نے حیران نظروں سے ماں کی طرف دیکھا اور سوچا تھا کہ نا جانے ماں باپ کیسے اپنی اولاد کا غم بھانپ لیتے ہیں چاہے وہ لاکھ چھپانے کی کوشش کیوں نہ کریں۔

"بیٹا آج شاید تم ہمیں غلط سمجھو۔۔یا خود غرض۔۔یا ظالم۔۔۔لیکن کل کو جب ہم نہیں ہونگے تو تمہیں اندازہ ہو گا کہ ہم غلط نہیں تھے ہم تو صرف تمہاری بھلائی چاہتے تھے۔۔۔تم ہمارے بعد تنہا نہ رہ جاؤ اسلیے ہم نے تمہارا مستقبل محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے بیٹا۔" صبیحہ بیگم ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کر ادا کر رہی تھیں جیسے ہر لفظ پہ اُسے اپنی نیک نیتی کی یقین دہانی کروا رہی ہوں۔

"امی آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔۔؟اللہ آپکا اور ابو کا سایہ ہمیشہ میرے سر پہ سلامت رکھے"

"ماں باپ بہت مجبور ہوتے ہیں بیٹا۔۔اور وہ ہمیشہ اپنی اولاد کو سکھی اور آباد دیکھنا چاہتے ہیں تا کہ جب وہ اس دنیا سے جائیں تو اس سکون سے جائیں کہ اُنکی کوئی اولاد اُنکے بعد بے سہارا نہیں رہ گئی۔۔کسی کے رحم و کرم پہ نہیں چھوڑ آئے۔" صبیحہ بیگم کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"امی خدا کے لئے ایسی باتیں نہ کریں۔۔۔مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" عرشی کا دل تڑپ گیا تھا۔

"تم کوئی شکایت نہ بھی کرو لیکن تمہاری نظریں مجھے سب کچھ کہہ دیتی ہیں بیٹا۔ ماں سے بہتر اولاد کے دل کی حالت کون جان سکتا ہے۔۔۔مجھے تمہارے دکھ کا اندازہ ہے۔" صبیحہ بیگم نے کہا۔

"مجھے کوئی دکھ نہیں ہے امی۔۔۔جو میرے نصیب میں تھا مجھے مل گیا۔۔اور میں خدا کی رضا میں راضی ہوں نہ مجھے آپ سے کوئی شکایت ہے نہ ہی خدا سے۔۔میں نے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیا ہے سب کچھ۔" عرشی نے جلے ہوئے دل سے کہا تھا۔

"ایک بات یاد رکھنا بیٹا۔۔شکل و صورت یا پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ جیون ساتھی کی محبت اور ساتھ دنیا کی سب سے قیمتی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ حسین صورت اور روپیہ پیسہ سب کچھ بیکار ہوتا ہے اگر جیون ساتھی کی محبت اور اُس سے عزت نہ ملے تو۔۔۔پیار، محبت ایسی چیزیں ہیں جو زندگی کو خوبصورت بناتے ہیں۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم تیمور کا دل جیت لو گی اور وہ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔" صبیحہ بیگم نے سمجھایا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں امی... ایسا ہی ہے۔" عرشی نے سر جھکا کر کہا۔

"میں اور تمہارے ابو بہت کمزور اور بوڑھے ہو گئے ہیں بیٹا.. ہماری زندگیوں کا کیا بھروسہ آج ہیں کل نہیں ہونگے... ہمارے بعد تم بھائی اور بھابیوں کے رحم و کرم پہ تنہا رہ جاؤ یہ ہم نہیں چاہتے۔ جب بھابیاں آجاتیں ہیں ناں بیٹا تو بھائی بھی پرائے سے ہو جاتے ہیں... بہنیں بھی اپنی گھر گرہستی میں الجھ جاتی ہیں۔ اسلئے ہم تمہارا گھر جلد از جلد بسا دینا چاہتے تھے بیٹا تاکہ ہمارے بعد تم تنہا نہ رہ جاؤ۔" صبیحہ بیگم نے بیٹی کو پیار سے سمجھایا تو عرشی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"عورت کو زندگی میں ہمیشہ مرد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور سب سے مضبوط سہارا مرد، عورت کے لئے دو ہی رشتوں میں بنتا ہے... ایک باپ کا سہارا... اور دوسرا شوہر کا سہارا..." صبیحہ بیگم نے پُرسوچ انداز میں کہا تھا۔

"آپ جو کہہ رہی ہیں بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں امی... مجھے آپکی نیت پہ کوئی شک نہیں۔ ماں باپ سے زیادہ اچھا اولاد کے لئے کوئی اور نہیں سوچ سکتا۔ مجھے آپکے فیصلوں پہ نہ کبھی کل اعتراض تھا اور نہ آج ہے۔" عرشیہ نے ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے وثوق سے کہا تو صبیحہ بیگم مسکرا دیں۔

"تم خوش رہو اور مسکراتی رہو... بس یہی تمنا ہے میری اور تمہارے ابو کی۔"

"میں خوش ہوں امی جان... کیونکہ یہ میرے ماں باپ کا فیصلہ ہے۔" عرشی نے کہا اور بڑھ کر ماں کو گلے سے لگا لیا۔ چند آنسو پلکوں تک آ کر لوٹ گئے تھے اور سب ملال بھی ساتھ ہی چلا گیا تھا۔ اب جو بھی تھا عرشیہ نے اُسے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ دل لاکھ بین کرتا لیکن وہ اپنے مقدر سے بغاوت کرتی بھی تو کہاں جاتی... سو اس نے سارے ہتھیار ڈال کر خود کو قسمت کے دھارے پہ چھوڑ دیا تھا۔

☆......☆......☆

عرشیہ سکول کی پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے اندر جانے ہی لگی تھی کہ اچانک اُسکی نظر گاڑی میں بیٹھی ہوئی نائمہ پہ پڑی تو وہ چونک گئی کیونکہ نائمہ تو بس میں یہاں تک آتی تھی اور اُسکے گھر میں کوئی بھی گاڑی نہیں تھی۔ "پھر یہ کون تھا جسکے ساتھ نائمہ گاڑی سے اتری ہے...؟" عرشیہ نے سوچا تھا۔ اور نائمہ کے اندر جانے کے بعد وہ بھی سکول کی عمارت میں داخل ہو گئی تھی۔ سٹاف روم میں پہنچی تو نائمہ وہاں پہلے سے اسکی منتظر تھی۔

"شکر ہے تم آ گئی ورنہ مجھے لگ رہا تھا آج بھی چھٹی کر لوگی۔" نائمہ نے خوشگواری سے کہا تو عرشیہ نے اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خیر تو ہے آج موڈ کچھ زیادہ ہی خوشگوار ہے...؟"

"کیا مطلب... میں تو روز ہی ایسی ہوتی ہوں... کیوں کیا ہوا؟" نائمہ عرشیہ کے سوال پہ گڑبڑا سی گئی جیسے اُسکی چوری پکڑی گئی ہو۔

"اب تم یہ ڈرامے بازی بند کرو... اور مجھے سیدھی طرح بتاؤ کہ آج کل کون پک اینڈ ڈراپ سروس دے رہا ہے...؟" عرشیہ نے

زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ... تو اسکا مطلب تم نے دیکھ ہی لیا آخر..." نائمہ نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"جی بالکل.. چاند چڑھتا ہے تو دنیا کو نظر آ ہی جاتا ہے۔" عرشیہ نے طنزیہ بولا اور ہنس دی۔

"اچھا اب طعنے تو نہیں مارو یار۔" نائمہ نے شرمندگی سے کہا۔

"بکواس نہیں کرو... اور چلو سیدھی طرح بتاؤ کون تھا وہ مسٹر رچی رچ؟" عرشیہ نے اُسے چھیڑتے ہوئے کہا تو نائمہ کچھ شرما سی گئی۔

"وہ عرفان تھا... ہمارے پڑوس میں جو چوہدری صاحب کی حویلی ہے ناں بڑی سی... وہاں رہتا ہے اُنکا بھانجا ہے قصور سے آیا ہے یہاں لاہور میں لاء کی ڈگری حاصل کرنے۔" نائمہ نے تفصیلاً بتایا۔

"واہ جی واہ... کیا بات ہے آپکی... وہ بیچارہ یہاں وکیل بننے آیا تھا اور آپ نے اُسے مجرم محبت میں مبتلا کر کے مجرم بنا دیا۔" عرشیہ نے اُسے بھرپور چڑانے کی کوشش کی تھی اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اچھا پھر بتاؤ کب تک مٹھائی کھلاؤ گی؟"

"انشاءاللہ بہت جلد... بس تم دعا کرنا کہ اُسکے گھر والے مان جائیں جلد از جلد۔"

"کیا مطلب... ظالم سماج کی دیوار بھی کھڑی ہوگئی ہے؟"

"ہاں یار... بس وہی امیری غریبی کا فرق... سٹیٹس.. خاندان... ذات پات وغیرہ وغیرہ"

"یہ تو بڑا مسئلہ بن جائے گا نائمہ... کیا وہ ایسے حالات میں تمہارا ساتھ دے پائے گا؟"

"ہاں ضرور دے گا... مجھ سے محبت کرتا ہے تو کیا میرے لئے دنیا سے نہیں لڑے گا...؟"

نائمہ نے پورے وثوق سے کہا تھا۔

"دیکھ لو نائمہ... تمہیں اتنی جلدی اُس پہ ایسا اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ مرد ذات کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔" عرشیہ نے نائمہ کو محتاط کرنا چاہا تھا۔

"میں تو بس اتنا جانتی ہوں کہ میں صرف عرفان سے ہی شادی کروں گی... کیونکہ میں غربت زدہ زندگی نہیں گزارنا چاہتی... میں نہیں چاہتی کہ میرے ماں باپ اپنے جیسے کسی غریب خاندان میں مجھے جھونک دیں اور میری ساری زندگی یہ ہزار، پانچ سو کے نوٹ جوڑتے ہوئے گزر جائے۔" نائمہ نے بیزار لہجے میں جواب دیا تھا۔

"دیکھو نائمہ تم میری دوست ہو اور تمہیں ہر خطرے سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ یار لڑکے بہت فلرٹ بھی ہوتے ہیں خاص طور پہ امیر گھرانوں کے لڑکے... تمہیں اس پہ اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

"عرشی اُس نے مجھے خود کہا ہے کہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور صرف مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے... اور مجھے پانے کے

لئے وہ ہر کسی سے لڑ سکتا ہے... وہ فلرٹ نہیں ہے۔"

"یار میں یہ نہیں کہہ رہی کہ وہ ہے ہی فلرٹ... لیکن ایسا ہو سکتا ہے اسلئے تم محتاط رہو اُس سے ملاقاتوں میں۔ کسی پہ بھی اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔"

"ہاں شاید تم سچ کہہ رہی ہو۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ مجھے کبھی دھوکا نہیں دے سکتا۔"

"خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن میرا مشورہ یہی ہے نائمہ کہ تم احتیاط سے کام لو... کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تمہاری معصومیت اور غربت کا ناجائز فائدہ اٹھالے۔" عرشیہ نے اُسے مخلصانہ مشورہ دیا۔

"اچھا بڑی بی... سمجھ گئی میں۔" نائمہ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا تو عرشیہ ہنس دی۔

"اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری شادی کی تیاریاں کہاں تک پہنچی ہیں؟" نائمہ نے پوچھا تو عرشیہ کے چہرے پہ یک دم سنجیدگی چھا گئی۔

"ہو رہی ہیں تیاریاں بھی... کچھ دن تک کارڈز بھی چھپ کر آجائیں گے۔" عرشیہ کا لہجہ تھکا تھکا سا تھا۔

"چلو تم تو پیا گھر سدھار جاؤ گی جلدی ہی..." نائمہ نے مسکراتے ہوئے اُسے چھیڑا تھا۔

"ہاں سو کال لڈ پیا..." عرشیہ نے دل جلے انداز میں کہا۔ اتنے میں اگلے پیریڈ کی بیل بج گئی اور دونوں اپنی اپنی کلاس میں لیکچر دینے چلی گئیں۔ اگلے مہینے عرشیہ کی رخصتی تھی جسکی تیاریوں میں ہر کوئی ذوق وشوق سے حصہ لے رہا تھا۔ عرشیہ کے والدین نے تیمور کو کاروبار وسیع کرنے کے لئے ایک بڑی رقم بھی ادا کر دی تھی تاکہ جب اُنکی بیٹی رخصت ہو کر اپنے گھر جائے تو اُسے کسی چیز کی کمی نہ ہو۔ جیسے جیسے شادی کے دن قریب آرہے تھے عرشیہ کے دل و دماغ میں اُٹھتے خدشات بھی بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔ جب سے نکاح ہوا تھا تیمور نے کبھی اُس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اکثر نائمہ کے پوچھنے پہ بھی وہ شرمندہ سی ہو جاتی تھی۔ اُسکی سمجھ میں خود نہیں آتا تھا کہ تیمور نے کبھی اُس سے رابطے کی کوشش کیوں نہیں کی کبھی اُسکا حال تک پوچھنا گوارا نہیں کیا... آخر کیوں؟ عرشیہ کے دل میں بہ در کر سوال اُٹھتے تھے۔

"دنیا بھر کے منگیتر اپنی ہونے والی بیویوں سے رابطے میں رہتے ہیں اور پورا پورا حق جتاتے ہیں اُن پہ... اور ایک تمہارا شوہر ہے جسکو اپنی منکوحہ سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے۔"

نائمہ کے الفاظ عرشیہ کے کانوں میں نشتر کی طرح چبھنے لگتے تھے۔ اور ایک ہی بات عرشیہ کے ذہن و دل میں گونجنے لگتی تھی "جس شخص نے پیسے لے کر شادی کی ہے مجھ سے اُسے اور کیا سروکار ہوگا میری ذات سے...؟ شاید اُسے جو چاہیے تھا مل چکا ہے۔" رنج والم کی ایک شدید لہر اُسکے پورے وجود کو اپنی لپیٹ لیتی تھی۔ لیکن جو بھی تھا اُسے یہ قبول کرنا ہی تھا۔ اور پھر ایک موہوم سی اُمید بھی تھی کہ شاید یہ سب اُسکا وہم ہی ہو اور سب کچھ ویسا نہ ہو جیسا وہ سوچ رہی ہے۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تیمور آج کل کے لڑکوں جیسی سوچ نہ رکھتا ہو اسلئے اُس نے مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا کہ رخصتی کے بعد ہی انڈر سٹینڈنگ ڈیولپ کی جائے تاکہ کوئی غلط فہمیاں پیدا نہ ہوں۔" عرشیہ اکثر سوچا کرتی تھی۔ اور نہ جانے کیا کیا خیالات تھے جو اُسکے دل

دو ماغ کو گھیرے رکھتے تھے۔ حالات اور تقدیر کب انسان کی سوچ کے مطابق چلتے ہیں اُنکے فیصلے تو اوپر ہی طے ہوتے ہیں اور انسان اُسی حصار میں گھومتا رہتا ہے جس میں اُسے قید کیا گیا ہوتا ہے۔

☆......☆......☆

چھوٹے سے گھر کے سب سے بڑے کمرے میں دلہن بنی بیٹھی عرشیہ حیران نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ کمرے میں اُسکے والدین کی طرف سے جہیز میں دیا گیا سامان بمشکل پورا آیا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سب کچھ عرشیہ کے اوپر ہی آ گرے گا۔ اپنا نازک کلی جیسا روپ سمیٹے وہ بیڈ پہ سمٹ کر بیٹھی تیمور کا انتظار کر رہی تھی۔ پھولوں کی مسہری سے پھوٹنے والی خوشبو ہر طرف کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور ایک مدھم سی روشنی پورے ماحول کو خوابناک بنا رہی تھی۔ رخصت ہو کر تیمور کے گھر پہنچ کر اُسکی بہنیں عرشیہ کو اس کمرے میں بٹھا کر خود چلی گئیں تھیں اور تب سے اب تک وہ تیمور کا انتظار کر رہی تھی۔ تھکن سے اُسکا برا حال تھا لیکن انتظار کے لمحات تھے کہ ختم ہونے کو نہیں آ رہے تھے۔ ابھی عرشیہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ عرشیہ نے دیکھا تو تیمور اندر داخل ہو رہا تھا۔ عرشیہ نے اُسے دیکھ کر نظر جھکائی تھی۔ تیمور کے چہرے پہ وہی صدا کی بے زاری ٹپک رہی تھی اور شادی کی خوشی اُسکے کسی انداز سے بھی جھلکتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ پورے فنکشن میں تیمور کے پہلو میں بیٹھے ہوئے عرشیہ نے ایک بار بھی اُسکے وجود سے اپنے لئے اُنسیت محسوس نہیں کی تھی۔ تیمور خاموشی سے آ کر اُسکے سامنے بیٹھ گیا تھا اور عرشیہ کو یوں لگا جیسے اُسکا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا ہو۔

''یہ تمہاری منہ دکھائی کی انگوٹھی ہے۔'' تیمور نے انگوٹھی عرشیہ کے ہاتھ میں پہناتے ہوئے کہا تھا۔

''تھینک یو۔'' عرشیہ نے ہلکی سی آواز میں کہا۔

''یقیناً تمہیں پسند تو نہیں آئی ہوگی۔۔؟'' تیمور کا لہجہ کاٹ دار تھا۔ عرشیہ نے چونکتے ہوئے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔

''نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔آپ نے ایسے کیوں بولا؟'' عرشیہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا جیسے اُسے سمجھ نہ آ رہی ہو کہ وہ تیمور کی اس طرح یہ بات پہ کیسے ری ایکٹ کرے۔

''عام سی انگوٹھی ہے ناں۔۔۔ بالکل میری طرح۔ تو جیسے میں تمہیں پسند نہیں آیا تھا تو یقیناً میری دی ہوئی یہ انگوٹھی جو تمہارے سٹینڈرڈ کی بھی نہیں کیسے پسند آ سکتی ہے؟'' تیمور کی نظروں میں عجیب سا تاثر تھا۔

''یہ سب آپکو کس نے کہہ دیا؟ میں تو ایسی بات سوچ بھی نہیں سکتی۔۔'' عرشیہ نے کہا۔

''تم تو یہ بھی نہیں سوچ سکتی ہوگی کہ مجھ جیسا انسان تمہاری زندگی میں آئے گا۔۔۔ تمہیں کتنی شرمندگی ہو رہی تھی ناں مجھے اپنے پہلو میں بیٹھے دیکھ کر۔۔۔ ہے ناں؟'' تیمور کا لہجہ مزید کاٹ دار ہوتا جا رہا تھا۔ عرشیہ کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اُسکی باتوں کا جواب دے۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔۔۔ یہ سب آپکا وہم ہے۔'' عرشیہ نے تیمور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو یہ میرا وہم ہے۔۔۔ تو پھر بتاؤ نکاح والے دن تمہاری وہ حالت کیوں تھی پھر؟ تمہارے چہرے پہ خوشی کے بجائے ملال

کیوں تھا...؟ تمہاری آنکھوں میں میرے لئے وحشت کیوں تھی... بولو؟" تیمور تقریباً چیخ رہا تھا اور عرشیہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسکی طرف دیکھ رہی تھی اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ سہاگ رات پر کوئی دولہا اپنی دلہن سے ایسی باتیں بھی کر سکتا ہے۔

"ایسا کچھ نہیں تھا... سب کچھ اچانک اتنی جلدی میں ہو رہا تھا کہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا... بس اسی لئے میں تھوڑا حیران تھی لیکن ایسا کچھ نہیں جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔" عرشیہ کو اب رونا آنے لگا تھا۔

"جھوٹ بولتی ہو تم... صاف ظاہر ہے کہ تم نے کسی مجبوری میں مجھ سے شادی کی ہے۔ ورنہ تم جیسی خوبصورت اور امیر خاندان کی اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی مجھ جیسے کمتر، کم شکل اور معمولی انسان سے کیوں شادی کرے گی...؟" تیمور اُس پہ چلا رہا تھا اور عرشیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"شششش... خبردار جو میرے سامنے یہ آنسو بہانے کی کوشش بھی کی تو..... اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ تمہارے یہ آنسو مجھ پہ کچھ اثر کرینگے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں عورتوں کے ان ہتھکنڈوں کو اچھی طرح جانتا ہوں... مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" تیمور نے بے حسی سے کہا تھا۔

"بتاؤ کیوں شادی کی ہے تم نے مجھ سے...؟ کیا مجبوری تھی تمہاری...؟" تیمور اپنے سوال پہ قائم تھا۔

"میرے ماں باپ نے جو میرے لئے بہتر سمجھا وہ کیا... میری کوئی مجبوری نہیں تھی۔" عرشیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"اوہ... پھر تو تمہارے والدین نے بڑی زیادتی کر دی تمہارے ساتھ... مجھ جیسے شخص کو تمہارا شوہر بنا دیا جسکے ساتھ چلتے ہوئے بھی تم شرمندگی محسوس کرتی ہو گی۔"

تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا تو عرشیہ کا دل چاہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے لیکن وہ بے بس تھی اسلئے سر جھکا کر بیٹھی رہی۔ تیمور نے پھر نہ جانے کیا سوچ کر عرشیہ کا ہاتھ تھام لیا تھا اور بہت ہی غور سے اپنی دی ہوئی انگوٹھی کو دیکھنے لگا۔

"دیکھو یہ انگوٹھی بھی بیچاری تمہاری حسین انگلی میں کتنی حقیر لگ رہی ہے.... بالکل ایسے جیسے تم جیسی حسین لڑکی کے پہلو میں بیٹھا ہوا میں لگتا ہوں... حقیر اور بے وقعت..."

"میرے نزدیک شکل وصورت کی نہیں بلکہ انسان کے کردار اور صفات کی اہمیت ہے۔ اگر جیون ساتھی کا مزاج اچھا ہو تو زندگی اچھی گزر جاتی ہے چاہے وہ امیر ہو یا غریب، خوبصورت ہو یا عام صورت پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... اگر دونوں کی انڈرسٹینڈنگ ہو... دونوں میں محبت ہو... تو باقی چیزوں کی اہمیت نہیں رہتی۔" عرشیہ نے اُسے سمجھانا چاہا تھا۔

"تمہاری آنکھوں میں جو ملال تھا اُسے دیکھ کر لگتا تو نہیں کہ تمہاری سوچ اتنی مہان ہو گی۔" ایک اور خنجر عرشیہ کے دل کو چیر گیا تھا۔

"آپ مجھے جانتے ہی کتنا ہیں...؟ اگر آپ نے مجھ سے آج سے پہلے کبھی بات کی ہوتی تو شاید آپکو میری سوچ اور کردار کا اس سے بہتر اندازہ ہوتا۔"

"نکاح کے دن تمہارے تاثرات دیکھ کر اندازہ ہو گیا تھا مجھے۔ میں نے جان بوجھ کر تم سے کبھی بات نہیں کی تا کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تم جیسی حور پری اگر میری بیوی بن گئی ہے تو میں تمہارا غلام بن جاؤں گا۔"

تیمور کے منہ سے الفاظ نہیں نشتر برس رہے تھے جو عرشیہ کی نازک روح کو چھلنی کئے دے رہے تھے۔ عرشیہ کو لگا کہ صبر اور برداشت کی حدود تو شاید اب شروع ہوئیں ہیں پہلے جو صبر کیا تھا وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ عرشیہ اسکی بات کے جواب میں کچھ بھی بول نہ سکی تھی بس چپ چاپ اسکی آنکھوں میں دیکھتی رہی جیسے اسکے لفظوں کی سچائی کو اسکی نگاہوں سے جانچنا چاہ رہی ہو۔ تیمور اپنی شیروانی کو اتارتا ہوا خود واش روم میں چلا گیا اور عرشیہ وہیں بیٹھی سوچتی ہی رہ گئی کہ آخر اسے اب ایسی پیچیدہ سوچ رکھنے والے انسان کے ساتھ کس طرح گزارا کرنا ہے۔ ساری سوچوں کو جھٹک کر عرشیہ اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ایک ایک کر کے زیور اتارنے لگی۔ عرشیہ کے انداز میں پہلی رات کی دلہن والی شوخی اور خوشی کے بجائے میدان جنگ میں بری طرح شکست کھانے والے کی سی حالت تھی جو ایک ایک کر کے اپنے تمام ہتھیار جنگ جیتنے والے کے سامنے اتار پھینکتا ہے۔ عرشیہ اس ناکام جنگجو کی طرح خود کو محسوس کر رہی تھی جسے مد مقابل نے بری طرح پچھاڑا تھا۔ ایک بار پھر زندگی نے اسے آزمائش سے دوچار کر دیا تھا۔ شدید گھٹن کے احساس سے اسکا دم گھٹ رہا تھا۔ آئینے میں اپنے خوبصورت چہرے کو دیکھ کر اسے پہلی بار افسوس ہوا تھا۔ آج پہلی بار عرشیہ کو اپنے حسین ہونے پہ شرمندگی سی ہوئی تھی۔ یہ خوبی بھی جیسے اسکے لئے سب سے بڑی برائی ثابت ہوئی تھی۔ عرشیہ کی کوئی خوبی بھی تیمور کو متاثر نہیں کر سکی تھی یا شاید وہ متاثر تو ہوا تھا لیکن منفی انداز میں۔ اس نے عرشیہ کی ہر خوبی کو اپنے مقابل سمجھ کر رد کر دیا تھا۔ اور یہ بات سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی۔ عرشیہ نے تمام زیور اتار لیا تھا اب صرف عروسی جوڑے کا بدلنا باقی تھا۔ اتنے میں تیمور فریش ہو کر آ چکا تھا۔ عرشیہ اسے دیکھ کر جہاں کھڑی تھی بس وہیں کھڑی رہی کیونکہ اسکی آنکھوں میں عجیب سی چمک اور تاثر تھا جس سے عرشیہ کو خوف محسوس ہوا تھا۔ تیمور کی نظروں میں ایسی چمک تھی جیسی شکار کو دیکھ کر شکاری کی آنکھوں میں آ جاتی ہے۔ وہ آہستہ سے اسکے قریب آ رہا تھا اور عرشیہ دل اس شدت سے دھڑک رہا تھا جیسے بلی کو شکار ہونے والے کبوتر کا دل دھڑکتا ہے۔

☆......☆......☆

ہلکی ہلکی آوازوں سے عرشیہ کی گہری نیند ٹوٹی تھی۔ کھڑکی کے پردوں سے جھانکنے والی صبح کی روشنی اسکی پلکوں کو چھو رہی تھی۔ عرشیہ نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ عرشیہ اٹھنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے پورے جسم میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ کچھ دیر یونہی لیٹے رہنے کے بعد عرشیہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ تیمور شاید پہلے سے اٹھ چکا تھا اور اب کمرے میں نہیں تھا۔ عرشیہ بیڈ سے اتر کر کھڑی ہوئی تو سامنے رکھی سنگھار میز کے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی۔ گردن اور بازوؤں پہ پڑے ہوئے نیلے نشان رات بھر اس پہ گزرنے والی داستان کہہ رہے تھے۔ دو آنسو عرشیہ کے رخساروں پہ بہہ نکلے تھے۔ وہ عجیب سے احساس سے گزر رہی تھی۔ رات بھر جو رویہ تیمور نے اسکے ساتھ رکھا تھا وہ ویسے سلوک کے قابل تو نہ تھی۔ وہ تو پھولوں میں رکھے جانے کے قابل تھی پھر تیمور نے اس کے ساتھ

ایسا کیوں کیا۔وہ کوئی استعمال کی چیز تو نہیں تھی جسے اس بری طرح سے ضرورت کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔عرشیہ کو بہت رونا آ رہا تھا۔وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ کچھ دیر آنسوؤں سے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد وہ واش روم میں فریش ہونے چلی گئی۔تیار ہو کر عرشیہ کمرے سے باہر نکلی تو نیچے لاؤنج میں ہونے والی ساری گفتگو صاف سنائی دے رہی تھی۔

''خود اپنی شادی کر کے بیٹھ گئے ہو آپ تیمور بھائی۔آپکو ہماری کیا پرواہ ہے؟'' تیمور کی چھوٹی بہن فرزانہ بول رہی تھی۔

''میں خود تو نہیں کر کے بیٹھا...تم سب کی بھی یہی خواہش تھی اور تم سب نے اپنے اپنے فائدے دیکھ کر ہی کی ہے میری شادی..'' تیمور نے کہا۔

''تو کیا نقصان کیا تمہارا..؟اتنے امیر گھر کی حسین لڑکی سے شادی کروائی ہے تمہاری ساری زندگی عیش کرو گے۔'' تیمور کی ماں نے کہا۔

''ارے چھوڑیں امی ...اسکو کیا قدر ان سب باتوں کی...میری طرح بیٹھا بیٹھا بوڑھا ہو جاتا تب اسے قدر آنی تھی۔'' تیمور کی بڑی بہن شبانہ نے دل جلے انداز میں کہا تھا۔عرشیہ کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کس بات پہ جھگڑ رہے تھے اور یہ کیسی عجیب سی بحث میں الجھے ہوئے تھے۔

''ہاں تو نہ کرتے میری شادی اگر اب تم لوگوں سے ہضم نہیں ہو رہا تو...میں نے تو نہیں کہا تھا کہ کرو تم لوگوں کو خود ہی کوئی جنون چڑھا تھا میری شادی کا۔'' تیمور نے چڑ کر بلند آواز میں کہا تھا۔

''ارے کم بخت کہیں کے...ایک دن ہوا ہے شادی کو اور بہنوں پہ چلانے لگا ہے تو..خدا کا خوف کر کچھ یتیم بہنوں کو برا بھلا کہہ رہا ہے باپ کو قیامت کے روز کیا منہ دکھائے گا۔''

تیمور کی ماں نے اُسے کوسا تھا۔عرشیہ کا دماغ گھوم رہا تھا اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کس قسم کے لوگ ہیں اور کیسی باتیں کر رہے ہیں۔اتنے میں گھر کی گھنٹی بجی تھی اور تیمور باہر نکل گیا تھا۔تھوڑی دیر بعد عرشیہ نے اپنے گھر والوں کی آوازیں سنی تھیں۔اُسے لگا جیسے اسکی جان میں جان آ گئی ہو۔عرشیہ کو شادی کے اگلے روز ناشتہ لیکر جانے کی رسم بہت بری لگتی تھی لیکن آج اُسے اس رسم کا مقصد اور اسکی اہمیت کا اندازہ ہوا تھا۔اُس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔عرشیہ جلدی سے کمرے میں واپس آ گئی تاکہ کوئی اوپر آئے تو اُسے پتہ نہ لگے کہ اُس نے کوئی بات سنی ہے۔عرشیہ نے میک اپ فاؤنڈیشن سے اپنی گردن اور بازوؤں پہ پڑے نیلے نشان چھپانے لگی۔

تیمور کمرے میں داخل ہوا تو عرشیہ کو لگا کہ شاید اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گا۔وہ اُسکے پیچھے کھڑا آئینے میں اُسے دیکھنے لگا۔

''نیچے تمہارے گھر والے آئے ہیں...جلدی تیار ہو کر آجاؤ۔اور اپنے چہرے پہ جو تاثر ہونا چاہیے وہی رکھنا...'' تیمور نے ڈھٹائی سے کہا تو عرشیہ اُسے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی جیسے یقین نہ کر پا رہی ہو کہ کوئی ایسا بھی بے حس ہو سکتا ہے۔

''آئی سمجھ...؟'' تیمور نے اُسے خاموش پا کر پوچھا تھا۔عرشیہ صرف سر ہی ہلا سکی تھی۔

"تیار ہو تو چلو میرے ساتھ۔" تیمور نے اُسے حکم دیا تھا اور وہ چپ چاپ اُسکے ساتھ چل دی۔

"اسلام وعلیکم۔" عرشیہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے سب کو سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔جیتی رہو میری بچی۔" امی ابو نے کھڑے ہو کر عرشیہ اور تیمور کا استقبال کیا تھا۔شیراز بھائی اور بھابھی بھی ساتھ تھے۔تیمور شیراز بھائی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔

"تم کیسی ہو عرشی؟" بھابھی نے پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بھابھی۔" عرشیہ بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔لیکن سامنے بیٹھی صبیحہ بیگم کی سوالیہ نظروں نے عرشیہ کو خوفزدہ سا کر دیا تھا۔اُنکی نظریں عرشیہ سے اُسکی خوشی کے بارے میں سوال کر رہی تھیں جسکا اُسکے پاس کوئی مثبت جواب نہیں تھا اسلئے وہ نظریں چُرا گئی۔

"ناشتہ لگ چکا ہے سب لوگ ڈائننگ ٹیبل پہ آجائیں۔"

ملازمہ نے آکر اطلاع دی تھی اور سب لوگ ناشتے کی میز پہ بیٹھ گئے تھے۔تیمور نے ایک نظر التفات بھی عرشیہ پہ ڈالنا پسند نہیں کی تھی۔وہ جیسے اپنی ہی ذات میں مگن تھا اور اُسکے وجود سے شادی کے پہلے دن کی سی کیفیت کا کوئی گزر نہیں تھا۔عرشیہ کو اپنا وجود ایک پیاسے صحرا کی مانند محسوس ہوا تھا جس پر سے بادل بغیر مینہ برسائے ہی گزر گیا ہو اور وہ بارش کی ایک بوند کو بھی ترستی رہ گئی ہو۔بے بسی کی انتہا تھی کہ چہرے پہ خوشیوں کے رنگ سجانے تھے اور دل تھا کہ اپنی حسرتوں پہ ماتم کناں تھا۔ناشتے کے بعد سب لوگ جانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"اچھا جی اب ہمیں اجازت دیں۔شام کو ملاقات ہوگی۔" احمد صاحب نے کہا تھا۔

"جی بھائی صاحب۔۔۔بہت شکریہ۔" تیمور کی ماں نے کہا تھا لیکن تیمور کا رویہ عرشیہ کے گھر والوں کے ساتھ بھی کچھ اُکھڑا سا تھا۔عرشیہ کو اسکا ایسا مغرور اور خود پسند رویہ بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔اُسکا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی اور اسی وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ لوٹ جائے لیکن مجبوری اُسکے پیروں میں زنجیر بن گئی تھی اور وہ بے بسی سے اپنے ماں باپ کو جاتا تکتی رہ گئی۔

☆......☆......☆

ہم تیرے آس پاس ہی تھے
لیکن تیرے التفات کو ترسے......

کبھی کبھی زندگی انسان کو بڑے ہی المناک موڑ پہ لا کھڑا کرتی ہے۔اُس موڑ پہ واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور پیروں تلے زمین بھی دلدل کی طرح ہوتی ہے جس میں انسان دھنستا ہی چلا جا رہا ہوتا ہے۔عرشیہ کی زندگی بھی ایسے ہی کسی گرداب میں پھنس سی گئی تھی۔جہاں وہ صرف دکھ اور حسرتوں کی دلدل میں دھنستی ہی جا رہی تھی۔وہ نکلنا بھی چاہتی تو کون اُسے نکالتا اسکا تو ہم سفر ہی اُسکی ذات سے بیگانہ تھا۔اُسے تو اُسکے وجود سے کوئی لگاؤ ہی نہیں تھا۔ایسی سرد مہری اور لاتعلقی شاید ہی کبھی کسی نے اپنے جیون ساتھی سے روا رکھی ہو

جیسی تیمور نے عرشیہ سے رکھی تھی۔ تیمور کے اپنے ہی دن رات تھے وہ جب چاہتا تھا گھر سے چلا جاتا تھا اور جب چاہتا تھا رات گئے واپس لوٹ آتا تھا۔ عرشیہ اُسکی بیوی تھی لیکن یوں جیسے دو اجنبیوں کو ہمسفر بنا دیا گیا ہو جنکی منزلیں اور راستہ دونوں ہی جدا جدا ہوں۔ آج بھی تیمور آفس سے گھر لوٹا تو رات کا ایک بج رہا تھا۔ کمرے میں آ کر ایک نگاہ بے پرواہ عرشیہ پہ ڈالتا ہوا وہ واش روم کی طرف چلا گیا تھا۔ کچھ دیر بعد سائیڈ ٹیبل پہ پڑا ہوا اُسکا موبائل فون بجنے لگا تو عرشیہ نے اُٹھا کر دیکھا۔ سکرین پہ کسی 'مونا' کا نام چمک رہا تھا۔ عرشیہ نے دیکھ کر موبائل واپس سائیڈ ٹیبل پہ ویسے ہی رکھ دیا۔ "تو یہ وجہ ہے اس لاتعلقی کی..." عرشیہ نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ عرشیہ اپنی جگہ بیٹھی رہی جیسے اُسے کوئی سروکار نہ ہو۔ تیمور واش روم سے نکل کر اپنی ماں کو کمرے کی طرف چل دیا اور عرشیہ اُسے جاتا دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد پھر سے تیمور کا موبائل بجنے لگا۔ عرشیہ نے جلدی سے موبائل کو اُٹھا کر دیکھا تو دنگ رہ گئی۔ ایک عجیب سا نام سکرین پہ جگمگا رہا تھا 'دل رُبا'۔ نا جانے کیا سوچ کر اُس نے کال ریسیو کر لی اور بغیر کچھ بولے سننے لگی۔ ایک نسوانی آواز میں کہے گئے جملے نے عرشیہ کو شدید ذہنی جھٹکے سے دوچار کیا تھا۔

"تیمور صاحب.. کہاں مصروف ہیں..؟ ہمارے گھر کی در و دیوار آپکے لئے بے حد اُداس ہیں آپ نہیں آئے تو کوئی ساز بھی نہیں بجا کل سے..." انتہائی بازارو لہجے میں کہے گئے الفاظ نے

عرشیہ کے پورے وجود میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اُسے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے ری ایکٹ کرے اس بات پہ... خاموش تماشائی بنی رہے یا پھر تیمور سے سوال کرے۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ تیمور کے آنے کی آواز آئی تھی۔ اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لیٹ گئی جیسے سو رہی ہو۔ عرشیہ نے محسوس کیا جیسے تیمور اُسکے سر پہ آ کھڑا ہوا ہے۔ وہ آنکھیں موندے لیٹی رہی۔ اچانک ہی تیمور نے اُسے بازو سے کھینچ کر اُٹھا کر بیٹھا دیا اور عرشیہ حیرانگی سے اُسے تکنے لگی۔

"سونے کا ناٹک اسلیئے کر رہی ہو کہ میری شکل نہ دیکھنی پڑ جائے تمہیں..؟" تیمور نے پوچھا

"نہیں تو... لیٹے لیٹے میری آنکھ لگ گئی تھی۔" عرشیہ نے کہا۔

"امی بتا رہی تھیں کہ تم گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی..؟" تیمور نے پوچھا تو عرشیہ اُسکو حیرت سے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں سوچا کہ ابھی شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔

"جی.. وہ مجھے کسی نے کہا ہی نہیں کسی کام کے لئے.. اور ابھی چلھے کی رسم بھی نہیں ادا کی تو اسلیئے میں نے خود سے کوئی کام نہیں کیا۔" عرشیہ نے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"یہ سب فضول رسم و رواج میرے گھر میں نہیں چلتے آئی سمجھ.. کل سے کچن کے تمام کاموں کی ذمہ داری تمہاری ہے۔" تیمور نے تحکمانہ لہجے میں کہا تھا۔

"جی ٹھیک ہے۔" عرشیہ نے معصومیت سے کہا۔

"امی کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ جو کام کرنا اُن سے پوچھ کر اُنکی مرضی کے مطابق کرنا۔" تیمور نے پھر سے نصیحت کی تھی

اور عرشیہ نے ہاں میں سر ہلایا تھا۔ اسکے بعد تیمور اپنی جگہ پہ دوسری طرف کروٹ لیکر سو گیا اور عرشیہ بیٹھی سوچتی ہی رہی کہ کیا سب شوہر تیمور جیسے ہوتے ہیں۔ اُسے یاد آ رہا تھا کہ جب شیراز بھائی کی شادی ہوئی تھی تو وہ بھابھی کے کتنے نخرے اُٹھاتے تھے اور کتنے لاڈ اور پیار جتاتے تھے اُن پر جب وہ نئی نئی دلہن بن کر آئیں تھیں تو سب گھر والے اُنکے کیسے چاؤ کرتے تھے۔ اور ایک عرشیہ کا سسرال تھا کہ جہاں کوئی اُس سے سیدھے منہ بات تو دور کی بات تھی نظر بھر کر دیکھتا بھی نہیں تھا۔ یوں جیسے وہ کوئی ڈیکوریشن پیس تھی جسے گھر میں لا کر ایک کونے میں لگا کر سب اُسے دیکھنا بھول گئے تھے۔ عرشیہ کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگے اور سسکیاں جیسے کہیں دل کی گہرائی سے نکل رہیں تھیں۔ اُسکے رونے کی آواز سے تیمور کی آنکھ کھل گئی اور وہ اُٹھ کر اُسے دیکھنے لگا جیسے بے حد کوفت محسوس کر رہا ہو۔

"کیوں رو رہی ہو...؟" ناگواری سے تیمور نے پوچھا۔

"بس ایسے ہی..." عرشیہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"یہ عورتیں بھی ناں... ذرا کام کرنے کو کہہ دو تو موت پڑنے لگتی ہے انکو..." تیمور نے غصے سے کہا تھا۔

"میں کام کی وجہ سے نہیں روئی۔" عرشیہ نے کہا۔

"پھر کیا تکلیف ہے تمہیں...؟" تیمور نے بے حسی سے کہا۔

"کوئی تکلیف نہیں.. سو جائیں آپ۔" عرشیہ نے خفگی سے کہا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو.... مجھے عورتوں کے آنسوؤں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ میں اُن مردوں میں سے ہوں جنکو عورت کے آنسو کمزور کر دیتے ہیں تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔" تیمور نے ڈھٹائی سے کہا۔

"مجھے ایسی کوئی غلط فہمی نہیں اور نہ ہی یہ آنسو آپکو دکھانے کے لئے ہیں۔" عرشیہ نے کہا۔

"تو پھر اب تمہاری رونے کی آواز نہ آئے مجھے.... اور اگر زیادہ دل چاہ رہا ہے رونے کو تو باہر جا سکتی ہو۔" تیمور نے کہا اور پھر سے منہ موڑ کر سو گیا۔

صبح ہوتے ہی عرشیہ کچن میں تیمور کے لئے ناشتے کی تیاری کرنے لگی تو اُسکی ساس بھی آ کر اُسے دیکھنے لگی۔

"امی آپ کیا ناشتہ کریں گی؟" عرشیہ نے ساس کو سلام کرنے کے بعد پوچھا تھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ کچن میں آ کر یہ سب کام کرو؟" ساس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"جی.. وہ تیمور نے مجھے کہا ہے کہ آج سے کچن کی ساری ذمہ داری میری ہے۔"

"اچھا... تیمور نے کہا اور تم شروع ہو گئی..؟ تمہیں کسی نے کچھ نہیں بتایا کہ رسم و رواج کیا ہوتے ہیں؟"

"کیسے رسم و رواج امی...؟"

"میری اجازت کے بغیر تم کچن میں آئی ہی کیوں؟"

"مجھے تیمور نے کہا تھا اس لئے..."

"دیکھو تو کیسے زبان چلائے جا رہی ہے..." ساس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا تو عرشیہ حیرت سے تکنے لگی۔

"امی میں تو آپکے سوال کا جواب دے رہی ہوں زبان کیوں چلاؤں گی؟"

"کیا ہوا امی؟ کیا بات ہے؟" شبانہ جمائی لیتے ہوئے کچن میں آئی تھی۔

"دیکھو ذرا کیسے زبان چلا رہی ہے میرے ساتھ... ہائے میری کوئی عزت ہی نہیں..." تیمور کی ماں اونچا اونچا بولتے ہوئے رونے لگی۔ تیمور جلدی جلدی سیڑھیاں اُترتا ہوا پہنچا۔

"کیا ہوا امی کیوں رو رہی ہیں؟" تیمور نے شبانہ کو پوچھا۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہو..؟ پوچھو اپنی بیگم صاحبہ سے۔" شبانہ نے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا تو عرشیہ گڑبڑا سی گئی اور تیمور اُسے گھورنے لگا۔

"کیا کہا ہے تم نے میری ماں کو...؟" اُس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"میں نے کچھ بھی نہیں کہا... میں نے ناشتے کا پوچھا تھا بس۔" عرشیہ نے گھبراتے ہوئے کہا۔

"امی۔ آپ اندر چلیں کمرے میں۔" تیمور ماں کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گیا اور شبانہ بھی اُسے گھورتے ہوئے اندر کی جانب چل دی۔ عرشیہ وہیں حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئی کہ آخر اُس سے ایسا کیا ہو گیا جو تیمور کی ماں نے اتنا تماشہ بنا دیا۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم تھی کہ تیمور کمرے سے باہر آ گیا اور اُسے گھورتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"تمہاری جرات کیسی ہوئی میری ماں سے بدتمیزی کرنے کی...؟"

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی تیمور... میرا یقین کریں آپ میں نے صرف اُنکی بات کا جواب دیا تھا۔"

"تو میری ماں کیا پاگل ہے جو رو رہی ہے...؟ اگر تم نے کچھ نہیں کہا تو پھر وہ کیوں رو رہی ہیں بولو..؟" تیمور اُس پہ چلا رہا تھا۔

"اُنہوں نے پوچھا تھا کہ میں کچن میں کیوں آئی تو میں نے کہا آپ نے مجھے کہا تھا۔ بس اسی بات پہ اُنکو غصہ آ گیا تھا اور وہ رونے لگیں۔"

"بکواس مت کرو۔ تم نے ضرور کوئی ایسی بات کہی ہوگی جو اُنکے دل کو بری لگی ہوگی۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں... اُنکو میرا کام کرنا اچھا نہیں لگا۔ آپ اُنکو بتائیں جا کر کہ آپ نے مجھے کہا ہے یہ سب کرنے کو۔"

"ایک بات کان کھول کر سن لو عرشیہ... نواب زادی ہوگی تم اپنے ماں باپ کے گھر میں اور وہی تمہاری بدتمیزیاں برداشت کرتے ہونگے۔ یہاں زبان درازی نہیں چلے گی... سمجھی تم۔" تیمور انگلی کے اشارے سے اُسے سرزنش کر رہا تھا اور عرشیہ کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔ اُسے روتا چھوڑ کر وہ خود آفس چلا گیا تھا۔ عرشیہ بے بس سی تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی تھی اور دروازہ

لاک کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

"یہ کس آزمائش میں ڈال دیا ہے مجھے امی ابو نے..." عرشیہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"آخر میرا قصور کیا ہے...؟ یہ لوگ مجھے کس بات کی سزا دے رہے ہیں...؟" عرشیہ خود سے سوال کر رہی تھی لیکن اُسکے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

☆......☆......☆

"ارے واہ امی... آپ نے تو کمال ہی کر دیا کیسی اور بجنل ایکٹنگ کی کہ تیمور آگ بگولا ہی ہو گیا... اور پھر وہ برسا اُس عرشیہ میڈم پہ کہ مزہ آ گیا۔" شبانہ نے ماں کو داد دیتے ہوئے کہا... اور وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دی تھی۔

"بس دیکھتی جاؤ اب تم لوگ میں کرتی کیا ہوں..." رخسانہ بیگم نے مکاری سے کہا۔

"بس امی آپ کچھ ایسا کرنا کہ تیمور کبھی بھی اُسکا غلام نہ بنے اور جیسے ہمارا بڑا بھائی بیوی کے پیچھے لگ کر ہمیں چھوڑ گیا تیمور ایسا نہ کرے کبھی بھی..." فرزانہ نے ماں سے کہا تھا۔

"تو فکر نہ کر میری بچی... تنویر تو تھا ہی زن مرید لیکن یہ تیمور ہے۔ وہ کبھی بھی عرشیہ کا غلام نہیں بنے گا... بڑا ہی فرمانبردار بچہ ہے میرا۔ بس تم دیکھتی جاؤ... عرشیہ میڈم کو عرش سے فرش پہ نہیں لائی تو میرا نام رخسانہ نہیں..."

"امی اب میرے رشتے کا کیا ہوگا...؟ خالہ تو اب کسی صورت راضی نہیں ہونگی۔ وہ تو اسی صورت میری شادی سلیم سے کر رہی تھیں اگر ہم اُنکی بیٹی کو تیمور کی دلہن بناتے۔" شبانہ نے فکرمندی سے کہا۔

"بہت کہا تھا تیمور کو کہ افشاں سے شادی کر لے لیکن اُسے تو وہ ایک آنکھ بھی نہیں بھاتی تھی... اور پھر تمہاری خالہ کی ضد کہ سلیم کے ساتھ افشاں کا رشتہ بھی لیا جائے ایسے میں کس طرح تمہارا رشتہ کر دیتی؟"

"تیمور بھائی مان جاتے تو آج شبانہ آپا بھی اپنے گھر کی ہو جاتیں..." فرزانہ نے کہا۔

"ہاں ایسا ہو تو جاتا لیکن تمہاری خالہ پھر اولے بدلے کے رشتے میں جہیز بھی اولے بدلے کا لیتیں... اور پھر ساری زندگی اولہ بدلہ ہی نبھاتے رہتے۔"

"ویسے یہ تو آپ سچ کہہ رہی ہیں امی... عرشیہ بھابی تو اتنا کچھ لائیں ہیں جہیز میں اور جو پیسہ ملا ہے تیمور بھائی کو اس سے اُنہوں نے کتنے گھروں کا ٹھیکا اُٹھا لیا ہے... کاروبار کو وسعت ملی ہے بھائی کے... اگر خالہ کے گھر رشتہ کیا ہوتا تو پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی۔"

"ہونہہ پھوٹی کوڑی بھی نہ ملتی۔ تمہارا رشتہ تو ذکر کرتے ناں تیمور کی شادی تو دیکھتی کیسے گُن گاتی ہو تم اپنی عرشیہ بھابی کے..." شبانہ نے منہ بگاڑتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالی۔

"اچھا اچھا بس... آپس میں جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا نے چاہا تو بہت اچھے گھروں میں تم لوگوں کے رشتے ہونگے۔ بھابی اچھے گھر کی لے آئے ہیں ناں اب دیکھنا کیسے اچھے گھروں سے تم دونوں کے رشتے آتے۔"

"میری تو آدھی سے زیادہ زندگی اسی آس پہ گزر گئی ہے..."

"مایوس نہیں ہوتے میری بچی..."

"اتنے انتظار کے بعد بھی اگر کچھ نہ ملے تو کوئی مایوس نہ ہو تو کیا ہو... پانچ سال مجھے سلیم کے نام پہ بٹھائے رکھا اور آخر میں تیمور کے ایک انکار کی وجہ سے میں کنواری بیٹھی رہ گئی اور وہ خود اپنے لئے اعلیٰ خاندان کی تعلیم یافتہ خوبصورت بیوی لے آیا... کیا میرا دل نہیں جلتا یہ سب سوچ کر...؟"

"دکھی نہ ہو میری جان۔ تمہارا بھائی امیر ہوگا تو تم لوگوں کے بھی اونچے گھرانوں میں رشتے ہو جائیں گے۔ دیکھنا بس اب تم..."

"تھوڑے سے پیسوں کو کاروبار میں ڈال کر بھائی کونسا کروڑ پتی ہو جائے گا امی جو ہمارے اونچے گھرانوں سے رشتے آنے لگیں گے؟" فرزانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں بس یہی بات تو میں نے تم لوگوں کو بتائی نہیں..." رخسانہ بیگم کھسیانی ہنسی ہنستی ہوئی بولی تھی۔

"کونسی بات امی؟" شبانہ نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ جو عرشیہ ہے ناں... یہ سونے کی چڑیا ہے سونے کی۔"

"وہ کیسے امی؟" فرزانہ نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"وہ ایسے کہ اسکی ماں نے مجھے بتایا تھا کہ عرشیہ کے نام بہت سی جائداد ہے۔ اور جو گھر ہے ناں انکا ماڈل ٹاؤن میں جہاں یہ سب رہائش پذیر ہیں وہ بھی عرشیہ کے نام کر دیا تھا اُسکے باپ نے شادی کے تحفے میں... بڑی لاڈلی ہے یہ اپنے کروڑ پتی والدین کی..." رخسانہ بیگم نے رازدارانہ لہجے میں بتاتے ہوئے آنکھ دبائی تھی۔

"ارے واہ... اسکا مطلب بھائی کے تو وارے نیارے ہو گئے۔" فرزانہ نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

"اور نہیں تو کیا... ہاہاہاہا..." رخسانہ بیگم نے شبانہ کے ہاتھ پہ ہاتھ پٹختے ہوئے کہا اور تینوں کے مکار قہقہے چھوٹے سے کمرے میں گونج اٹھے۔

☆......☆......☆

احمد صاحب اور صبیحہ بیگم ٹی۔وی لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔ احمد صاحب اخبار پڑھنے میں مصروف تھے اور صبیحہ بیگم ٹی۔وی پہ کوئی مارننگ شو دیکھ رہی تھیں۔ درمیان میں رکھی ٹیبل پہ صبح کی چائے بھاپ اُڑا رہی تھی۔ اتنے میں داخلی دروازے سے عرشیہ اندر آئی تو دونوں کی خوشی کی انتہا نہ رہی تھی۔

"اسلام وعلیکم..." عرشیہ نے اندر آتے ہوئے بلند آواز میں کہا تھا۔

"وعلیکم السلام... آج تو صبح صبح ہی ہماری شہزادی کا دیدار ہو گیا۔ کیسا پیارا دن ہے بھئی صبیحہ بیگم آج..." احمد صاحب بیٹی کو دیکھ

کر پھولے نہیں سما رہے تھے۔

"سچ کہہ رہی ہیں آپ عرشیہ کی ماں..." صبیحہ بیگم نے بیٹی کو گلے سے لگاتے ہوئے کہا تھا

"مجھے پتہ تھا آپ دونوں مجھے اس وقت بہت یاد کر رہے ہونگے اسلئے میں صبح صبح ہی آ گئی تاکہ سارا دن آپ کے ساتھ گزار سکوں۔" عرشیہ نے ماں باپ کو خوش ہوتا دیکھ کر کہا تھا۔

"یہ تو بہت ہی اچھا کیا تم نے... میرا دل بہت اُداس رہتا ہے تمہارے بغیر۔" صبیحہ بیگم نے اُداس لہجے میں کہا تو عرشیہ ایک بار پھر اُنکے گلے لگ گئی۔ نمی اُسکی جھیل سی آنکھوں میں تیر گئی تھی وہ کیسے بتاتی اُنہیں کہ اُس پہ دن رات وہاں کیا گزرتی ہے۔ کیسا کرب کیسی اُداسی ہے وہاں۔

"بیٹا تیمور نہیں آیا ساتھ؟ کیسے آئی ہو تم؟" احمد صاحب نے پوچھا۔

"جی ابو تیمور ہی مجھے ڈراپ کر کے گئے ہیں۔ اُنکو جلدی آفس پہنچنا تھا اسلئے چلے گئے شام کو لینے آئیں گے مجھے تو آپ سب سے ملیں گے۔" عرشیہ نے جلدی سے وضاحت دی۔

"اچھا۔ اچھا۔" احمد صاحب جیسے مطمئن ہو گئے تھے۔

"عرشی تم خوش تو ہو ناں...؟" صبیحہ بیگم نے آس بھری نگاہوں سے بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی امی... میں خوش ہوں... آپ فکرمند نہ ہوں۔" عرشیہ نے کہا تھا۔

"پھر تمہارے چہرے پہ وہ خوشی کیوں نظر نہیں آتی جو ہونی چاہیے...؟"

"ایسی کوئی بات نہیں امی... میں بہت خوش ہوں آپکو وہم ہو رہا ہے۔" عرشیہ سے جواب دینا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ کیسے بتاتی اپنی ماں کو کہ اُسکی لاڈلی کی کیسی تذلیل کی جاتی ہے۔

"سچ بتاؤ میری بچی... تیمور تمہارا خیال رکھتا ہے؟ تم اُسکے ساتھ خوش تو ہو ناں؟"

"جی امی... آپ خوامخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ تیمور تو میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔" عرشیہ نے مسکراتے ہوئے ماں کو کہا۔

"شکر ہے خدا کا..." صبیحہ بیگم نے سکھ کا سانس لیا تھا۔

"چلو بھئی اب بیٹی کو کچھ کھلاؤ پلاؤ گی بھی یا بس سوال ہی کرتی رہو گی...؟" احمد صاحب نے بیوی کو کہا۔

"تو اور کیا... اتنی سخت بھوک لگ رہی ہے اور چائے کی بھی بہت طلب ہو رہی ہے۔" عرشیہ نے ماں سے کہا۔

"اچھا تم اپنے ابو کے ساتھ باتیں کرو میں ابھی تمہارے لئے ناشتہ بنواتی ہوں۔" صبیحہ بیگم نے کہا اور کچن کی طرف چل دیں۔ عرشیہ اور احمد صاحب باتیں کرنے اور ٹی۔وی دیکھنے میں مگن ہو گئے۔ عرشیہ ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی۔ ایک عجیب سا سکون محسوس کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ "کیا ملا ہے اُسے تیمور سے شادی کر کے... نا تو تیمور اُس سے وفادار ہے اور نہ ہی اُسے اس شادی

کی کوئی ضرورت تھی۔" یونہی سوچوں میں گم نا جانے کب اُسکی آنکھ لگ گئی تھی اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ سہ پہر میں اُسکی آنکھ موبائل فون کے بجنے سے کھلی تھی۔ موبائل پہ تیمور کا نام جگمگا رہا تھا جسے دیکھ کر ایک بار تو عرشیہ کو حیرت ہوئی تھی۔

"ہیلو۔" عرشیہ نے فون کان سے لگاتے ہوئے بولا۔

"آج شام میرا انتظار نہ کرنا میں لینے نہیں آسکوں گا..." دوسری طرف سے تیمور کی آواز آئی تھی۔

"کیوں... سب خیریت تو ہے ناں؟" عرشیہ نے پوچھا۔

"ہاں خیریت ہے۔ کچھ ضروری کام ہیں آفس میں مجھے دیر ہو جائے گی آنے میں اسلئے تمہیں لینے نہیں آسکوں گا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" عرشیہ نے کہا تو دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔ عرشیہ کے ذہن میں تیمور کے موبائل پہ آنے والی کالز کے نام گھومنے لگے اور آنسو بے اختیار ہی آنکھوں سے برسنے لگے۔ کتنی دکھ کی بات تھی کہ عرشیہ کی کوئی بھی خوبی اُسکے لیے کارگر ثابت نہیں ہوئی تھی۔ نہ اُسکا حُسن، نہ اخلاق، نا تعلیم اور نہ ہی دولت ہی اُسکے کسی کام آئی تھی۔ تقدیر نے اُسے ایک بند گلی میں لا کھڑا کیا تھا جہاں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ سب بتاتی بھی تو کسے بتاتی؟ اُسکے چارہ گروں نے تو پہلے ہی ہر جتن کر دیکھا تھا لیکن اُسکے نصیب میں تو جیسے خوشیاں لکھی ہی نہیں گئیں تھیں۔ اپنی تقدیر کے گرداب میں عرشیہ کی ہچکولے کھاتی کشتی کو اب شاید خدا ہی کوئی کنارہ دے سکتا تھا اور یہی سوچ کر اُس نے چپ سادھ لی تھی اور کسی کو کچھ بھی نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ہر دکھ اکیلے ہی سہنا چاہتی تھی تاکہ اُسکی یہ وقتی آزمائش کہیں اُسکے ماں باپ کو اذیت میں مبتلا نہ کر دے۔ ابھی وہ یہی سوچ رہی تھی کہ موبائل پھر سے بجنے لگا۔ سکرین پہ نائمہ کا نمبر جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو۔" عرشیہ نے کال ریسیو کرتے ہوئے بولا۔

"کہاں غائب ہو یار...؟ تم تو بالکل بھول گئی ہو شادی کے بعد۔" نائمہ کی خفگی سے بھری آواز آئی تو عرشیہ کے چہرے پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

"زندگی چیز ہی بڑی ظالم ہے یار... اسکے کچھ وار ایسے ہوتے ہیں کہ انسان دوست تو کیا اپنی ذات تک سے بے خبر ہو جاتا ہے۔"

"کیا بات ہے عرشی... تم ٹھیک تو ہو؟" نائمہ اچانک سنجیدہ سی ہو گئی تھی۔

"اگر جسمانی طور پہ پوچھ رہی ہو تو ٹھیک ہوں... اور اگر ذہنی طور پہ پوچھ رہی ہو تو مجھے خود میری خبر نہیں۔"

"کیا ہوا ہے عرشی... اس قدر اداسی کیوں؟ سب ٹھیک تو ہے ناں... سسرال میں کوئی مسئلہ ہے کیا؟"

"پتہ نہیں تقدیر اب مجھ سے کیا کھیل کھیل رہی ہے نائمہ... معلوم نہیں یہ کوئی آزمائش ہے یا سزا..."

"کیا تیمور بھائی تمہارے ساتھ ٹھیک نہیں ہیں... یا ساس اور نندیں مسئلے کی جڑ ہیں؟"

"کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے نائمہ... یوں لگتا ہے جیسے مجھے کسی نے موت کے کنوئیں میں دھکیل دیا ہے جہاں ایک گہری کھائی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ نہ تیمور ہی میرا ہے اور نہ ہی سسرال والوں کا رویہ اچھا ہے... سنگدل اجنبیوں کی دنیا میں جینے پہ مجبور ہوں۔"

"اوہ میرے خدایا...!!! یار ایسا کیوں ہے؟ سب کچھ اتنے اچھے طریقے سے ہوا تھا تو پھر یہ لوگ تمہاری قدر کیوں نہیں کر رہے...اور تیمور تو تمہارے پاؤں دھو کر بھی پیتا تو کم تھا۔"

"ہونہہ...وہ تو میرے ساتھ ایسے پیش آتا ہے جیسے مجھے زبردستی اُس پہ مسلط کیا گیا ہو یا پھر مجھے خود پہ مسلط نہ کرنا چاہتا ہو..." عرشیہ نے تلخی سے کہا۔

"تو پھر تم نے اپنے گھر والوں سے یہ سب ڈسکس کیا اب تک کہ نہیں...؟"

"نہیں نائمہ...اور میں کرنا بھی نہیں چاہتی۔"

"لیکن کیوں عرشی...؟ ایسے کیسے گزارہ ہوگا تمہارا؟"

"معلوم نہیں کیسے ہوگا...لیکن ہوسکتا ہے یہ وقتی رویہ ہو اور بعد میں سب ٹھیک ہو جائے..."

"شادی کے اتنے ابتدائی دور میں اگر ایسے حالات ہیں تو آگے تم کیسے اچھے کی اُمید کر سکتی ہو؟"

"میں اپنے گھر والوں کو اپنی وجہ سے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی نائمہ۔ اُنہوں نے پہلے ہی میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے...اتنے جتن کر کے میری شادی کی ہے اور میں تھوڑا سا صبر بھی نہ کروں؟"

"وہ تو ٹھیک ہے عرشیہ لیکن بعد میں اگر مسئلہ زیادہ بڑھ گیا تو سب تمہیں قصوروار ٹھہرائیں گے کہ وقت پہ سارے حالات سے آگاہ نہیں کیا تم نے..."

"نائمہ تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں ہے کہ میں پھر سے اپنے گھر والوں کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر دوں...ابھی تو مجھے خود سمجھ نہیں آرہا کہ اصل مسئلہ کیا ہے؟"

"عرشی جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا۔ میرے خیال میں تو یہی بہتر ہوگا کہ تم اپنے گھر والوں کو اعتماد میں لو تاکہ کل کو کوئی تمہیں جھوٹا نہ کر سکے۔"

"سوچوں گی اس بارے میں...فی الحال تو ذہن بالکل ماؤف ہو چکا ہے۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں یار کہ تم پہ کیا گزر رہی ہوگی...ہر لڑکی نئی زندگی کے ہزاروں خواب سجا کر پیا کی دہلیز پہ قدم رکھتی ہے اور اگر چارہ گر ہی ستم کر نکلے تو عورت کے پاس سوائے آنسوؤں کے کچھ نہیں بچتا۔"

"مجھے لگتا ہے کہ میں ایک بند گلی میں کھڑی ہوں...جہاں سے آگے کا کوئی رستہ مجھے دکھائی نہیں دیتا..."

"خدا تمہاری مشکلیں آسان کرے اور تمہیں جلد از جلد اس آزمائش سے نکالے...آمین۔"

"آمین...کچھ اپنی بھی سناؤ...؟" عرشیہ نے پوچھا۔

"میرا ابھی مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا...عرفان کے گھر والے مان کے نہیں دے رہے۔"

"ہاں میں سمجھ سکتی ہوں...لوگ سٹیٹس پہ بہت کم ہی کمپرومائز کرتے ہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو...سب سے بڑا مسئلہ ہی ہمارے درمیان اس طبقاتی فرق کا ہے ورنہ ان لوگوں کو اور کسی بات پہ اعتراض نہیں۔"

"اس سے بڑا اعتراض ہو بھی نہیں سکتا..."

"پلیز تم میرے لئے بھی دعا کرنا عرشی..."

"ہاں ضرور...فکر نہیں کرو سب ٹھیک ہو جائے گا...اللہ پہ بھروسہ رکھو۔"

"تم خدا پہ کتنا بھروسہ کرتی ہو ناں عرشیہ...ایسے حالات میں تو لوگ بالکل ناامید ہو جاتے ہیں لیکن تم کتنی بہادر ہو اس وقت بھی جبکہ تم خود اتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو مجھے حوصلہ دے رہی ہو...خدا پہ بھروسہ رکھنے کو کہہ رہی ہو...سچ تم کتنی نیک ہو۔"

"خدا کبھی کسی پہ اُسکی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا...اسلئے مجھے اُس پہ سو فیصد بھروسہ ہے۔"

"سچ کہتی ہو...چلو اپنا بہت خیال رکھنا...پھر بات ہوگی۔"

"تم بھی اپنا خیال رکھنا...خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

☆......☆......☆

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" تیمور نے عرشیہ سے کہا تو آئینے کے سامنے کھڑے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے اُسکا ہاتھ ایک بار رکا تھا۔

"جی بولیں کیا بات ہے؟" عرشیہ نے کہا۔

"یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو...پھر بتاتا ہوں۔" غیر معمولی طور پہ آج تیمور کا مزاج خوشگوار تھا۔

"جی...کہیے۔" عرشیہ نے اُسکے قریب بیٹھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"تمہیں پتہ ہے میرا بزنس اب پہلے سے زیادہ وسیع ہو گیا ہے اور بہت سے نئے پراجیکٹ اور ہاؤسنگ کا چارج مجھے ملا ہے..." تیمور نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کی۔

"یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔"

"ہاں...اور جن نئے پراجیکٹس کا میں نے چارج سنبھالا ہے اُنکے لئے رننگ فنانس کی بھی ضرورت ہے..."

"جی میں سمجھ سکتی ہوں..."

"تم تو جانتی ہو کہ میں اکیلا ہی ساری بھاگ دوڑ سنبھالتا ہوں اور سارا پیسہ بھی مجھے ہی انویسٹ کرنا ہوتا ہے..."

"جی میں جانتی ہوں..." عرشیہ کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ تیمور ہی ہے جو اُس سے اس طرح گفتگو کر رہا ہے۔ یہ تو

اُس تیمور سے یکسر مختلف ہے جسے پچھلے ایک ماہ سے وہ جانتی تھی۔

"یہ سب ترقی مجھے خدا نے تمہارے نصیب کی بخشی ہے عرشیہ...امی کا بھی یہی خیال ہے۔" تیمور نے والہانہ انداز میں عرشیہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تو اُسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اُسے لگا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔

"خدا نے آپکی محنت کا پھل دیا ہے آپکو...میرا اس میں کیا کمال..؟" عرشیہ نے عاجزی سے کہا۔

"وہ کہتے ہیں ناں دولت عورت کے نصیب کی ہوتی ہے اور اولاد مرد کے نصیب کی...بس یہی معاملہ ہے۔" تیمور نے کہا تو عرشیہ شرما گئی۔

"آج میں جو کچھ بھی کماؤں گا وہ کل ہمارے بچوں کے کام آئے گا۔"

عرشیہ کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آرہا تھا وہ آج تیمور کے منہ سے ایسی باتیں سن کر دنگ رہ گئی۔ وہ بس تیمور کو تکے جارہی تھی جیسے اُسکے الفاظ پہ یقین کرنا چاہ رہی ہو۔

"بس پہلے میں اپنی بہنوں کے مستقبل محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔تاکہ اُنکی زمہ داری سے سبکدوش ہوجاؤں..."

"جی بالکل...بھائی ہونے کے ناطے آپ پہ اُنکی ذمہ داری بھی ہے اور حق بھی..."

"لیکن عرشیہ...اسکے لئے مجھے تمہاری مدد کی بھی ضرورت ہے۔"

"جی ضرور...مجھ سے جو ہوسکا میں کرونگی۔"

"امی چاہتی ہیں کہ تم اگر اپنا زیور شبانہ باجی کو جہیز میں دے دو تو اُنکی شادی ہوسکتی ہے...میں تو ابھی بزنس سے اتنا پیسہ نہیں نکال سکتا کہ اُنکی شادی کرسکوں لیکن اگر تم ساتھ دو تو ہم اس ذمہ داری سے سبکدوش ہوسکتے ہیں..."

"زیور...لیکن وہ تو مجھے میرے گھر سے ملا ہے۔وہ زیور کیسے دے سکتی ہوں میں؟" عرشیہ نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا زیور نہیں تو پھر جو تمہارے پاس بنک بیلنس ہے اُسے بھی تو استعمال کیا جاسکتا ہے...شادی کی تیاریوں میں تم اُنکی ہیلپ کروگی تو سب تم سے بہت خوش ہونگے..."

"جی..." عرشیہ تیمور کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی اُسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

"کوئی جلدی نہیں ہے۔تم اچھے سے سوچ لو پھر جو مناسب سمجھو بتادینا۔"

"جی ٹھیک ہے۔" عرشیہ نے بجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"اچھا اب لائٹ آف کردو....مجھے نیند آرہی ہے صبح آفس بھی جانا ہے۔"

عرشیہ لائٹ بند کرکے خود بھی لیٹ گئی۔طرح طرح کی سوچیں اُسکے ذہن کو ماؤف کئے دے رہی تھیں۔اچانک تیمور میں آنے والی تبدیلی اُسکے صبر کا پھل ہے یا تیمور کی ضرورت ہے وہ کچھ سمجھ نہیں پارہی تھی۔رات بھر انہی سوچوں میں گم وہ کسی نتیجے پہ نہیں پہنچ پارہی تھی۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" رات کو کھانے سے فارغ ہو کر جب عرشیہ اور تیمور بیڈ روم میں آئے تو بیڈ پہ لیٹتے ہوئے تیمور نے عرشیہ سے پوچھا تھا۔

"میں اپنی طرف سے جو ہو سکا ضرور کروں گی شبانہ باجی کی شادی کے لئے لیکن پہلے اُن کا رشتہ تو طے ہو جانے دیں۔۔ شادی کی تاریخ رکھی جائے تو سب کچھ ہو جائے گا۔"

"یعنی تم راضی ہو اپنا زیور دینے کے لئے۔۔؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں اپنا ہی زیور دوں گی۔۔۔ لیکن جس بھی چیز کی ضرورت ہوئی میں پوری کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"تو پھر زیور دینے میں کیا پرابلم ہے؟"

"وہ زیور ہمارے خاندانی زیورات ہیں تیمور۔۔۔ میری نانی کو اُن کی ماں سے اور پھر میری ماں کو میری نانی سے ورثے میں ملے تھے۔ اسلئے وہ زیور میں کسی اور کو۔۔۔"

"تمہارا مطلب کیا ہے اس بات سے۔۔۔ ہم خاندانی لوگ نہیں ہیں؟؟؟" تیمور نے عرشیہ کی بات کاٹتے ہوئے غصے سے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا تیمور۔۔۔ میں تو بس زیور نہ دینے کی وجہ بتا رہی ہوں۔"

"ذرا اپنے الفاظ پہ غور کرو تم۔۔۔ تمہاری جرات کیسے ہوئی ہماری بے عزتی کرنے کی؟"

"میں کیوں آپکی بے عزتی کروں گی تیمور۔۔۔ آپکو غلط فہمی ہوئی ہے۔"

"تم میری مجبوری کو ہتھیار بنا کر مجھے نیچا دکھانا چاہتی ہو۔۔۔؟ میری بہن کو جہیز دینے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں ہیں تو اسکا کیا مطلب ہے تم ہمیں نیچ اور غیر خاندانی سمجھنے لگو؟" تیمور اب باقاعدہ چلا رہا تھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں کی میں نے۔۔۔ آپکی بہن میری بھی کچھ لگتی ہے اور میں اُن کی شادی کے لئے سب کچھ کروں گی۔"

"کوئی احسان نہ کرو تم ہم پر۔۔۔ پہلے ہی پتہ نہیں کس مجبوری میں تم یہاں گزارہ کر رہی ہو۔ تمہیں تو یہاں ہر چیز حقیر اور کمتر محسوس ہوتی ہوگی۔۔۔ ہے ناں؟"

"ایسا کچھ نہیں ہے تیمور۔۔۔ پلیز بس کر دیں۔۔۔ چھوٹی سی بات کا جھگڑا مت بنائیں پلیز۔"

"میں جھگڑا بنا رہا ہوں یا تم نے بنایا ہے۔۔۔ صرف زیور ہی مانگا تھا ناں۔۔۔ بھابھیاں کیا کچھ نہیں کرتیں اپنی نندوں کو بیاہنے کے لئے اور تم ہو کہ۔۔۔"

"تو میں بھی سب کچھ کروں گی۔۔ آپ ایک بار رشتہ طے ہو لینے دیں پھر دیکھئے گا۔"

"تم تو ہمیں ایسے سمجھتی ہو جیسے ہم کوئی فقیر ہیں۔۔۔ اور تم کہیں کی رانی ہو۔۔۔ جو چاہو گی کرو گی اور ہم تمہاری دی ہوئی بھیک لے کر خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے۔" طنز و تکرار تو جیسے تیمور کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

"میں بس ایک بات کہوں گی تیمور... شبانہ باجی کا رشتہ ہو جائے تو ہر کام میں خود کروا دوں گی آپ پریشان نہ ہوں۔ میں صرف اتنا چاہ رہی تھی کہ انکے جہیز میں ہر چیز نئی ہو کسی کی پہنی ہوئی نہ ہو تا کہ انکو یہ نہ لگے کہ انکو کسی کی اُترن پہنائی گئی ہے۔"

"اوہ... آپکی سوچ اتنی بلند ہوگی عرشیہ میڈم میں نے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ میں بھی کتنا بڑا بے وقوف ہوں..." تیمور نے طنز بھرے لہجے میں کہا اور زور سے دروازہ بند کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ عرشیہ اُسے جاتا دیکھتی رہی اور یہی سوچتی رہی کہ نہ جانے اس شخص کے کتنے روپ اور دیکھنے ابھی باقی ہیں۔ رات بھر انتظار کرنے کے بعد آخر وہ تھک کر سو گئی تھی لیکن تیمور گھر نہیں لوٹا تھا۔ اکثر راتیں اُسکی گھر سے باہر ہی گزرتی تھیں اور جب بھی وہ عرشیہ کے ساتھ ہوتا تھا تو طنز و تکرار کے علاوہ دونوں میں کوئی بات نہ ہوتی تھی۔ ایک اَن دیکھی سی دیوار حائل تھی دونوں کے درمیان جسے عرشیہ چاہ کر بھی گرا نہیں پا رہی تھی۔ صبح کے سات بج رہے تھے جب کمرے میں چیزوں کے شور سے عرشیہ کی آنکھ کھلی تھی۔ تیمور شاید آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

"کہاں تھے آپ رات بھر...؟" عرشیہ آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھی۔ لیکن تیمور نے کوئی جواب نہیں دیا اور تیاریوں میں مگن رہا۔ لیکن آج عرشیہ کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ تین مہینوں سے اُسکی اس روٹین سے وہ تنگ آ گئی تھی۔ اُسکی بیوی ہو کر بھی وہ ہر حق سے محروم تھی اور آج وہ اسکی وجہ جاننا چاہتی تھی۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے آپ سے۔" عرشیہ تیمور کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم ہوتی کون ہو مجھ سے یہ سوال کرنے والی...؟" تیمور نے غرور سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"میں آپکی بیوی ہوں... اور مجھے پورا حق ہے یہ جاننے کا کہ میرا شوہر راتیں کہاں گزارتا ہے؟" عرشیہ نے بھرپور جواب دیتے ہوئے کہا۔

"میں اپنی مرضی کا مالک ہوں... سمجھی تم... تمہیں ہرگز جواب دہ نہیں ہوں میں۔"

"آپ کس بات کا بدلہ مجھ سے لیتے ہیں..؟ کیوں میرے ساتھ یہ حقارت آمیز سلوک کرتے ہیں آپ...؟" عرشیہ آخر پھٹ پڑی تھی۔

"یہ خود سے پوچھو تم... میں تمہیں ہر بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں سمجھی تم۔" تیمور کا لہجہ توہین آمیز تھا۔

"میں آپکی بیوی ہوں اور آپ مجھے جواب دہ ہیں۔" عرشیہ نے روتے ہوئے کہا۔

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ میں نہ پہلے کبھی کسی کو جواب دہ تھا اور نہ آئندہ کبھی ہوں گا۔ تم میری بیوی ہو تو بیوی بن کر رہو سمجھی... جانتا ہوں تمہارے باپ نے مجھے چند پیسے دیئے ہیں لیکن اسکا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ تم لوگوں نے مجھے خرید لیا ہے... غلام نہیں ہوں میں کسی کا بھی۔ شوہر ہوں تو شوہر کی طرح عزت کرو میری۔ زر خرید غلام نہیں ہوں تمہارا۔"

"میں بھی یہی کہہ رہی ہوں کہ شوہر بن کر بیوی کا مقام دیں مجھے... ملازمہ نہ سمجھیں"

''آئندہ خیال کروں گی۔شاید اندازہ نہیں ہوا مجھے...''

''اچھا مجھے تم سے ایک بات کرنی تھی... یہاں بیٹھو'' ساس نے قریب بیٹھنے کو کہا۔

''جی امی... کہیے'' عرشیہ نے ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا۔

''تم تو جانتی ہو کہ شبانہ کا رشتہ طے کر رہے ہیں... پھر کچھ دنوں میں منگنی بھی کر دیں گے''

''جی.. مجھے تیمور نے بتایا ہے''

''ہاں تو بس بیٹا... اب جو بھی تیاریاں کرنی ہیں وہ تم نے اور تیمور نے ہی کرنی ہیں۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم کہاں اب...؟'' ساس نے دوستانہ انداز میں بات کرتے ہوئے اپنائیت سے کہا تو عرشیہ حیرت سے اُسکا منہ تکنے لگی۔

''میری یتیم بچیوں کا خدا کے بعد تو بس تیمور اور تم ہی سہارا ہو بیٹا'' ساس نے ایک اور جذباتی جملے سے عرشیہ پہ حملہ کیا تھا۔

''جی امی... بالکل بھی فکر نہ کریں آپ... میں اور تیمور مل کر سب کچھ کر لیں گے''

''ہائے بس بیٹا... اللہ تم جیسی بہو ہر کسی کو دے...''

''آپ مجھے بتا دیجیے گا جتنے بھی پیسے چاہیے ہونگے.. جو بھی خرچہ ہوگا منگنی کے لیے وہ میں کروں گی آپ کسی چیز کی ٹینشن نہ لیجیے گا'' عرشیہ نے مروت سے کہا۔

''ارے بیٹا میں تو کہہ رہی تھی تمہارا زیور ہی پہنا دونگی شبانہ کو... کہاں نئے زیور پہ پیسہ خرچ کرتی پھروں گی...''

''کوئی بات نہیں امی.. جہاں باقی کام ہونگے وہاں زیور بھی بن جائے گا''

''اچھا.. چلو ٹھیک ہے.. بھئی تمہارا خاندانی زیور ہوگا بھی تو بڑا قیمتی.....''

''جی قیمتی تو ہے...'' عرشیہ نے کہا۔

''ہاں... تبھی تو تم دینا نہیں چاہتی'' ساس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ایسی بات نہیں ہے امی... شبانہ باجی کو اُنکا اپنا زیور بنوا دونگی میں''

''چلو ٹھیک ہے بھئی... یہ بھی کر دو تو بڑا احسان ہے تمہارا'' ساس نے جلے ہوئے انداز میں کہا۔

''نہیں احسان کیسا..؟ اپنوں پہ کوئی احسان نہیں ہوتا'' عرشیہ نے محبت سے کہا۔

☆......☆......☆

شبانہ کی منگنی پہ عرشیہ کے بنک اکاؤنٹ سے پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا اور جی بھر کر ارمان پورے کیے گئے۔اس دوران تیمور اور اُسکے گھر والے جتنا اچھا رویہ عرشیہ کے ساتھ رکھ سکتے تھے انہوں نے رکھا تا کہ عرشیہ کی دولت پہ اپنے ارمان پورے کیے جا سکیں۔اور عرشیہ سب کچھ جانتے سمجھتے ہوئے بھی صرف اپنے رشتے کی بقاء کی خاطر بخوشی اُنکے ہر کام میں خوش خوش رہی کہ شاید ان سنگدلوں کے دل

اُسکے لئے محبت سے بھر جائیں۔ لیکن مطلب پورا ہوتے ہی ہر کسی نے پھر سے آنکھیں پھیر لیں تھیں۔ تیمور بھی پرانی ڈگر پہ چل نکلا اور ساس نندوں کی سازشیں اور طنز پھر سے عروج پہ پہنچنے لگے تھے۔ عرشیہ کے لئے سب سے تکلیف دہ تیمور کی لاتعلقی اور سرد مہری تھی۔ جیون ساتھی اگر اپنے مضبوط بازوؤں کا سہارا دے دے تو عورت دنیا کا بڑے سے بڑا ظلم ہنس کر سہہ جاتی ہے لیکن اگر ساتھی ہی بے وفا اور بے مروت نکلے تو پھر عورت کے لئے کچھ بھی برداشت کرنا بے سود ہوتا ہے۔ عرشیہ کے گرد زندگی کا گھیرا تنگ سے تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ دن رات تیمور اور اسکے گھر والے اُس پہ بوجھ بڑھاتے ہی جا رہے تھے۔ ذہنی، جسمانی اور مالی ہر قسم کا خسارہ اور نقصان اُسکے حصے میں ڈالا جا رہا تھا اور اس بڑھتے بوجھ سے اب عرشیہ کی ہمت اور برداشت جواب دینے لگی تھی۔

"آخر تم کب تک برداشت کرتی رہو گی عرشی۔۔؟" نائمہ نے افسردگی سے کہا تھا۔ آج کافی دن بعد دونوں کی گفتگو ہو رہی تھی۔

"اب تو میری ہمت جواب دے گئی ہے نائمہ۔۔۔ معلوم نہیں مزید کب تک صبر کر سکوں گی۔۔۔" عرشیہ نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بس کرو عرشی۔۔ تم نے تو صبر و برداشت کی حد کر دی ہے۔ اگر یہ لوگ تمہاری قدر کرنے والے ہوتے تو اب تک حالات بہتر ہو چکے ہوتے لیکن یہ لوگ تو حد سے گزرتے جا رہے ہیں۔"

"پتہ نہیں یار۔۔۔ کبھی لگتا ہے سب کچھ ٹھیک ہونے لگا ہے اور پھر کچھ دن بعد سب پھر سے ویسے ہی ہو جاتے ہیں۔"

"تمہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا بے وقوف لڑکی۔۔۔ وہ اپنے مطلب اور ضرورت کے لئے وقتی طور پر اچھے بنتے ہیں اور مطلب پورا ہوتے ہی اپنی اوقات پہ آ جاتے ہیں۔۔۔ کم ظرف اور لالچی لوگ۔۔۔" نائمہ نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید تم سچ کہہ رہی ہو۔"

"تمہیں اب کسی طرح اپنے گھر والوں کو سب حالات سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ ورنہ بہت دیر ہو جائے گی عرشیہ اور تمہیں بعد میں پچھتانا پڑے گا۔"

"نہیں نائمہ۔۔۔ اگر میرے ماں باپ کو میری وجہ سے کچھ ہو گیا تو میں کبھی بھی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گی۔"

"کچھ نہیں ہو گا اُنکو۔۔ بلکہ اگر تم نہیں بتاؤ گی اور بعد میں کسی اور طرح معلوم ہو گیا تو زیادہ دکھ ہو گا اُنہیں۔"

"وہ یہ صدمہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔۔۔ میں جب تک صبر کر سکتی ہوں کروں گی۔ آخر پتھر پہ بھی پانی پڑتا رہے تو اُس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے یہ سب تو پھر انسان ہیں۔"

"عرشیہ تم صرف خود کو فریب دے رہی ہو اور کچھ نہیں ہے۔ تیمور جیسے لوگ پتھر سے بھی سخت دل رکھتے ہیں ورنہ تم جیسی لڑکی کے لئے کسی بھی مرد کا دل پگھل جاتا۔۔"

"وہ کہتا ہے اُسے عورتوں کی کمی نہیں۔۔۔ اور وہ کسی عورت سے بھی جذباتی لگاؤ نہیں رکھتا"

"تو اُسے کہو پھر شادی بھی نہ کرتا۔۔۔ اگر ایسی ہی بات تھی تو۔" نائمہ نے غصے سے کہا۔

"میں کچھ بھی کہوں تو چیخنے چلانے لگتا ہے اور ایک بار تو مجھے لگا جیسے ابھی مجھے تھپڑ مار دے گا... اس میں کچی باتیں سننے کی برداشت نہیں ہے۔"

"تو پھر تم کیوں برداشت کر رہی ہو اتنا اُسے...؟ سب بڑوں کو یہ باتیں بتاؤ تا کہ وہ تمہارا مسئلہ حل کریں۔"

"سوچتی ہوں کیا کرنا ہے... اب واقعی میری برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں سب چیزیں۔"

"خدا کے لئے... اپنے حال پہ رحم کھاؤ اور جلدی کوئی قدم اُٹھاؤ۔"

"امی اور ابو کو بھی کم ہی ملنے جاتی ہوں... اور بہت کم فون کرتی ہوں تا کہ اُنکو میری شکل یا آواز سے معلوم نہ ہو جائے کہ میں کس حال میں ہوں... اور وہ بیچارے سمجھتے ہیں کہ میں سسرال میں بہت خوش اور مصروف زندگی گزار رہی ہوں... اپنے گھر پہ راج کر رہی ہوں۔"

"کتنا بڑا دھوکا دے رہی ہو تم اُنکو... مت کرو ایسا کہ اگر کوئی بڑی بات ہو جائے اور اُنہیں اچانک پتہ چلے تو وہ یہ دھچکا برداشت نہ کر سکیں۔"

"ہاں سچ کہہ رہی ہو تم۔ جب تیمور ہی کو میری چاہت نہیں تو اس گھر کے لئے اپنے دن رات اور روپیہ پیسہ اور عزت نفس کچھ بھی قربان کر دوں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔"

"بس اب تم کسی دن دو ٹوک بات کرو تیمور سے... اور پھر جو جواب وہ دے اُسی حساب سے فیصلہ کرنا کہ گھر والوں کو کیا بتانا ہے اور کیسے بتانا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر بات ہو گی... خدا حافظ۔"

"خدا حافظ۔"

نائمہ سے بات کرنے کے بعد عرشیہ سوچ میں ڈوبی رہی اور یہی سوچتی رہی کہ تیمور سے کیسے بات کی جائے۔ دوپہر سے شام تک ہر کام کرتے ہوئے بس ایک ہی سوچ ذہن میں آ رہی تھی کہ آخر اس سب کا انجام کیسا ہو گا اور اُسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ ہر پہلو پہ غور کر رہی تھی اور دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ اگر سب کچھ ختم ہو گیا تو اُسکے والدین پہ کیا گزرے گی۔ لیکن اب جو بھی تھا اُسے کسی حتمی فیصلے پہ پہنچنے کی ضرورت تھی اور اب گھر والوں کی مداخلت ناگزیر ہو چکی تھی۔ رات نو بجے تیمور آفس سے گھر پہنچا تو عرشیہ کھانے کی میز پہ کھانا لگا رہی تھی۔ سب کھانے کی میز پہ اکٹھے بیٹھے تھے لیکن عرشیہ کو اس طرح نظر انداز کیا جاتا تھا جیسے وہ ان میں موجود ہی نہ ہو۔ ان سب کے ایسے رویے سے عرشیہ کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔ لیکن آج عرشیہ نے ٹھان لی تھی کہ وہ تیمور سے دو ٹوک بات کر کے رہے گی۔ کھانے کی میز صاف کرنے کے بعد عرشیہ نے کچن سمیٹا اور سارے برتن دھوتے ہوئے اُسے رات کے بارہ بج گئے تھے۔ تھک ہار کر جب وہ کمرے میں آئی تو تیمور کسی سے فون پہ ہنس ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی لڑکی سے باتیں کر رہا ہو۔ عرشیہ کی آہٹ سن کر اُس نے گفتگو مختصر کر کے کال بند کر دی۔ عرشیہ کمرے میں آ کر بیڈ پہ بیٹھ گئی لیکن اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ بات کیسے شروع کرے۔ تیمور اپنی سائیڈ کا لیمپ آف کر کے لیٹ گیا جیسے سونے لگا ہو۔

"کس کا فون تھا؟" عرشیہ نے پوچھا۔

"ایک دوست کا..." تیمور نے مختصر جواب دیا۔

"کس دوست کا..؟" عرشیہ نے پھر سوال کیا۔

"بہت سے دوست ہیں... تمہیں سب کا تو نہیں معلوم۔"

"دوست ہی تھا ناں...؟" عرشیہ نے سوال پہ زور دیا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا..؟" تیمور نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ دوست تھا یا کوئی.. گرل فرینڈ؟" عرشیہ نے صاف الفاظ میں پوچھا۔

"اچھا... گرل فرینڈ تھی... کیا کر لو گی تم؟" تیمور نے ڈھٹائی سے کہا۔

"بیوی کے سامنے دوسری عورت کا ذکر کر کے پوچھ رہے ہو کہ کیا کر لوں گی میں...؟"

"تو پھر کیوں پوچھ رہی ہو... میں مرد ہوں خود مختار... تم سے ڈرتا نہیں میں جو چھپاؤں گا۔"

"اگر میں بھی آپکی طرح کرنے لگوں.. تو کیسا لگے گا آپکو؟"

"بکواس بند کرو اپنی... تمہاری ہمت کیسے ہوئی مجھ سے اس طرح کی بات کرنے کی؟"

"جیسے آپکی ہمت ہوئی ہے مجھ سے ایسی بات کرنے کی..."

"میرے ساتھ زبان نہیں چلاؤ... ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔" تیمور نے دھمکی دی تھی۔

"پہلے کونسا اچھا ہو رہا ہے میرے ساتھ...؟"

"اوہ.. تو مہارانی صاحبہ پہ بہت ظلم وستم ہو رہے ہیں ناں یہاں... بیچاری کو دن رات گھر کے کام جو کرنے پڑتے ہیں۔" تیمور نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"کاش کہ صرف گھر کے کام ہی کرنے پڑتے۔ لیکن آپ لوگ مجھ سے میرے صبر اور برداشت کا امتحان لے رہے ہو۔"

"تو کیا مجبوری ہے...؟ نہ کرو برداشت جاؤ چلی جاؤ جہاں تمہارا دل چاہتا ہے۔"

"مجبوری تو کوئی نہیں ہے میری کہ یہ سب برداشت کروں لیکن آپ شاید میرے صبر کو میری کمزوری اور مجبوری سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"ہاں کوئی تو مجبوری اور کمزوری ہوگی ناں جو تمہارے گھر والوں نے تمہیں میرے سر تھوپ دیا ہے... ایسے ہی تو کوئی نہیں بیاہتا اپنی بیٹی کو خود سے کم حیثیت لوگوں میں.. جبکہ وہ خوبصورت بھی ہو اور پڑھی لکھی بھی۔" تیمور نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو نہ کرتے مجھ سے شادی اگر آپکو اتنا ہی شک تھا... آپکی ماں ہی جوتیاں گھساتی ہوئی آتی تھی۔"

"ترس آگیا تھا تمہارے بوڑھے ماں باپ پہ جو مرے جا رہے تھے تمہیں بیاہنے کے لئے۔"

"میرے ماں باپ پہ ترس آیا تھا یا ہماری دولت دیکھ کر منہ میں پانی آ گیا تھا..؟" عرشیہ نے بھی تیمور کی سی لہجے میں جواب دیا تو وہ تلملا اُٹھا۔

"بکواس بند کرو ورنہ تمہارا منہ توڑ دوں گا میں..."

"تم جیسا کمزور مرد اور کر بھی کیا سکتا ہے..؟"

"مجھے کبھی بھی کمزور نہ سمجھنا..تمہارا زرخرید غلام نہیں ہوں میں سمجھی تم۔ اور اگر غلام ہی چاہیے تو جاؤ جا کر اپنے باپ سے کہو تم گھر داماد خرید دے کہیں سے...بڑی دولت ہے ناں اُسکے پاس..." تیمور نے ذلت آمیز لہجے میں کہا۔

"بس بہت ہو گیا تیمور...اب ایک لفظ اور برداشت نہیں کروں گی۔"

"تو مت کرو..میں بھی اب مزید کوئی بکواس برداشت نہیں کر سکتا...چلی جاؤ یہاں سے"

"سچ تم سے برداشت ہو گا بھی کیسے..؟"

"نکل جاؤ میرے کمرے سے باہر..."

تیمور نے چلا کر کہا تو عرشیہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ لاؤنج میں آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی اسکے علاوہ وہ اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ تقدیر نے اُسے ایسے مقام پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں آگے کوئی منزل نظر نہیں آتی تھی۔ جہاں بس اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ تیمور سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتی تھی لیکن اپنے والدین کو دکھی بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ عرشیہ نے تیمور کے لئے اپنا بہت کچھ قربان کیا تھا اپنی عزت نفس، اپنا مال، اور سب سے بڑھ کر اُسکی بدسلوکی اور شک و شبہات میں ڈوبے ہوئے طنز اور طعنے جو اُسکی کردار کشی کرتے تھے برداشت کیے صرف اسلئے کہ وہ اس رشتے اور تعلق کو نبھا سکے لیکن یہ رشتہ یک طرفہ طور پہ کبھی بھی نبھایا نہیں جا سکتا۔ شوہر اور بیوی زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں اور یہ گاڑی ایک اکیلا پہیہ نہیں چلا سکتا۔ عرشیہ وہیں صوفے پہ ہی سو گئی تھی روتے روتے کب اُسکی آنکھ لگ گئی اُسے کچھ ہوش نہیں رہا۔ صبح جب اُسکی آنکھ کھلی تو پورے جسم میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور شدید نقاہت کے باعث اُٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ ایسے ہی لیٹی رہی اور اپنی ہمت مجتمع کرتی رہی۔ کچھ دیر بعد وہ اُٹھ کر کمرے کی طرف چل دی لیکن کمرے میں تیمور نہیں تھا۔ عرشیہ نے گھڑی کی طرف دیکھا تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑی رہی تھی لیکن تیمور یا اُسکے ماں اور بہنوں میں سے کسی کو احساس نہیں ہوا کہ اُسکا حال ہی پوچھ لیں اور کوئی دوا ہی کھلا دیں۔ "عرشی تم دیکھنا تیمور تمہاری کتنی قدر کرے گا..یہ سب کچھ جو ہم تجھے دے رہے ہیں اور جتنی تم پیاری اور فرمانبردار ہو ناں دیکھنا سب کتنا پیار کریں گے تم سے سسرال میں..." صبیحہ بیگم کے الفاظ عرشیہ کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اور آنسو آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے تو عرشیہ چلا اُٹھی "امی...ابو...دیکھیں آ کر کتنی قدر کی جا رہی ہے آپکی بیٹی کی...دیکھیں کتنا پیار مل رہا ہے مجھے یہاں..." بند کمرے میں عرشیہ کی آہیں اور سسکیاں گونج رہیں تھیں لیکن وہاں اُسکا کون تھا جو اُسکے درد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا۔

☆......☆......☆

کامران احمد صاحب ٹی۔وی لاؤنج میں بیٹھے صبح کی چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھ رہے تھے اور صبیحہ بیگم کچن میں ملازمہ کو کھانے کے بارے میں تفصیلاً ہدایات دے کر لاؤنج میں آکر احمد صاحب کے قریب بیٹھ گئیں۔

''عرشی کے ابا۔''

''فرمایئے میری بیگم صاحبہ...'' احمد صاحب نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

''مجھے عرشی کی بہت یاد آرہی ہے...اور دل بڑا بے چین ہو رہا ہے اُسکی طرف سے۔''

''کیوں بھئی...خیریت تو ہے ناں؟''

''بس پتہ نہیں کیوں...دل میں عجیب عجیب سے وہم آرہے ہیں۔ وہ فون بھی نہیں اُٹھا رہی اور جب بھی بات ہو مختصری ہوتی ہے...اتنے دن سے وہ ملنے بھی نہیں آئی۔''

''ارے بیگم صاحبہ...اب وہ اپنے گھر والی ہوگئی ہے ناں تو مصروف تو رہے گی...اور ویسے بھی بڑی ہے گھر کی تو ذمہ داری بھی اُسکے کندھوں پہ آگئی ہے...دیکھا نہیں تھا شبانہ کی منگنی پہ کیسے میری بچی بڑوں کی طرح ہر کام کرواتی پھر رہی تھی۔''

''کہہ تو آپ ٹھیک رہے ہیں...لیکن پھر بھی عجیب سی بے چینی اور پریشانی دل کو کھائے جارہی ہے...کل رات میں خواب بھی بڑا عجیب سا دیکھا۔''

''آپ پریشان نہ ہوں سب ٹھیک ہوگا۔ ہم ایسا کرتے ہیں آج یا کل اُسے مل آئیں گے جاکر اس طرح آپکا وہم بھی دور ہوجائے گا۔''

''ٹھیک ہے ہم کل ضرور جائیں گے عرشی کو ملنے...''

''بس آپ پریشان نہ ہوں اور اُسے فون کرلیجئے گا دوبارہ...''

کامران احمد دوبارہ چائے پینے میں مصروف ہوگئے اور صبیحہ بیگم کچن میں جاکر ملازمہ سے گھر کے کاموں کے بارے میں پوچھنے لگیں۔ لیکن اُنکا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔

ماں باپ کا دل اپنی اولاد کے لئے کتنا حساس ہوتا ہے کہ اولاد کے حال کی خبر نہ بھی ہو تب بھی اُنکے دل کو خبر رہتی ہے۔ صبیحہ بیگم سارا دن عرشیہ کی خیریت کی دعائیں مانگتی رہیں اور خدا کے آگے سجدہ ریز ہوکر اپنی بیٹی کی خوشیوں کی دعا کرتی رہیں۔ عرشیہ بخار میں بیڈ پہ بے سدھ پڑی رہی لیکن کسی نے بھی اُسکا حال پوچھنا گوارہ نہیں کیا۔ اُسکا موبائل چارج نہ ہونے کی وجہ سے بند پڑا ہوا تھا اور گھر کے نمبر پہ کوئی فون نہیں اُٹھا رہا تھا۔ اُدھر صبیحہ بیگم کا پریشانی سے برا حال تھا۔ تیمور رات کو بارہ بجے کے قریب گھر پہنچا تو عرشیہ سو رہی تھی۔ اُس نے قریب آکر چہرے سے کمبل ہٹایا اور ماتھے پہ ہاتھ رکھا اُسکا ماتھا ٹھنڈا تھا جو شاید بخار میں پسینہ آنے کی وجہ سے ہوا تھا۔ لیکن یہ بات تیمور جیسا بے حس انسان کیسے سوچ سکتا تھا اسلئے دوبارہ کمبل اُسکے منہ پہ ڈال دیا اور یہ بھی معلوم کرنا گوارہ نہ کیا کہ اُس نے کچھ کھایا بھی ہے یا

نہیں۔صبح کے نو بج رہے تھے جب تیمور آفس جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا تو رخسانہ بیگم دندناتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

''ارے۔۔یہ نواب زادی اب تک پڑی سو رہی ہے۔۔؟'' عرشیہ کو بیڈ پہ لیٹا دیکھ کر رخسانہ بیگم نے کینہ توز نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے تیمور سے پوچھا۔

''جی ہاں۔۔اب یہ بھی کوئی نیا ڈرامہ لگتا ہے محترمہ کا۔'' تیمور نے شرٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے کہا۔

''تو گھر کے کام کیا اِسکے باپ کے نوکر کریں گے آکر۔۔؟'' رخسانہ بیگم نے بیٹے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم۔۔؟ جا کر پوچھ لیں خود ہی۔۔'' تیمور نے لاپرواہی سے کہا۔

''او بیگم صاحبہ۔۔اُٹھ جاؤ اب۔تمہارے باپ نے نوکر نہیں بھیجے تھے جہیز میں ساتھ جو ایسی بے خبر پڑی سو رہی ہو۔'' رخسانہ بیگم نے عرشیہ کے اوپر سے کمبل کھینچتے ہوئے کہا۔

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔۔مجھ سے آج کوئی کام نہیں ہوگا۔'' عرشیہ نے نقاہت سے بولا۔

''اچھی بھلی کل سے پڑی نیندیں پوری کر رہی ہو۔۔چلو اُٹھو چل کر کچن کا کام دیکھو۔''

''مجھے کل سے بخار ہے امی۔۔کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔۔مجھ سے نہیں ہوگا کچھ بھی۔۔''

''اچھا تو اب ہم تمہارے منہ میں نوالے ڈالیں گے تو اُٹھو گی۔۔؟''

''میں نے ایسا کب کہا۔۔آپ فرزانہ سے کہہ دیں کہ کچن کا کام دیکھ لے۔''

''میں یہاں تم سے مشورے لینے نہیں آئی تھی۔۔چلو نکلو بستر سے اور چل کر کام کرو۔سب بخار وخار اُتر جائے گا۔''

''تمہیں سنائی نہیں دے رہا امی کیا کہہ رہی ہیں؟'' تیمور نے گرجدار آواز میں کہا تو عرشیہ سے برداشت نہ ہوا۔

''نہیں دے رہا سنائی۔۔ایک بار کہہ دیا ہے مجھ سے نہیں ہوگا تو نہیں ہوگا۔'' عرشیہ نے اٹل لہجے میں کہا۔

''توبہ توبہ۔۔دیکھو تو کیسے زبان چلا رہی ہے ساس اور شوہر کے سامنے۔۔۔ارے تیمور تیری تو دو کوڑی کی عزت نہیں۔دیکھ کیسے تجھے منہ توڑ جواب دے دیا۔'' رخسانہ بیگم نے دیدے نکالتے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولا۔

''چلو اُٹھو۔۔ابھی تمہیں بتاتا ہوں زبان کیسے چلائی جاتی ہے۔۔'' تیمور عرشیہ کو بازو سے کھینچتا ہوا نیچے لے آیا اور رخسانہ بیگم بھی ساتھ ساتھ نیچے اُتر آئی۔

''چھوڑو مجھے۔۔۔تیمور۔۔۔چھوڑو میرا ہاتھ۔۔'' عرشیہ چلاتی رہی لیکن اُس ایک نہ سنی۔

''ابھی اور اسی وقت جو میری ماں نے بولا ہے وہ کام کرو۔۔۔ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا اگر تم نے اب زبان چلائی تو۔۔'' تیمور نے غصے سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نہیں کر سکتی۔۔بتا چکی ہوں۔'' عرشیہ نے پھر سے کہا۔

"کیوں نہیں کر سکتی...؟اپنے آپ کو کوئی شہزادی سمجھتی ہو یا مہارانی ہو کہیں کی جو تمہیں کوئی کام نہ کہے؟" تیمور نے طنز بھرے انداز میں کہا۔

"مہارانی نہیں ہوں تو کوئی نوکرانی بھی نہیں ہوں تم ماں بیٹے کی کہ جو تم لوگ کہو میں کرتی رہوں اور پھر بھی میرے ساتھ ایسا جانوروں جیسا سلوک کیا جائے...سمجھے تم۔" عرشیہ آخر پھٹ پڑی۔

"تو پھر اپنے باپ سے کہنا تھا تمہیں ایسے گھر میں بیاہتا جہاں تمہارے ساتھ شہزادیوں جیسا سلوک کیا جاتا... یہاں کیوں پھینک دیا تمہیں...؟" ایک اور طنز نے عرشیہ کا دل چیر دیا۔

"غلطی ہو گئی میرے ماں باپ سے...قسمت خراب تھی میری جو یہاں آ گئی میں۔" عرشیہ نے چلا کر کہا تو اُسکی آواز رندھ گئی اور آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"غلطی تو ہم سے ہوئی ہے بی بی... پتہ نہیں کیا عیب تھا تم میں جو تمہارے ماں باپ نے ہمارے سر تھوپ دیا تمکو ورنہ یہ امیر لوگ کہاں کرتے ہیں ہم جیسے متوسط طبقے میں شادی...؟" رخسانہ بیگم نے مداخلت کی اور سر پیٹتے ہوئے کہا۔

"اگر عیب ہی لگا لئے تھے تو نہ کرتے شادی...کس نے مجبور کیا تھا آپ لوگوں کو...لالچ نے اندھا کر رکھا تھا ناں..." عرشیہ نے کہا۔

"بکواس بند کرو۔تم ہو کیا چیز...جو میری ماں کو لالچی کہہ رہی ہو؟" تیمور اُسکی طرف دیکھتے ہوئے گرجا تھا۔

"تم خود کیا چیز ہو...میرے اور میرے باپ کے پیسے پہ عیاشیاں کرتے پھر رہے ہو اپنا کاروبار چمکایا...تمہاری اوقات سے بڑھ کر تمہیں سب کچھ ملا اور میرے کندھوں پہ پیر رکھ کر اپنا قد بڑھانے والے آج مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ میں کیا چیز ہوں...تم لوگوں کی اپنی اوقات کیا ہے...؟"

عرشیہ نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا تو تیمور نے اُسکے نازک رخسار پہ ایک زناٹے دار تھپڑ دے مارا۔عرشیہ گھوم کر دور جا گری۔داخلی دروازے پہ کھڑے کامران احمد اور صبیحہ بیگم نے اپنی لاڈلی پہ ظلم کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھا تو اُنکا دل پاش پاش ہو گیا۔

"تیمور...تمہاری جرات کیسے ہوئی میری بچی پہ ہاتھ اُٹھانے کی...؟" کامران احمد نے گرجدار آواز میں تیمور کو للکارا تو سب حیرانی سے اُنکی طرف دیکھنے لگے۔وہ سب جھگڑنے میں اتنے بے خبر ہو گئے تھے کہ آس پاس کون ہے کسی کو پتہ ہی نہیں چلا۔کامران صاحب کو دیکھ کر لڑائی کا مزہ لیتی ہوئی شبانہ اور فرزانہ دونوں کمرے میں بھاگ گئیں۔رخسانہ بیگم بھیگی بلی بنی کھڑی رہی اور تیمور کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کہے۔صبیحہ بیگم دوڑ کر اپنی لاڈلی کی طرف لپکی تھیں جو اس وقت نیم بے ہوشی کی سی حالت میں فرش پہ پڑی تھی۔

"بھائی صاحب...آ...آپ لوگ...کب آئے...؟" رخسانہ بیگم نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"جب آپ لوگ ہماری بیٹی کے ساتھ لاوارثوں والا سلوک کر رہے تھے تب..." کامران احمد نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا تھا۔

"آپ بیٹھیں اور پوری بات سن کر فیصلہ کیجئے گا کہ غلطی کس کی تھی.." رخسانہ بیگم نے مکاری سے اُنکے غصے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"ہماری پھول سی بچی پہ جس طرح دست درازی کی جارہی تھی اُسے دیکھنے کے بعد کچھ کہنے کی اور سننے کی ضرورت نہیں رہی۔" کامران احمد نے سخت اور اٹل لہجے میں کہا۔

"بالکل سہی کہہ رہے ہیں آپ...آپکی بیٹی اس قابل نہیں کہ کسی گھر میں بسائی جائے..اسکی زبان اسے کہیں بسنے نہیں دے گی۔" رخسانہ بیگم نے اپنا اصل روپ دکھاتے ہوئے کہا۔

"دراصل یہ شخص اس قابل نہ تھا جسکے حوالے میں نے اپنی ہیرے جیسی بیٹی کردی تھی..." ندامت میں ڈوبی ہوئی آواز میں کامران احمد نے کہا۔

"عرشی کے ابا... چلئے یہاں سے..اب میں اپنی بچی کو اس گھر میں نہیں چھوڑوں گی۔" صبیحہ بیگم نے روتے ہوئے کہا تھا اُنہوں نے عرشیہ کو خود سے چمٹا رکھا تھا۔ تیمور وہیں کھڑا یہ سب تماشہ دیکھ رہا تھا لیکن اُسکے منہ کی جیسے اب زبان گنگ ہوگئی تھی۔

"ٹھیک ہے تم عرشی کا ضروری سامان لے آؤ..تو چلتے ہیں۔" کامران احمد نے کہا تو صبیحہ بیگم عرشی کے کمرے سے اُس کا موبائل اور چند دوسری ضروری چیزیں لے آئیں۔

"تمہیں تو میں کورٹ میں دیکھوں گا..." کامران احمد نے تیمور کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور عرشیہ کو اپنے ساتھ لے کر چلے گئے۔ رخسانہ بیگم اور تیمور اُنکو جاتا دیکھتے رہے۔

باب نمبر۶

حیدر بے چینی سے آپریشن تھیٹر کے باہر چکر لگا رہا تھا۔ آنسو اُسکی آنکھوں سے مسلسل بہہ رہے تھے۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے بار بار زویا کا خون میں لت پت وجود گھوم رہا تھا۔ اسد بھی اُسکے ساتھ ہی آپریشن تھیٹر کے باہر موجود تھا۔

"حیدر پلیز بیٹھ جاؤ... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" اسد نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"کیسے بیٹھ جاؤں... وہ میری وجہ سے اس حال میں پہنچی ہے... میری زویا زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اور تم کہتے ہو میں چین سے بیٹھ جاؤں۔" حیدر نے روتے ہوئے کہا۔

"حیدر میرے دوست... پلیز حوصلہ رکھو۔ انشاءاللہ زویا ٹھیک ہو جائے گی اُسے کچھ نہیں ہوگا۔"

"اُس نے مجھے بچانے کے لیئے اپنی جان کی بازی لگا دی اسد... میں کیسے اتنا لاپرواہ ہو سکتا ہوں... وہ تو معصوم ہے کچھ نہیں جانتی تھی... میں تو سب جانتا تھا پھر میں نے کیسے اپنے ساتھ ساتھ اُسے بھی خطرے میں ڈال دیا... کیسے اتنا لاپرواہ ہو گیا تھا میں..." حیدر نے ہچکیوں سے روتے ہوئے کہا۔

"حیدر پلیز حوصلہ رکھو۔"

"اگر اُسے کچھ ہو گیا ناں... تو میں کبھی بھی خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔ میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔" حیدر نے دکھ بھرے لہجے میں بھیگی آنکھوں سے بولا۔

"میں نے زویا کے گھر پہ کال کر کے اُنکو اطلاع تو دے دی ہے لیکن اب مجھے ڈر لگ رہا ہے معلوم نہیں کہ زویا کے ڈیڈی کس طرح ری ایکٹ کریں گے..." اسد نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے؟" حیدر نے آنسو پونچھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"یار تم تو جانتے ہو زویا کے ڈیڈی ایک بزنس ٹائیکون ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی ہیں۔ زویا کو گولی لگنا کوئی چھوٹی بات نہیں... میڈیا میں خبر پھیل جائے گی کہ سکندر حیات خان کی بیٹی کو کسی نے گولی مار دی..."

"لیکن وہ گولی زویا کی جان لینے کے لئے نہیں میری جان لینے کے لئے چلائی گئی تھی..."

"تمہارے گارڈز نے اب تک تمہارے بابا کو خبر کر دی ہو گی..؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں اب تک تو معلوم ہو چکا ہو گا... اور بہت جلد بابا جان لاہور آ جائیں گے تا کہ مجھے اپنے ساتھ لے جا سکیں۔" حیدر نے

بے بسی سے کہا۔

"پھر تم کیا زویا کو اس حال میں چھوڑ کر چلے جاؤ گے..؟" اسد نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں بالکل بھی نہیں... میں کسی نہ کسی طرح انہیں سمجھا لوں گا..."

دونوں آپریشن تھیٹر کے باہر کھڑے تھے جب ایک نرس تھیٹر سے باہر آئی۔

"سسٹر..زویا کیسی ہے..سب ٹھیک تو ہے ناں؟" حیدر نے نرس کی طرف لپکتے ہوئے پوچھا۔

"آپریشن چل رہا ہے...خون کافی بہہ چکا ہے..ہوسکتا ہے بلڈ کا ارینج کرنا پڑے آپکو فی الحال تو ضرورت نہیں لیکن آپ لوگ ریڈی رہیں۔" نرس نے تفصیلاً بتایا۔

"جو بھی کرنا پڑے ہم کریں گے..آپ بس میری زویا کو بچالیں.." حیدر نے بے چینی سے کہا۔

"ڈاکٹرز پوری کوشش کررہے ہیں آپ پریشان نہ ہوں۔" نرس نے کہا اور واپس تھیٹر میں چلی گئی۔ ایک گھنٹے بعد ڈاکٹرز آپریشن تھیٹر سے باہر آئے تو اسد اور حیدر دونوں بے چینی سے اُنکی طرف بڑھے۔

"ڈاکٹر صاحب..زویا..؟" حیدر نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

".she is Alright now بولٹ اُنکی کندھے میں پھنس گئی تھی جسے کامیاب آپریشن کرکے نکال دیا گیا ہے....لیکن بلڈ کافی ضائع ہوگیا ہے۔" ڈاکٹر نے بتایا تو حیدر نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

"ہم کب تک مل سکیں گے ڈاکٹر صاحب..؟" اسد نے پوچھا۔

"بس تھوڑی دیر میں روم میں شفٹ کردیں گے تو آپ لوگ مل سکیں گے..آپ میرے ساتھ آئیے۔" ڈاکٹر نے اسد سے کہا۔

"کوئی خطرے والی بات تو نہیں ڈاکٹر...؟" حیدر نے بیتابی سے پوچھا۔

"جی نہیں..just formalities" ڈاکٹر نے کہا۔

زویا کو روم میں شفٹ کردیا گیا تو حیدر اُسے دیکھنے کے لئے کمرے میں داخل ہونے لگا اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اُسکا ایک ایک قدم منوں بھاری ہورہا ہے۔ اُسکا دل شدتِ جذبات سے پھٹے جارہا تھا اور آنسو جیسے رُکنے کے نہیں تھے۔ اس نے آج سے پہلے زویا کی محبت کی شدت کو اس طرح سے محسوس نہیں کیا تھا۔ زویا اُس سے محبت کرتی ہے وہ یہ بات جانتا تھا لیکن اس حد تک کرتی ہے کہ اُسکی خاطر اپنی جان دینے سے بھی گریز نہیں کرے گی اُسے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔ زویا بیڈ پہ بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اُسکے منہ پہ آکسیجن ماسک لگا ہوا تھا اور ایک ہاتھ پہ ڈرپ لگی ہوئی تھی۔ ایک نرس کھڑی کوئی انجکشن ڈرپ میں ڈال رہی تھی۔ حیدر پاس رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا۔ مسلسل ٹینشن لینے سے حیدر سے اب کھڑا ہونا بھی دوبھر ہوگیا تھا۔ وہ کرسی پہ بیٹھ کر زویا کو غور سے دیکھنے لگا تھا۔ اُسکا حسین چہرہ ایک دم سپاٹ محسوس ہورہا تھا۔ حیدر کو اُسے اس حال میں دیکھ کر شدید رنج اور ملال ہورہا تھا۔

"کاش میں نے تمہاری بات نہ مانی ہوتی زویا تو آج تم اس حال میں نہ پہنچتی... میں کتنا منحوس ہوں ناں... میری وجہ سے تمہاری یہ حالت ہوگئی ہے... نہ میں تمہارے ساتھ ہوتا اور نہ تمہیں نقصان پہنچتا۔" حیدر آنسو بہاتا ہوا کہتا چلا جارہا تھا جیسے زویا اسکی بات بے ہوشی میں بھی سمجھ سکتی ہو۔

"اگر تمہیں کھو دیتا تو میں خود بھی زندہ نہ رہتا... زویا تم نے محبت میں مجھے بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے... تم مجھ سے اتنا آگے نکل جاؤ گی میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔" حیدر اُسے تکتے ہوئے بولتا جارہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز پہ چونک کر خاموش ہوا۔ اسد کے ساتھ کوئی تھا جسے پہچاننے میں حیدر کو زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ وہ زویا کو دیکھتے ہی اُسکی طرف لپکا تھا اور دکھ بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا اور اُسکا ہاتھ چوم لیا۔ اُسکے چہرے پہ غم و غصے کی کیفیات صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اچانک اُسکی نظر بیڈ کی دوسری جانب کھڑے ہوئے حیدر پہ پڑی تھی اور وہ بغور اُسے دیکھنے لگا۔

"انکل یہ حیدر علی گیلانی ہے ہمارا دوست اور کلاس فیلو... اور حیدر یہ زویا کے ڈیڈی... ہم سب ساتھ ہی تھے حادثے کے وقت۔" اسد نے دونوں کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

"اسلام وعلیکم انکل..." حیدر نے سکندر حیات خان کی طرف مصافحہ کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"حیدر علی گیلانی Son of Peer Shehbaz Ali Gillani" سکندر حیات نے گہری نظروں کے ساتھ حیدر کو دیکھتے ہوئے مصافحہ کرتے ہوئے کہا جیسے تصدیق کر رہا ہو۔

"جی... بالکل سہی پہچانا آپ نے۔" حیدر نے خود اعتمادی سے کہا۔

"تو یہ تم ہو جس کی وجہ سے میری بیٹی اس حال میں پہنچی ہے...؟" سکندر حیات کی آنکھوں سے جیسے شعلے نکل رہے تھے۔

"یہ سچ ہے کہ جو گولی زویا کو لگی وہ میری جان لینے کے لئے چلائی گئی تھی لیکن میں نے زویا کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا..." حیدر نے وضاحت کی تھی۔

"انکل اس میں حیدر کا کوئی قصور نہیں... ہم سب لنچ کرنے کے بعد ریسٹورنٹ سے نکل رہے تھے کہ اچانک دو نامعلوم آدمی فائرنگ کر کے بھاگ گئے۔" اسد نے بھی بتایا۔

"آج کے بعد میری بیٹی کے آس پاس بھی نہ بھٹکنا... میں نہیں چاہتا کہ میری بچی کی زندگی کسی کی وجہ سے خطرے میں پڑ جائے۔" سکندر حیات نے نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"آپ سہی کہہ رہے ہیں سر... میں آئندہ زویا سے دور رہوں گا۔" حیدر نے دکھ بھرے لہجے میں کہا اور سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسد اُسے باہر جاتا دیکھ کر جلدی سے اُسکے پیچھے لپکا تھا۔ سکندر حیات خان بیڈ کے نزدیک رکھی کرسی پہ بیٹھ کر اپنی لاڈلی بیٹی کا چہرہ تکنے لگے تھے۔ وہ اس بات سے بے خبر تھے جو معاملات زویا اور حیدر کے درمیان چل رہے تھے۔ اُنکے خیال میں دونوں یونیورسٹی میں کلاس

فیلو اور دوست تھے اور اکٹھے ہونے کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آ گیا۔ زویا کو ہاسپٹل پہنچانے کے بعد حیدر نے اپنے والد پیر شہباز علی گیلانی کو فون کر کے تمام حالات سے باخبر کر دیا تھا تاکہ وہ اس حادثے کا پولیس کیس بننے سے روک سکیں اور اپنے طور پہ اسکو حل کر سکیں۔ حیدر ہاسپٹل سے باہر نکل کر لان میں بیٹھ گیا تھا جہاں اُسکے گارڈز اپنی بندوقیں تانے کھڑے تھے۔ اسد بھی دوڑتا ہوا اُسکے پیچھے چلا آیا تھا۔

''کیا ہوا حیدر... تم انکل کی باتوں کو دل پہ لے گئے ہو؟'' اسد نے اُسکے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں اسد... اُنہوں نے بالکل سچ کہا ہے اور اُنکا حق بھی بنتا ہے کہنے کا۔'' حیدر نے شکستہ لہجے میں جواب دیا۔

''زویا اُنکی بے حد لاڈلی بیٹی ہے اسلئے وہ اُسکے لئے بہت پریشان ہیں... اور ہونا بھی چاہیے یہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں ہے۔'' اسد نے کہا۔

''اُسکے باپ ہیں وہ... ایسا کہہ سکتے ہیں... اور سچ بھی یہی ہے کہ میری وجہ سے تم سب کو بھی خطرے کا سامنا کرنا پڑا۔'' حیدر مایوس کن لہجے میں حقیقت بیان کر رہا تھا۔

''میرے خیال میں تمہارے بابا آ گئے ہیں۔'' اسد نے پارکنگ میں کالے شیشوں والی گاڑی اور دوسری مسلح گارڈز سے بھری گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے حیدر سے کہا۔

''ہاں... یہ بابا جان ہی ہیں۔'' حیدر نے بینچ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

پیر شہباز علی گیلانی اپنے پورے پروٹوکال کے ساتھ ہسپتال پہنچ چکے تھے۔ گاڑی سے اُتر کر وہ حیدر کی جانب بڑھے تھے۔

''تم ٹھیک تو ہو ناں پتر...؟'' پیر شہباز علی گیلانی نے حیدر کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''جی بابا جان... میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' حیدر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اور وہ لڑکی... تمہاری کلاس فیلو اب کیسی ہے؟'' پیر شہباز نے اپنے روایتی رُعب دار انداز میں پوچھا۔

''جی اب ٹھیک ہے... شکر ہے جان بچ گئی۔'' حیدر نے بتایا۔

''کیوں پتر اسد... کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا پولیس ولیس کا؟'' پیر شہباز نے اسد کو مخاطب کیا۔

''جی انکل... آپکے ہوتے ہوئے ایسا کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے کیا... سب ٹھیک رہا۔''

''لڑکی کے گھر والے پہنچ گئے ہیں کیا...؟''

''جی ہاں... اُسکے ڈیڈی سکندر حیات خان صاحب اس وقت ہاسپٹل میں موجود ہیں۔'' اسد نے کہا۔

''بابا جان... کیا آپ ملیں گے اُنکو؟'' حیدر نے سوال کیا۔

''نہیں... تم بس یہاں سے چلو... یہ جگہ محفوظ نہیں تمہارے لئے۔''

''لیکن بابا جان... ابھی تو زویا ہوش میں بھی نہیں آئی تو میں کیسے یہاں سے چل دوں؟'' حیدر نے حیرانگی سے کہا۔

" ٹھیک ہے پیر جی...ہم آپ سے جو کہہ رہے ہیں آپ وہی کریں گے۔ پہلے ہی آپکی لاپرواہی نے ایسے حادثے کو دعوت دی ہے۔" پیر شہباز نے رعبدار لہجے میں کہا تو حیدر کی سماعتوں میں سکندر حیات کے الفاظ گونج اُٹھے" آئندہ میری بیٹی کے آس پاس بھی نہ بھٹکنا۔"

" ٹھیک ہے بابا جان...چلیں۔" حیدر نے سر جھکاتے ہوئے کہا جیسے سب کچھ ہار گیا ہو۔

" حیدر تم واقعی جا رہے ہو؟" پیر شہباز کے آگے نکلتے ہی اسد نے حیرت سے حیدر کو دیکھا۔

" ہاں اسد..." حیدر کا لہجہ مایوس کن تھا۔

" تم زویا کو اس حال میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہو؟" اسد کو حیرت ہوئی تھی۔

" تم نہیں سمجھو گے اسد...میرے دور رہنے ہی میں زویا کی بھلائی ہے۔" حیدر نے کہا اور اپنے باپ پیر شہباز علی گیلانی کی گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ اسد اُسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

" چلو زویا...اُٹھ کر بیٹھو میں تمہارے لئے سوپ بنا کر لائی ہوں۔" مہرو نے زویا کے کمرے میں آ کر کھڑکی سے پردے ہٹاتے ہوئے کہا۔ زویا کو گھر آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اور اب اُسکی صحت کافی بحال ہو چکی تھی۔

" مہرو سونے دو پلیز..." زویا نے منہ کو کمبل سے ڈھانپتے ہوئے کہا۔

" بس کرو اور کتنا سونا ہے تم نے...گیارہ بج رہے ہیں۔" مہرو نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

" ابھی صرف گیارہ بجے ہیں...ایک گھنٹہ اور سونے دو۔" زویا نے کمبل میں سے منہ نکال کر کہا اور پھر سے کمبل میں گھس گئی۔

" جی نہیں...ابھی آپ اُٹھیں گی اور میں آپکو اپنے ہاتھوں سے سوپ پلاؤنگی۔ چلو شاباش۔"

" اُف...کیا مصیبت ہے؟" مہرو نے زویا کے اوپر سے کمبل کھینچا تو وہ غصے سے اُٹھ بیٹھی۔

" اُٹھو چلو...منہ دھو کر فریش ہو جاؤ پھر یہ سوپ پینا ہے۔"

" پکا دیا ہے تم نے مجھے سوپ پلا پلا کر..." زویا نے اکتاتے ہوئے کہا۔

" تمہارے جلد صحت یاب ہونے میں اسی سوپ اور یخنی کا کمال ہے میڈم..." مہرو نے کالر اُٹھاتے ہوئے خود اپنے سوپ کو سراہا۔

" ہونہہ...اپنے منہ میاں مٹھو۔" زویا نے منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔

" ہماری لاڈلی بیگم اُٹھ گئیں ہیں کیا...؟" سکندر حیات اور رخشندہ بیگم کمرے میں داخل ہوئے تو سکندر حیات نے زویا کو دیکھ کر کہا۔ زویا بھاگ کے اُنکے گلے سے لگ گئی۔

" ڈیڈی آپ مہرو کو سمجھائیں ناں...میں اب بالکل ٹھیک ہوں مجھے روز سوپ نہ پلایا کرے۔" زویا نے بچوں کی طرح شکایتی لہجے میں باپ سے کہا تو اُنہیں ہنسی آ گئی۔

"ارے بھئی مہرو... کیوں ہماری بچی کو تنگ کرتی ہو...؟" سکندر حیات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپکی لاڈلی مجھے تنگ کر رہی ہے ڈیڈی.. ادھر صحت ٹھیک ہوئی نہیں اور اس نے دوا اور کھانے پینے میں لاپرواہی کرنا شروع کر دی ہے۔" مہرو نے بھی شکایت کر دی۔

"جھوٹ بول رہی ہے ڈیڈی... روز زبردستی پلاتی ہے مجھے۔" زویا نے رونے والے انداز میں کہا۔

"اچھا بابا بس بس... بند کرو یہ بحث اور جاؤ جا کر فریش ہو جاؤ پھر ہم سب اکٹھے ناشتہ کریں گے۔" رخشندہ بیگم نے کہا۔

"یس موم..." زویا نے خوشی سے کہا اور واش روم چلی گئی۔

"مہرو بیٹا تم ٹیبل پہ ناشتہ لگواؤ... میں اور تمہاری امی اُدھر ہی آرہے ہیں۔" سکندر حیات نے کہا تو مہرو کچن کی طرف چل دیں اور سکندر حیات کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آگئے۔ رخشندہ بیگم ملازمہ کو زویا کے کمرے کی صفائی کا حکم دیتی ہوئی کچن کی طرف چل دیں۔

تھوڑی دیر بعد سب ڈائننگ ٹیبل پہ ناشتہ کر رہے تھے۔ زویا کو آج بہت بہتر محسوس ہو رہا تھا کیونکہ آج دو ہفتوں بعد وہ سب کے ساتھ بیٹھ کر نارمل لوگوں جیسا ناشتہ کر رہی تھی جس میں سوپ اور یخنی نہیں تھی۔

"زویا بیٹا... کتنے سمسٹر رہ گئے ہیں تمہارے؟" سکندر حیات نے زویا کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"صرف دو سمسٹر رہ گئے ہیں ڈیڈی۔" زویا نے چاکلیٹ سپریڈ سے بھرا ہوا توس منہ میں دباتے ہوئے کہا۔

"میں تو کہتی ہوں بس کرو اب... بہت ہو گئی پڑھائی.. پتہ نہیں کیسے خطرناک قسم کے دوست بنا رکھے ہیں یونیورسٹی میں جن پہ دن دہاڑے گولیاں چلائی جاتی ہیں۔" رخشندہ بیگم نے خوفزدہ اور نفرت آمیز لہجے میں کہا۔

"او کم آن موم... جیسے میرا تعلق ایک سیاسی خاندان سے ہے ویسے ہی حیدر کا بھی ہے اور اس طرح تو ڈیڈی کا بھی کوئی سیاسی حریف مجھ پہ فائرنگ کروا دیتا تو اس میں کسی اور کا قصور تو نہیں ہوتا اور نہ ہی میرا..." زویا نے ماں کو قائل کرنے کی کوشش کی۔

"یہاں اپنے گھر میں رہو گی تو کم از کم محفوظ تو ہو گی ناں.. اب اگر تم گئی تو میری جان سولی پہ لٹکی رہا کرے گی۔" رخشندہ بیگم کی باتوں سے پریشانی صاف ظاہر تھی۔

"تمہاری ماں ٹھیک کہہ رہی ہے زویا۔" سکندر حیات نے سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"تمہارے بھائیوں کو بھی میں نے اسی وجہ سے پاکستان سے باہر بھیج رکھا ہے تاکہ وہ ایک محفوظ ماحول میں تعلیم حاصل کریں۔"

"لیکن ڈیڈی.. ایسا روز روز تو نہیں ہوگا ناں اور ویسے بھی وہ حیدر کے باپ کے مخالفین کی حرکت تھی آپکے حریفوں کی نہیں..." زویا نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

"ہمیں تمہاری زندگی سے بڑھ کر اور کچھ عزیز نہیں ہے زویا... حرکت جسکی بھی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" مہرو نے بھی مداخلت کی۔

"چلو..اب تم بھی شروع ہو جاؤ..تمہاری کی تھی۔" زویا نے غصے سے منہ بنا کر کہا۔

"زویا..بدتمیزی نہیں کرو بڑی بہن سے.." رخشندہ بیگم نے ڈانٹا۔

"میرے صرف دو سمسٹر رہ گئے ہیں اور مجھے ہر حال میں اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے..اسکے علاوہ میں کچھ نہیں جانتی نہ ہی کسی اور چیز سے ڈرتی ہوں۔" زویا نے اٹل لہجے میں کہا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ میں تمہارا ایڈمیشن کسی اور یونیورسٹی میں کروا دیتا ہوں... باقی کے سمسٹر تم وہاں پورے کر لینا۔" سکندر حیات نے آپشن دیتے ہوئے کہا۔

"بات تو ایک ہی ہے..یونیورسٹی بدلنے سے کیا ہوگا..؟" زویا نے کہا۔

"کم از کم تمہاری جان تو چھوٹ جائے گی اپنے خطرناک دوستوں سے..." رخشندہ بیگم نے کہا۔

"پلیز آپ لوگ اس فضول کی بحث سے مجھے غصہ نہ دلائیں...دو سمسٹر ہیں بس سکون سے پورے کر لینے دیں..جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں اُس طرح دوست نہیں چھوٹتے۔" زویا نے اُکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔

"حد ہوتی ہے ضد اور ہٹ دھرمی کی زویا..اتنا کچھ ہو گیا اور ابھی بھی تم ہماری بات ماننے کو تیار نہیں ہو.." رخشندہ بیگم نے حیرت سے کہا۔

"مما پلیز...کچھ نہیں ہوگا..میں یونیورسٹی اور ہاسٹل سے باہر نہیں جایا کروں گی اب..پرامس۔" زویا نے اُمید بھری نظروں سے ماں اور باپ کو دیکھا۔

"او۔کے...جیسے تمہاری مرضی بیٹا۔" سکندر حیات نے کہا۔

"اوہ تھینکس ڈیڈی...یو۔آر گریٹ۔" زویا نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا اور وہ مسکرانے لگے۔

"اچھا اب جاؤ آرام کرو۔ٹھیک ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ تم پھر سے اُچھل کود شروع کر دو۔" سکندر حیات نے بیٹی کو پیار سے کہا۔

"یس باس.." زویا نے کہا تو مہرو بھی ہنس دی۔زویا اپنے کمرے کی طرف چل دی۔اور مہرو ملازمہ سے برتن اُٹھوانے لگی۔

"آپکے لاڈ پیار نے اسے اتنا ضدی اور خود سر بنا رکھا ہے خان صاحب۔" رخشندہ بیگم نے کہا تو سکندر حیات مسکرانے لگے۔

"کوئی شک نہیں..میری لاڈلی ہے وہ۔"

☆......☆......☆

زویا کو گھر آئے ایک ہفتے سے زیادہ ہو چکا تھا لیکن حیدر کی طرف سے نہ کوئی فون کال آئی اور نہ ہی حال پوچھنے کے لئے کوئی میسج۔زویا بہت بے چین تھی اور بار بار حیدر کو فون اور میسجز کر رہی تھی لیکن وہ کوئی جواب نہیں دے رہا تھا۔زویا کو حیرت کے ساتھ ساتھ دکھ بھی ہو رہا تھا لیکن اُسے حیدر کا اجنبی اور لاپرواہ رویہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔رات بھر وہ اُسے کالز اور میسجز کرتی رہی لیکن اُس نے کوئی کال

ریسو نہیں کی اور نہ ہی کسی میسج کا جواب دیا۔ زویا کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ حیدر اُسکے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے وہ بھی اُس وقت جب سب سے زیادہ اُسے حیدر کی ضرورت تھی۔ زویا کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے تھے۔ دکھ سے اُسکا کلیجہ کٹ کر رہ جاتا تھا لیکن حیدر کو اُس پہ رحم نہیں آ رہا تھا۔ "میں نے اُسکے لئے اپنی جان داؤ پہ لگا دی اور حیدر میرا حال بھی پوچھنے نہیں آیا۔ حیدر تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو..؟" وہ روتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ زویا اُسے یاد کر کے چھپ چھپ کر روتی تھی لیکن کسی پہ بھی اپنی حالت ظاہر نہیں ہونے دیا۔ دن بہ دن زویا کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی اور عجیب عجیب وسوسے اُسکے دل کو پریشان کئے دے رہے تھے۔ آخر تنگ آ کر اُس نے اسد کو کال کی۔

"ہائے اسد... کیسے ہو؟" زویا نے اسد کے موبائل پہ کال کی۔

"ہائے سویٹی... میں ٹھیک ہوں.. تم کیسی ہو اب؟" اسد کی پُر جوش آواز سنائی دی۔

"اب بالکل ٹھیک ہوں.. جلد ہی ہاسٹل آ کر یونیورسٹی جوائن کر لوں گی۔" زویا کا لہجہ بجھا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے زویا تم کچھ پریشان ہو؟" اسد نے اُسکی آواز کے بھاری پن کو محسوس کیا تھا۔

"ہاں اسد... میں بہت پریشان ہوں۔"

"مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے؟"

"حیدر کہاں ہے... کیا وہ یونیورسٹی آ رہا ہے؟"

"حیدر سے میری بات ہوئی تھی پرسوں.. وہ گاؤں گیا ہوا ہے اپنے بابا کے پاس۔"

"اسد وہ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہا۔ میری کال ریسو کرتا ہے اور نہ ہی کسی میسج کا جواب دیتا ہے.. اُسے ہو کیا گیا ہے؟ زویا کی آواز سے بے چینی اور تکلیف جھلک رہی تھی۔

"زویا میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے لیکن وہ ایسا کیوں کر رہا ہے اسکے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اسد نے کہا۔

"اسد پلیز تم اُسے کال کر کے کہہ سکتے ہو کہ وہ ایک بار مجھ سے بات کر لے؟"

"ہاں.. کیوں نہیں.. میں ابھی اُسے کال کر کے کہہ دیتا ہوں۔"

"اور اُسے یہ بھی پوچھ لینا کہ وہ یونیورسٹی کب سے آنا شروع کرے گا؟"

"ٹھیک ہے تم پریشان نہ ہو... اور جلدی سے ٹھیک ہو کر آ جاؤ۔"

"میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور جلد ہی ہاسٹل آ جاؤں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے اپنا خیال رکھنا۔ خدا حافظ۔"

"تم بھی اپنا خیال رکھنا اور حیدر کو کال ضرور کر دینا۔" زویا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

"اسکا مطلب ہے کہ حیدر جان بوجھ کر مجھ سے بات نہیں کر رہا۔ اسکا مطلب ہے وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا... ایسا کیسے ہو سکتا ہے...؟ میں نے خود اسکی آنکھوں میں اپنے لئے بے پناہ محبت دیکھی ہے... کیا وہ سب میری نظر کا دھوکا تھا... لیکن اگر ایسا بھی ہے تب بھی اُسے مجھ سے بات تو کرنی چاہیے تھی۔ ٹھکرا ہی دیتا مجھے اگر اپنا نہیں سکتا تھا تو۔ مجھے اس یقین اور بے یقینی کی جنگ میں یوں تنہا تو نہ چھوڑتا... میرا حال تو پوچھ لیتا.... حیدر کیا تمہیں میری تھوڑی سی بھی یاد نہیں آئی.... تم نے مجھے بھلا دیا تو میں کیوں تمہاری یاد میں تڑپ رہی ہوں... کیوں حیدر کیوں... کیوں کر رہے ہو ایسا میرے ساتھ..." زویا پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ صبح اُٹھی تو زویا کے پنک دیواروں والے بیڈ روم میں دن کی روشنی پھیل چکی تھی۔ پنک کلر کے پردوں سے جھانکتی سورج کی کرنیں اُسکے حسین چہرے پہ پڑ رہی تھیں۔ رات کو روتے روتے نہ جانے کب اُسکی آنکھ لگ گئی تھی اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ زویا نے اپنا سیل فون پہ میسجز چیک کیے لیکن حیدر کی کوئی بھی کال یا میسج نہیں آیا تھا۔ زویا کے چہرے پہ پھر سے مایوسی پھیل گئی تھی۔ بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ پڑا ہوا لیمپ بھی رات سے جل رہا تھا۔ زویا نے اُسکا سوئچ آف کیا اور بیڈ سے اُتر کر کھڑکی کی طرف چل دی۔ پنک پردوں کو ہٹا کر وہ باہر لان کا نظارہ دیکھنے لگی تھی۔ ٹھنڈی ہوائیں اور معطر فضا دماغ کو سکون دے رہے تھے۔ رات بھر روتے رہنے سے اُسکے سر میں شدید درد تھا۔ حیدر کی یاد اُسکے دل کو تڑپا رہی تھی اسلئے اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اُسے کال نہیں کرے گی بلکہ خود اس سے مل کر ساری بات کرے گی پھر چاہے وہ محبت کا اقرار کرے چاہے انکار کرے لیکن وہ اس اُمید اور نا اُمیدی والی کیفیت سے باہر نکلنا چاہتی تھی۔ ابھی وہ کھڑکی میں کھڑی یہی باتیں سوچ رہی تھی کہ اُسکا موبائل فون بجنے لگا۔ سکرین پہ اسد کا نام جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو۔" زویا نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"ہائے پرنسس... کیسی ہو؟" اسد کی خوشگوار آواز کانوں میں اُتری۔

"ٹھیک ہوں..." زویا کی لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"کب تشریف لا رہی ہیں میڈم آپ...؟"

"کل آجاؤں گی... یہ بتاؤ حیدر آ گیا ہے؟"

"ہاں وہ لاہور آ گیا ہے... کہہ رہا تھا کل سے یونیورسٹی ریگولر آئے گا... ویسے بھی اس سمسٹر کے لیکچرز بھی کل سے ہی سٹارٹ ہونے ہیں۔" اسد نے بتایا تھا۔

"تم نے اُسے کہا تھا کہ مجھ سے بات کرے؟"

"ہاں میں نے بول دیا تھا... کال کی اُس نے؟"

"نہیں... اچھا چلو کل ملاقات ہوتی ہے...."

"اوکے... بائے۔" اسد نے کہا اور کال بند کر دی۔

ناشتے کے بعد زویا نے پیکنگ شروع کر دی تھی۔ مہرو اور رخشندہ بیگم اُسکے اس فیصلے پہ بہت نالاں تھیں۔

"اب تم جا رہی ہو تاں تو ہر ویک اینڈ پہ آنا پڑے گا بھی...؟" مہرو نے خفگی سے کہا۔

"جی مہارانی صاحبہ جو حکم آپکا..." زویا نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

"اب ذرا دوستوں پہ کم اور پڑھائی پہ زیادہ توجہ دینا..." رخشندہ بیگم جو بیٹی کی ضد کے آگے خاموش تھیں چلتے ہوئے انداز میں کہنے لگیں۔

"اوہ موم... مائی سویٹ موم... آپ ٹینشن نہ لیں میں اپنا بہت خیال رکھوں گی۔" زویا نے ماں کے گلے میں اپنی باہوں کا ہار بناتے ہوئے اُنکے گال کو زور سے چومتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ڈیڈی نے اجازت دے دی ورنہ میں تمہیں کہیں جانے نہ دیتی..." رخشندہ بیگم نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"ماں پلیز... اب آپ روئیں تو نہیں پلیز... میں یونیورسٹی جا رہی ہوں محاذ پہ نہیں۔" زویا نے منت کی تھی۔

"بی بی جی... ڈرائیور آپکا انتظار کر رہا ہے۔" ملازمہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

"تم یہ سامان لے جا کر گاڑی میں رکھو میں آتی ہوں۔" زویا نے ملازمہ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا اور جب وہ سامان لے کر چلی گئی تو وہ ماں سے لپٹ گئی۔

"آپ خود کو ہلکان نہیں کریں پلیز... تھوڑے دنوں کی بات ہے پھر تو میں نے واپس آپکے پاس ہی آنا ہے ناں۔" زویا نے ماں کو کہا۔

"ہاں اور پھر ہم تمہاری شادی کر کے تم سے ہمیشہ کیلئے جان چھڑا لیں گے..." مہرو نے زویا کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

"محترمہ پہلے آپ خود تو قصوری مینشن واپس تشریف لے جائیں ورنہ آپکے مجنوں میاں آپکی یاد میں بھٹکتے بھٹکتے جلدی یہاں پہنچ جائیں گے..." زویا نے بھی مہرو کو چھیڑا تو دونوں ہنستے ہوئے گلے لگ گئیں۔ زویا سب کو ملنے کے بعد لاہور کیلئے روانہ ہو گئی تھی۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد وہ ہاسٹل پہنچ گئی تھی۔

☆......☆......☆

کھانے کی میز پہ تینوں کافی عرصے کے بعد اکٹھے ہوئے تھے۔ شہاب علی گیلانی بظاہر پُر سکون انداز میں کھانا کھا رہا تھا لیکن اُس سے اُن دونوں کے درمیان بیٹھ کر سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اپنے گناہ کا احساس بھی اُسے بے چین کئے دے رہا تھا اور حیدر سے جو رقابت اُسے محسوس ہوتی تھی وہ بھی اُسے برداشت کرنی مشکل لگتی تھی۔

"بھائی آجکل آپ شکار پہ نہیں جا رہے... کیا بات ہے؟" حیدر نے شہاب کو چپ چاپ کھانا کھاتے دیکھ کر پوچھا۔

"بس آجکل بابا جان کے ساتھ ہوتا ہوں زیادہ تر... تمہیں تو معلوم ہے سو دشمن ہوتے ہیں انسان کے.. گدی سنبھالنا کونسا

آسان کام ہے۔" شہاب نے بات بناتے ہوئے کہا۔ جب سے حیدر اور زدیا والا حادثہ ہوا تھا شہاب علی گیلانی زیادہ تر اپنے باپ میر شہباز علی گیلانی کے ساتھ ہی پایا جاتا تھا اور جب سے حیدر گاؤں آیا تھا تب سے اُسے زیادہ تر حویلی میں ہی ملتا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہیں آپ... یہ تو آپ ہی ہیں جو اس طرح بابا کے ساتھ سائے کی طرح رہتے ہیں ورنہ مجھے تو یہ گدی اور سیاست میں رتی برابر بھی دلچسپی نہیں۔" حیدر نے کہا تو شہاب اُسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کچھ سوچ رہا ہوتا۔

"تم شہر کے پڑھے لکھے لڑکے ہو تمہیں کیا پتہ سیاست کا نشہ بھی کیا نشہ ہے..." شہاب نے اپنی ہی دھن میں بولا تھا لیکن اپنی غلطی کا احساس تب ہوا جب شہباز علی گیلانی نے اُسے گھورا اور اُسے خاموش ہونا پڑا۔

"مجھے تو پہلے ہی سیاست میں دلچسپی نہیں تھی.. اور اب جب سے حملہ ہوا ہے مجھ پہ مجھے اس سے نفرت ہو گئی ہے۔" حیدر نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ حملہ بھی تو تمہاری اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے۔" شہباز علی گیلانی نے دونوں بھائیوں کی گفتگو میں پہلی بار حصہ لیا تھا۔

"بابا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں حیدر... تم نے لاپرواہی نہ برتی ہوتی تو ایسا حادثہ پیش نہ آتا۔"

"جی بھائی... جانتا ہوں میری غلطی ہے۔" حیدر نے سر جھکاتے ہوئے اعتراف کیا تھا اُسکی آنکھوں کے سامنے زدیا کا چہرہ لہرا گیا تھا۔

"آئندہ ایسی غلطی کی کوئی گنجائش نہیں... جلد از جلد اپنی پڑھائی مکمل کر کے واپس آنے کا سوچو۔" شہباز علی گیلانی نے کہا۔

"بس اب آخری دو سمسٹر رہ گئے ہیں.. اُسکے بعد گاؤں آ کر آگے کا پلان سوچوں گا۔" حیدر نے کہا۔

"پھر حیدر.. پچھلی بار جو بات میں نے تم سے کہی تھی اُسکے بارے میں تم نے اُسکے بارے میں کیا سوچا ہے؟" شہباز علی نے سنجیدگی سے کہا تو شہاب بھی حیرت سے دیکھنے لگا کہ ایسی کیا بات ہے جس سے وہ بے خبر ہے۔

"کس بارے میں بات کر رہے ہیں بابا جان... میں سمجھا نہیں۔" حیدر نے اُلجھے ہوئے انداز میں کہا۔

"تمہاری اور سوہائی کی رسم نسبت کے بارے میں پوچھ رہا ہوں... تم نے سوچنے کا وقت مانگا تھا اور اب کافی وقت ہو چکا ہے۔" شہباز علی گیلانی نے کہا تو ایک جھٹکے سے حیدر کے ہاتھ سے کھانے کا چمچ چھوٹ گیا اور اُسکی آنکھوں کے سامنے زدیا کا چہرہ اور محبت بھری نظریں گھوم گئیں۔

"بابا جان.. معاف کیجئے گا میں اپنی پڑھائی اور دیگر معاملات میں بالکل بھول گیا تھا اس بات کو..." حیدر نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کہا۔ شہاب دونوں کو حیرت سے آنکھیں پھاڑے دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب اُسکی برداشت سے باہر ہو رہا ہو۔

"ٹھیک ہے کوئی بات نہیں... آج رات سوچ لو جتنا سوچنا ہے کل مجھے ہر حال میں تمہارا جواب چاہیے.. اور جواب بھی مثبت ہونا چاہیے۔" شہباز علی گیلانی نے ڈائننگ ٹیبل سے اُٹھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چل دیے۔ حیدر نے بے بسی سے انہیں جاتا دیکھا اور خود بھی وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چل دیا۔ دونوں وہاں سے چل دیے لیکن شہاب وہیں بیٹھا رہا اور اُسکی کیفیات سے حیدر اور شہباز علی

گیلانی دونوں ہی بے خبر رہے تھے۔رقابت کی آگ میں جلتی اُسکی آنکھیں اور دل میں سلگتی نفرت کی آگ سے حیدر بالکل انجان تھا۔
حیدر اپنے کمرے میں آکر اندھیرا کر کے لیٹ گیا اور دیر تک حالات اور واقعات پہ غور کرنے لگا۔دماغ کہتا تھا کہ باپ کی بات مان لینی چاہیے اور دل تھا کہ اُسے زویا کی طرف کھینچتا تھا۔جب سے وہ حادثہ پیش آیا تھا حیدر خائف تھا۔وہ جب بھی وہ وقت یاد کرتا تھا تو اُسکے رونگٹے کھڑے ہونے لگتے تھے۔زویا کو کھو دینے کا احساس ہی اُسکے حواس کو معطل کرنے کے لئے کافی تھا۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسکی ذات سے زویا کو کوئی بھی نقصان پہنچے لیکن یہ بھی سچ تھا کہ وہ اُسے بے پناہ چاہتا تھا۔دل کہتا تھا کہ زویا اور اُسکی محبت کو حاصل کرلو لیکن حیدر کی زندگی کے ساتھ جڑے خطرات اُسے زویا کو خود سے دور رکھنے پہ مجبور کرتے تھے۔زویا کی کالز اور میسجز اُسکے دل کو مزید تکلیف میں مبتلا کر دیتے تھے۔وہ جتنا اُس سے دور بھاگ رہا تھا وہ اُتنا ہی اُسکے دل کے قریب آتی چلی جا رہی تھی۔محبت اُسے مجبور کئے دے رہی تھی۔اور پھر بابا جان کی ضد کے سوہائی سے اُسکی منگنی کر دی جائے ایک اور عذاب جاں تھا۔وہ کیسے سوہائی کو اپنی جیون ساتھی کے طور پہ قبول کر سکتا تھا جبکہ اُس نے کبھی اُسے اس رشتے میں سوچا تک نہیں تھا۔وہ سوہائی کو اپنی بہن کی طرح سمجھتا تھا اور بابا اُسے اُسکی دلہن بنانے پہ تلے ہوئے تھے۔حیدر کے دل و دماغ میں گھمسان کی جنگ جاری تھی۔وہ خود کو ٹکڑوں میں بٹا ہوا اور چار سو بکھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔زویا کی زندگی اور خوشی اُسے خود سے زیادہ عزیز تھی وہ اُسکی محبت تھی چاہت تھی۔وہ زویا ہی تو تھی جو اُسے زندگی کی طرف لائی تھی۔وہ زویا ہی تو تھی جس نے اُسے جینا سکھایا تھا۔وہ زویا ہی تو تھی جس نے اُسے بتایا تھا کہ محبت کس احساس کا نام ہے۔وہ زویا ہی تو تھی جس نے اپنی جان داؤ پہ لگا کر اُسے زندگی بخشی تھی اور اُسے سمجھایا تھا کہ محبت میں قربانی کیسے دی جاتی ہے۔

”حیدر تم کتنے ظالم ہو۔تم نے اُس معصوم کو کس مقام پہ لا کھڑا کر دیا ہے اور اُسے تڑپنے کے لئے تنہا چھوڑ آئے ہو۔“ حیدر نے اپنے موبائل پہ آنے والی زویا کی کالز کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا اور آنسو تیزاب کی طرح اُسکے چہرے کو جلاتے ہوئے زمین پہ گرنے لگے تھے۔بے بسی کا احساس اُسکو ایک نہ ختم ہونے والی تکلیف میں مبتلا کئے دے رہا تھا۔وہ زور زور سے رونے اور چلانے لگا اور مٹھیاں بھینچ کر زمین پہ مارنے لگا۔زندگی میں پہلی بار وہ خود کو اس قدر بے بس محسوس کر رہا تھا۔بیڈ کے ساتھ لگ کر زمین پہ بیٹھا وہ ضدی طرح اپنی بے بسی پہ ماتم کر رہا تھا۔اس طرح تو وہ تب بھی نہیں رویا تھا جب اُسکی ماں اس دنیا سے چلی گئی تھی۔آج اُسے اپنی ماں کی بھی شدت سے یاد آ رہی تھی۔موبائل پہ پھر سے زویا کی کال آ رہی تھی اُسکا دل اُسے مجبور کر رہا تھا کہ وہ اُسکی آواز سنے اُس سے بات کرے لیکن وہ مجبور تھا۔وہ چاہتا تھا کہ زویا اُس سے نفرت کرے اُسے بے وفا سمجھے اُسے دھوکے باز سمجھے اور دھتکار کے چلی جائے۔وہ اُسکی بے پناہ اور بے لوث محبت کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔اُسے اپنی وجہ سے خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔زویا نے تو اُسکے لئے اپنی جان دے دی تھی لیکن حیدر کو اُسکے لئے اپنی زندگی دینا تھی۔موبائل کی رنگ ٹون اُسکے دماغ میں اب چبھنے لگی تھی۔اُس نے اپنا سیل فون اُٹھا کر زور سے دیوار پہ دے مارا جس سے پورے کمرے میں اُسکے ٹکڑے بکھر گئے۔حیدر اب بلند آواز میں رونے لگا اور خدا سے اپنی بے بسی کا شکوہ کرنے لگا تھا۔
زندگی کبھی کبھی انسان کو اتنا بے بس کر دیتی ہے کہ انسان خود اپنی خوشیوں کا گلا گھونٹنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔

☆......☆......☆

کافی دن بعد جب زویا یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو ہر شے اُسے اپنی اپنی سی محسوس ہو رہی تھی۔ یونیورسٹی میں دوستوں کے ساتھ گزرے خوشی کے لمحات اُسے یاد آنے لگے تھے۔ گھر میں بند رہنے سے جو اُکتاہٹ تھی وہ بھی جاتی رہی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ راستے میں کئی کلاس فیلوز سے علیک سلیک کے بعد آخر کلاس روم کے باہر اُسے اپنے تمام دوست مل گئے۔ رابعہ، ایمن، اسد، زین اور فراز سب نے اُسکا پُرجوش استقبال کیا تھا۔ سب موجود تھے لیکن حیدر ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔

"اب کیسی ہو تم زویا..؟" ایمن نے پوچھا۔

"اب بالکل ٹھیک ہوں۔" زویا نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔

"یار تم تو بڑی بہادر نکلی... ہائے کاش حیدر سے جیسی محبت تم کرتی ہو کوئی مجھ سے بھی کرے۔" بھاری بھرکم زین نے ٹھنڈی آہ بھر کر کہا تو سب ہنس دیے۔

"حیدر نہیں آیا کیا...؟" زویا نے سوال کیا۔

"آتا ہی ہوگا۔" اسد نے سیڑھیوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

"لو تشریف کا ٹوکرا لئے صاحب بہادر آ گئے ہیں۔" کچھ دیر بعد حیدر کو آتے دیکھ کر فراز نے شوخ انداز میں کہا۔

"Hi Everyone" حیدر نے سب کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا تو سب نے اُسے وارم ویلکم کیا۔ سب سے ملنے کے بعد اُس نے زویا کی طرف دیکھا جو اُسے یک ٹک دیکھ رہی تھی جیسے اُسکے چہرے پہ اپنے لئے کچھ تلاش کر رہی ہو۔

"کیسی ہو زویا...؟" حیدر کا سوال جیسے زویا کے دل میں نشتر بن کے لگا تھا۔ کبھی کبھی الفاظ بہت عام ہوتے ہیں لیکن اُنکے اثرات بے حد خاص۔

"ٹھیک ہوں..." زویا کے منہ سے اس سے زیادہ کچھ نہیں ادا ہو سکا۔ حیدر کی نظروں میں عجیب سا تاثر تھا جسے وہ سمجھ نہیں پائی تھی اور لہجے میں غضب کی اجنبیت تھی۔ زویا جیسے اُسے دیکھ کر خود سے مخاطب ہوئی تھی کہ "کیا یہ وہ شخص ہے جسکے لئے میں نے جان کی بازی لگائی تھی؟"

ابھی سب کھڑے باتوں میں مصروف تھے جب پروفیسر صاحب کلاس روم میں داخل ہوئے تھے اور اُنکے پیچھے سب سٹوڈنٹس بھی چل دیے۔ حیدر جو کبھی زویا کے پہلو میں بیٹھا کرتا تھا آج اسد کے ساتھ بیٹھا تھا۔ زویا نے یاسیت سے اُسکی جانب دیکھا تھا۔ لیکن وہ جیسے اُسے جانتا بھی نہیں تھا ایک نگاہ بھی ڈالنا پسند نہیں کی۔ لیکچر کے بعد جب سب کلاس روم سے باہر نکلے تو زویا نے حیدر کو آواز دے کر روک لیا۔

"حیدر.. مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" زویا نے کہا۔

"ہاں.. بولو۔" حیدر نے کہا۔

"یہاں نہیں اکیلے میں..." زویا نے بمشکل کہا۔

"ٹھیک ہے چلو۔" حیدر نے سرسری انداز میں کہا۔ کچھ دیر بعد دونوں چلتے چلتے ڈیپارٹمنٹ سے باہر نکل آئے تھے اور مین گراؤنڈ

کی سیڑھیوں میں بیٹھ گئے۔آسمان ابر آلود تھا اور خنک ہوا کے جھونکے زدیا کی حسین زلفوں سے اُٹھنے والی مہک حیدر کی سانسوں تک پہنچا رہے تھے۔ایک نظر زدیا کے چہرے پہ ڈال کر حیدر نے ہٹالی تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ زدیا کی نظر اُس سے ملے۔کچھ دیر خاموشی دونوں کے درمیان رہی۔زدیا جیسے اپنی بات پوچھنے کے لئے مناسب الفاظ کا انتخاب کر رہی تھی لیکن اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے شروع کرے۔

"بولو کیا بات ہے؟" حیدر نے خاموشی کو توڑا تھا۔

"میں نے تمہیں اتنی کالز کیں...میسجز کئے...لیکن تم نے کسی ایک کا بھی جواب نہیں دیا۔" زدیا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہاں وہ میرا موبائل فون گم ہو گیا تھا..اور گاؤں میں مصروف تھا اسلئے بات نہیں کر سکا۔"

"کچھ زیادہ ہی کمزور بہانہ نہیں ہے یہ...؟" زدیا نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ حیدر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بہانہ نہیں ہے...میں واقعی مصروف تھا۔" حیدر نے نظریں چُراتے ہوئے کہا۔

"اتنا مصروف کے ایک بار میرا حال بھی نہیں پوچھ سکتے تھے..ایک بار مجھے دیکھنے ہاسپٹل بھی نہیں آ سکتے تھے؟" زدیا کی بڑی بڑی گہری آنکھیں کسی تالاب کی طرح بھر آئیں تھیں۔

"میں پوچھتا رہتا تھا جب بھی اسد یا رابعہ سے بات ہوتی تھی..." حیدر نے بات بنائی تھی۔

"تو پھر میری کالز ریسیو نہ کرنے کی وجہ...اس بے رخی کا سبب کیا ہے؟" زدیا نے دکھ بھرے لہجے میں پوچھا تو اندر ہی اندر حیدر کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"بتایا ہے ناں مصروف تھا۔" حیدر نے نظر چُرائی تھی۔

"کیسی مصروفیت حیدر...؟ تمہاری زندگی میں اس سے پہلے مجھ سے بڑھ کر تو کوئی اور مصروفیت تھی ہی نہیں...تو پھر اب کیسی مصروفیت؟" زدیا تقریباً چلائی تھی۔

"بچوں جیسی ضد کیوں کر رہی ہو..بتا رہا ہوں مصروف تھا۔" حیدر نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

"بچوں جیسی ضد...؟ حیدر میں تمہارے پیار میں مر رہی تھی..تمہاری خاطر اپنی جان سے گزر گئی اور تم کہتے ہو مصروف تھے..؟؟؟" زدیا نے حیرت سے آنکھیں پھیلائے ہوئے کہا تو حیدر جھنجھلا کے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں یہی سچ ہے تم مانو یا نہ مانو...میں مصروف تھا کیونکہ..." حیدر کچھ کہتے کہتے رُکا تھا۔

"کیونکہ...؟" زدیا نے دُہرایا۔

"کیونکہ میری منگنی تھی گاؤں میں..." حیدر نے ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا لیکن اُسکا ایک جملہ زدیا کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لے گیا۔وہ لڑکھڑائی سی اُٹھ کھڑی ہوئی۔حیدر منہ پھیرے کھڑا تھا اس نے اُسے بازو سے کھینچ کر اپنی طرف موڑا تھا۔

"کیا کہا تم نے...؟" زدیا کو جیسے اُسکی بات پہ یقین نہیں آیا تھا۔حیدر نے کوئی جواب نہیں دیا تو زدیا نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر دیکھا جس میں واقعی ایک انگوٹھی موجود تھی۔زدیا پہ حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔

"کیسے کر سکتے ہو میرے ساتھ ایسا...تم مجھ سے محبت نہیں کرتے تھے...وہ سب جھوٹ تھا...تمہاری آنکھیں مجھ سے جھوٹ کہتی تھیں...بولو...؟" زویا کی حالت پاگلوں جیسی ہو رہی تھی۔

"زویا...مجھے سمجھنے کی کوشش کرو پلیز...ہم ایک دوسرے کے لئے نہیں بنے شاید۔" حیدر ابھی کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ ایک زنانے دار تھپڑ نے اُسے حواس باختہ کر دیا۔

"کیسے نہیں بنے ایک دوسرے کے لئے...کیسے تم نے اپنے نام سے کسی اور کا نام جوڑ لیا...زویا سکندر کو کیسے ٹھکرا دیا...کیسے..؟"

زویا اُسکا گریبان پکڑ کر چلا رہی تھی اور فرطِ جذبات سے اُسکی آنکھوں سے آنسو بے جا رہے تھے۔ حیدر کو اُسکی حالت پہ رونا آ رہا تھا اور وہ لحہ بہ لحہ کمزور پڑ رہا تھا اپنے فیصلے پہ قائم رہنا اُسکے لئے محال ہو رہا تھا۔

"ہاں ہاں...کرتا ہوں تم سے محبت..چاہتا ہوں تمہیں دیوانوں کی طرح...لیکن میں تمہاری زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا...تمہیں کچھ ہو جاتا تو کیا کرتا میں؟" حیدر اس پہ پہلی بار چلایا تھا۔ زویا حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں کھو دینے کے احساس نے مجھے یہ سب کرنے پہ مجبور کیا ہے..نہیں کھونا چاہتا تمہیں..نہیں چاہتا کہ تمہیں میری وجہ سے کوئی نقصان پہنچے..." حیدر کے لہجے میں بے بسی جھلک رہی تھی وہ منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔

"تم صرف میرے ہو حیدر...میں تمہیں کسی اور کا ہونے نہیں دونگی۔" زویا اُسے لپٹ گئی اور روتے ہوئے کہنے لگی۔ حیدر کی بے بسی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

"مجھے سمجھنے کی کوشش کرو زویا..تمہاری زندگی کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں..حتیٰ کہ تم سے الگ ہو کر بھی رہ لوں گا لیکن تمہیں کچھ ہو جائے یہ مجھے گوارہ نہیں ہے۔" حیدر نے بے بسی سے زویا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا فائدہ ایسی زندگی کا جس میں تم نہیں ہو...کیا کرونگی اُس زندگی کا جو تمہارے بغیر گزارنی پڑے مجھے...؟" زویا کسی طرح بھی ماننے والی نہ تھی۔

"خود کو میری جگہ رکھ کے سوچ دیا..."

"نہیں سوچنا مجھے...نہیں چاہیے ایسی زندگی جس میں تم نہ ہو۔" زویا نے ضدی لہجے میں کہا۔

"میں نے بابا جان کے کہنے پہ سوہائی سے منگنی کر لی ہے...اب واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے میرے پاس۔" حیدر نے کہا تو زویا کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا۔ وہ اپنی بات اور ضد منوانے کی عادی تھی اور پھر حیدر تو اُسکی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اور آرزو تھا جسکے لئے وہ اپنی جان تک سے گزر گئی تھی پھر کیسے برداشت کر سکتی تھی کہ وہ اتنی آسانی سے کسی اور کا ہو جائے۔

"ایک بار پھر سوچ لو حیدر...اگر تم سمجھتے ہو کہ محبت میں قربانی دے کر تم زویا سکندر کو پیچھے چھوڑ سکتے ہو تو یہ تمہاری بھول ہے۔" زویا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"میں تمہیں ہرانے کے لئے نہیں تمہاری زندگی کو محفوظ کرنے کے لئے تم سے الگ ہوا ہوں..اُس دن ہاسپٹل میں جب تمہارے ڈیڈی نے مجھے کہا کہ میں ہوں وہ جسکی وجہ سے اُنکی بیٹی اس حال میں پہنچی ہے تو مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی خوشی کی خاطر کتنا خود غرض ہو گیا ہوں کہ مجھے پرواہ بھی نہیں رہی کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی کو بھی خطرہ ہے۔"

"حیدر جو بھی ہوگا ہم دونوں مل کر اُسے فیس کریں گے...زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر ہم کسی سے کیوں ڈریں..کیوں موت کے خوف سے جدا ہوں ہم؟" زویا نے حیدر کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہے۔مجھے موت کا خوف نہیں ہے..مجھے صرف تمہاری فکر ہے زویا..تم میں میری جان ہے میرا سب کچھ تم ہو۔" حیدر نے جذباتی لہجے میں کہا۔زویا ایک بار پھر اُسکے سینے سے لپٹ گئی۔

"اگر مجھ میں تمہاری جان ہے تو پھر کیوں مجھے خود سے دور کر کے تکلیف دینا چاہتے ہو...کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں ہر پل تڑپ کر گزاروں..کیا فائدہ اس طرح زندہ رہنے کا؟اس سے تو بہتر ہے کہ تمہاری بانہوں میں سکون سے مر جاؤں۔" زویا نے روہانسے انداز میں کہا۔

"پلیز ایسے مت کہو...تمہیں نہیں پتہ تم میرے لئے کیا ہو..." حیدر نے اُسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اُتار کر پھینک دو یہ انگوٹھی..تم صرف میرے ہو۔" زویا نے حیدر کے ہاتھ سے وہ انگوٹھی نکال کر پھینکتے ہوئے کہا۔حیدر خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا کیونکہ زویا سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔وہ سمجھا تھا کہ اُسکی منگنی کی خبر سنتے ہی وہ اُس سے نفرت کرنے لگے گی لیکن اُسکی محبت اب دیوانگی کا روپ دھار رہی تھی اور اُسکی ضد سے حیدر بخوبی واقف تھا اسلئے اب اُسے اکیلا چھوڑنا بھی اُسے ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔

"زویا اب کوئی فائدہ نہیں..میری بات کو سمجھو..ہمارے یہاں ایک بار جو نسبت طے ہو جائے وہ مرنے کے بعد ہی ختم ہوتی ہے ورنہ زندگی بھر اُنہیں نبھانا پڑتا ہے۔" حیدر نے ایک آخری کوشش کی تھی اُسے سمجھانے کی۔

"ٹھیک ہے...تم نبھاؤ اپنے رسم و رواج...پیر حیدر علی گیلانی اب میں تمہیں بتاؤں گی کہ زویا سکندر کون ہے...جس زندگی کی تمہیں بہت پرواہ ہے ناں اُسے میں نے پیروں تلے نہ روند دیا تو میرا نام نہیں..." زویا کا لہجہ اٹل تھا اور اُسکی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا تھا۔اُس نے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی وہاں سے جانے لگی۔حیدر کو اُسکا انداز اندر تک ہلا گیا تھا۔وہ اُسے آوازیں دیتا اُسکے پیچھے لپکا تھا لیکن اب وہ رُکنے کی نہیں تھی۔"زویا..زویا رُکو...پلیز رُک جاؤ میری بات سنو..زویا۔" حیدر اُسے پکار رہا تھا لیکن اب وہ با قاعدہ بھاگ رہی تھی۔لوگوں کو کراس کرتی ہوئی وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بھاگتی ہی چلی جا رہی تھی اور حیدر بھی اُسکے پیچھے پیچھے پکارتا ہوا دوڑ رہا تھا۔وہ بھاگتی ہوئی یونیورسٹی کی ایک بلند عمارت کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔"زویا پلیز...رُک جاؤ..ایک بار میری بات سن لو۔" حیدر اُسے پکار رہا تھا لیکن اُس نے ایک بھی نہ سنی۔وہ جہاں سے بھی گزر رہے تھے لوگ اُنہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے۔چار منزلہ عمارت کی چھت پہ پہنچ کر زویا اُسکی دیوار پہ چڑھ گئی۔حیدر اُسکے پیچھے پہنچا تو اُسے دیوار پہ دیکھ کر اُسکے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔"زویا رُک جاؤ...تمہیں میری قسم..." حیدر چلایا تھا۔"چلے جاؤ یہاں سے...میں اب تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گی..میرے قریب بھی مت آنا۔" زویا اُسے اپنی طرف آتا دیکھ کر چلائی تھی۔

"زویا تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ پلیز نیچے اتر آؤ۔ تم جو کہو گی میں ماننے کیلئے تیار ہوں۔" حیدر نے التجاء کی تھی۔ "اب کچھ نہیں ہے کہنے اور سننے کو۔۔ چلے جاؤ۔" زویا نے چلا کر کہا تو اُسکے قدم لڑکھڑا گئے۔ وہ گرنے ہی والی تھی کہ حیدر نے برق رفتاری سے اُسے تھام کر اپنی طرف کھینچ لیا اور وہ دیوار سے اتر کر حیدر کی بانہوں میں آ گئی۔ "یہ کیا کرنے جا رہی تھی تم ہاں۔۔" خوف سے اُسکے کانپتے جسم کو جھنجھوڑتے ہوئے حیدر اس پہ چلایا تھا لیکن وہ رونے کے سوا کچھ نہ بول سکی۔ "پاگل ہو گئی ہو تم۔ اگر تم گر جاتی تو جانتی ہو کیا ہو جاتا؟" حیدر اُسے بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا۔ "ہاں۔۔ پاگل ہو گئی ہوں۔ گر کر مر جاتی ناں۔ اچھا ہوتا تمہاری مشکل آسان ہو جاتی۔" زویا نے روتے ہوئے کہا۔ "بکواس بند کرو۔" حیدر نے اُسے ڈانٹتے ہوئے خود سے چپٹا لیا۔ زویا کا پورا وجود اب تک خوف سے کانپ رہا تھا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

"سلام کرنے کی آرزو ہے۔ ادھر جو دیکھو سلام کر لیں۔۔ جسے بھی ہم دیکھ لیں پلٹ کر اسی کو اپنا غلام کر لیں۔" خوبرو نوجوان لڑکی اپنی بھرپور ادائیں دکھاتے ہوئے محوِ رقص تھی۔ بہت سے مردوں کے ہجوم میں وہ ناچتی گاتی اپنی ادائیں ان پہ لُٹا رہی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا لباس اُسکی بادامی رنگت پہ خوب جچ رہا تھا۔ اُسکی ہر ادا پہ کئی امیر زادے پیسے لٹا رہے تھے اور کئی بڑھ بڑھ کر اُسکے فن کی داد دے رہے تھے۔ ابنِ آدم جیتی بنتِ حوا کی تذلیل کر سکتا تھا کی جا رہی تھی۔ لیکن پیر شہاب علی گیلانی خاموش بیٹھا اپنی ہی سوچوں میں گم تھا۔ اُسے وہاں آئے آدھا گھنٹہ گزر چکا تھا لیکن وہ محفل سے بے خبر اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ پہلو میں بیٹھے ہوئے ملک سفیر قصوری نے اُسکے ہاتھ پہ ہاتھ مارتے ہوئے اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ کافی دیر سے اُسکی ایسی حالت پہ غور کر رہا تھا۔ ملک سفیر قصوری اُسکا بہت پرانا اور جگری دوست تھا اور اکثر شباب و شراب کی محافل اُسکے فارم ہاؤس میں ہوا کرتی تھیں اور ان میں شہاب علی گیلانی کا ہونا لازمی ہوا کرتا تھا۔ دونوں اپنے دیگر دوستوں کے ہمراہ اکثر شکار کھیلنے بھی جایا کرتے تھے۔ دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔

"کیا بات ہے جگر۔۔ پریشان لگ رہے ہو؟" ملک سفیر نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

"پریشان نہیں ہوں۔۔ پریشانی کا حل ڈھونڈ رہا ہوں۔" شہاب نے پُرسوچ انداز میں جواب دیا۔

"تو ہم کس مرض کی دوا ہیں پیارے۔۔؟" شراب کے نشے میں ڈوبے ہوئے لہجے میں ملک سفیر نے کہا۔

"مسئلہ وہی ہے پرانا۔"

"گدی کا۔۔ یا پھر کوئی اور مسئلہ؟"

"پہلے تو صرف مسئلہ تھا گدی کا۔ اب بابا جان نے حیدر کو ایک اور طاقت بخش دی ہے میرے خلاف۔" جلتے ہوئے لہجے میں شہاب نے کہا۔

"وہ کیا؟"

"سوہائی... اُنہوں نے حیدر کی منگنی سوہائی سے کروا دی ہے... ایک اور خنجر میرے سینے میں گھونپ دیا ہے۔" شہاب نے شراب اپنے اندر اُنڈیلتے ہوئے نفرت سے کہا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا... اب تم کیا کرو گے؟"

"وہی تو سوچ رہا ہوں..."

"پچھلی بار بھی میرے بندوں سے کام نہ ہو سکا... ورنہ تب ہی حیدر کا قصہ تمام ہو جاتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ سوہائی بھی میری ہو جاتی اور وراثت کی گدی بھی۔" شہاب نے افسوس سے کہا۔

"ہوں... سہی کہا تم نے... لیکن اب تو دونوں چیزیں ہاتھ سے نکل گئیں۔" سفیر نے کہا۔

"بابا جان نے ہمیشہ میرے ساتھ سوتیلوں جیسا سلوک کیا ہے... جو مجھے ملنا چاہیے تھا وہ ہمیشہ حیدر کو ملا... اماں جان کی وفات کے بعد سارا پیار اور توجہ حیدر کو ملی... میں ہمیشہ نوکروں کے ہاتھوں میں رہا اور حیدر بابا جان کی آغوش میں... جو چیز مجھے پسند ہوتی تھی وہ حیدر کو دے دی جاتی تھی... اُسے شہر میں رکھ کر شہزادوں کی طرح پڑھایا لکھایا... مجھے گاؤں میں اپنے ساتھ سیاسی غنڈہ بنا کے رکھا گیا... میں ہمیشہ بابا جان کے پیار اور توجہ کو ترستا رہا لیکن اُنکو فکر تھی تو بس اپنے لاڈلے کی... کبھی مجھے وہ پیار اور توجہ نہ ملی جو میرا حق تھا... اور آج اگر میں اپنا ہوں تو وہ مجھے کمتر سمجھتے ہیں... میری جگہ حیدر کو گدی کا وارث بنانا چاہتے ہیں... اور اب سوہائی... اُسے بھی مجھ سے چھین کر حیدر کو دے دیا..." شہاب کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور سفیر ترس بھری نگاہوں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا... اب میں اپنا حق مانگوں گا نہیں چھین لوں گا... بہت انتظار کر لیا میں نے... اب چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اپنا حق نہیں لے لیتا۔" شہاب نے آنسو پونچھتے ہوئے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"تو فکر نہ کر جانی... ملک سفیر تیرے ساتھ ہے۔" سفیر نے اُسکے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اب کی بار میں وہ سب حاصل کر کے رہوں گا جو کچھ بابا جان نے اور تقدیر نے مجھ سے چھینا ہے۔" شہاب کا لہجہ اٹل تھا۔

☆......☆......☆

زویا کی وجہ سے مہرو کافی دن سے سکندر حیات خان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ اُسکے دونوں بچوں کی وجہ سے گھر میں بہت رونق لگی رہتی تھی۔ زویا کے بعد اس گھر میں رونق اُنہی کے دم سے ہوتی تھی۔ لیکن آج ملک فراز قصوری اپنی بیوی اور بچوں کو لینے آ رہا تھا۔ اسلئے مہرو اور خشندہ بیگم دوپہر ہی سے ڈنر کی تیاریوں میں مصروف تھیں کیونکہ مہرو کے شوہر کے ساتھ اُسکے چچا، چچی اور اُنکا بڑا بیٹا بھی آ رہا تھا۔ اُنکے آنے کا مقصد بھی خاص تھا۔

"امی چائنیز رائس اور فروٹ ٹرائفل ضرور بنوائیگا کیونکہ فراز اور اُنکے چچا جان کو بہت پسند ہے۔" مہرو نے ماں کو بتایا جو پہلے سے ملازمہ کو ہدایات کر رہی تھیں اور خانساماں کو کھانے کی لسٹ بنوا رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے یہ ڈشز بھی آج کے مینیو میں شامل کر لو۔" رخشندہ بیگم نے خانساماں کو ہدایت کی۔

"جی بیگم صاحبہ...اور کچھ؟" خانساماں نے کہا۔

"بس ٹھیک ہے جو لسٹ بنوائی ہے وہ تمام ڈشز مجھے ریڈی چاہیے رات دس بجے کھانا سرو ہو جانا چاہیے۔کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے کسی بھی ڈش میں۔" رخشندہ بیگم نے رعبدار لہجے میں کہا۔

"جی بہتر۔" خانساماں نے کہا اور سر جھکا کر چل دیا۔

"ارے واہ..امی آج کل آپ ہر کسی سے کتنا رعب سے بات کرنے لگی ہیں۔" مہرو نے ماں سے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا ہر کسی سے..؟"

"مطلب یہ کہ اب تو بابا سے بھی آپ تھوڑا...بس تھوڑا سا رعب سے بات کر ہی لیتی ہیں۔" مہرو نے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

"چل ہٹ... پریشان نہ کر مجھے۔" رخشندہ بیگم نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"بہت اچھا سا ڈنر ہونا چاہیے رات کو...وہ لوگ امپریس ہو جائیں میں یہ چاہتی ہوں۔ویسے تو وہ پہلے ہی ہماری زویا کو بہت پسند کرتے ہیں..جب سے انہوں نے میری شادی پہ اُسے دیکھا ہے بس فراز کے پیچھے لگے ہوئے ہیں کہ کسی طرح زویا کا رشتہ اُن کے بیٹے سے کروا دیں۔" مہرو نے اتراتے ہوئے ماں کو بتایا۔

"اچھا..پھر تم نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا...؟ ہم جلدی اس آفت کی پرکالا کو اس گھر سے خیریت سے رخصت کر دیتے۔" رخشندہ بیگم نے کہا۔

"ارے امی کیسی باتیں کر رہی ہیں..ہماری زویا کوئی عام لڑکی تھوڑی ہی ہے جو ہم جھٹ سے انہیں ہاں کر دیں...ذرا چکر لگوائیں گے..جوتیاں گھسوائیں گے..پھر جا کر کہیں بات بنے گی۔" مہرو نے شوخی سے کہا۔

"یہ تم اور تمہارے بابا ہیں جو اُس سے پوچھے بنا ان لوگوں کو بلا کر بیٹھ گئے ہو..ورنہ اس ضدی لڑکی سے مجھے تو کوئی اُمید نہیں کہ کیا کہے گی۔" رخشندہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"تو امی ہم نے کونسا اُسکی شادی فکس کروانے کے لئے بلایا ہے انہیں..ابھی تو صرف ایک ملاقات کرنے کے لئے آ رہے ہیں میرے سسرالی رشتہ دار ہونے کے ناطے سے..ابھی وہ ایسی کوئی بات نہیں کرینگے کیونکہ میں نے فراز کو بتا دیا تھا کہ پہلے بابا جان ایک تفصیلی ملاقات کرلیں آپکے چچا اور اُنکی فیملی سے پھر ہم زویا سے پوچھ کر انہیں اس مقصد کے لئے بلائیں گے۔" مہرو نے تفصیلاً اپنا ارادہ ماں کو بتایا۔

"ہاں پھر تو سہی کیا تم نے جو پہلے سے کوئی ہاں نہیں بھری..." رخشندہ بیگم نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"زویا کی پڑھائی اب ختم ہونے والی ہے اسلئے میں نے سوچا اب مناسب وقت ہے اس کام کا۔" مہرو نے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے..ویسے بھی دونوں بہنیں ایک ہی خاندان میں بیاہی جاؤ گی تو بہتر رہے گا...اور اس لاپرواہ کا تم دھیان رکھو گی تو مجھے زیادہ فکر نہیں ہوگی۔"

"ارے امی.. آپ نا حق فکر کیا کریں.. بلاوجہ پریشانی ہو جاتا ہے آپکو۔" مہرو نے ماں کو کندھوں سے تھام کر پیار سے کہا۔
"تمہارے ہونے سے مجھے بڑی ڈھارس رہتی ہے.. ورنہ ان دونوں باپ بیٹی کا مزاج میرے قابو میں کہاں ہے...؟"
رخشندہ بیگم نے مظلومیت سے کہا۔
"اس میں آپکا کیا قصور امی.. بابا جان جیسے لوگ اور ہماری سوسائٹی کا یہی طرزِ عمل رہا ہے.. عورتوں پہ حکومت کرنا اور انکو اپنی منشاء کے مطابق چلانا..." مہرو کے لہجے میں کڑواہٹ نمایاں تھی۔
"بس ایک زویا ہی ہے جس کے سامنے تمہارے بابا کی نہیں چلتی... ورنہ آج تک میں کبھی زبان نہیں کھول سکی انکے سامنے اور ایک وہ ہے کہ اپنے باپ سے ہر بات منواتی ہے۔"
"وہ انکی لاڈلی جو ہے... مزاج بھی انہی سے وراثت میں لیا ہے تو بابا جان کو اپنے ہتھیار ڈالنے ہی پڑتے ہیں اسکے آگے۔"
مہرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہر پل اس لڑکی کی فکر مجھے کھائے جاتی ہے.. ایسے ناز نخرے، ضد اور ہٹ دھرمی ماں باپ کے علاوہ کون دیکھتا ہے.. اور سونے پہ سہاگا اسکا جذباتی پن... مجھے تو خوف آتا ہے کبھی کبھی اس لڑکی سے نہ جانے کب کیا کر بیٹھے۔" رخشندہ بیگم کے انداز سے خوف عیاں تھا۔
"بس اب آپ فکر نہ کریں اور سب مجھ پہ چھوڑ دیں... آج رات ملک سفیر قصوری سے ملاقات کریں گے اسکے بعد مجھے آپکی اور بابا جان کی رائے کا انتظار رہے گا۔" مہرو نے کہا۔
"بھئی ہمارا بڑا داماد تو بہت ہی سعادت مند اور سلجھا ہوا انسان ہے اور ہماری بیٹی کو خوش رکھتا بھی جانتا ہے... تو اسکا کزن بالکل نہ سہی کچھ تو اسکے جیسا ہوگا۔" رخشندہ بیگم نے مہرو کو سرتاپا سونے کے زیورات سے لدا دیکھتے ہوئے کہا تو مہرو ہنس دی۔ مہرو اور رخشندہ بیگم دونوں عام سی سوچ رکھنے والی عام عورتیں تھیں جنکی نظر میں خوشی اچھا اور مہنگا لباس، زیورات اور روپیہ پیسا بہانے والا شوہر ہی اچھی زندگی کی ضمانت تھا۔ لیکن زویا کی سوچ اور عمل ان دونوں سے یکسر مختلف تھا۔ زویا کو ایسی چیزوں میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اسکے لئے اپنی مرضی سے پسند زندگی گزارنا اور آزاد فضاؤں میں اڑنا زندگی کی اولین ترجیحات تھیں۔ وہ حویلیوں اور بنگلوں میں ہمہ تن سجی دھجی زیورات سے لدی پڑی عورتوں والی زندگی نہیں جینا چاہتی تھی جو مرد کی قید میں رہ کر ان چیزوں سے دل بہلاتی ہیں۔ وہ پیار محبت اور آزادی کی زندگی جینے کی قائل تھی جہاں مرد عورت پہ حکمرانی کرنے کے بجائے اسکے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔ زویا کا اپنے باپ سکندر حیات خان سے ٹکراؤ اگر تھا تو اسی بات پہ تھا۔ سکندر حیات خان ایک مغرور اور خود پسند انسان تھا جو عورت پہ ایک حکمران کی طرح رہنے کا قائل تھا۔ اپنی مرضی اور منشاء کے آگے جسے کسی عورت کی بات گوارہ نہ تھی۔ صرف سکندر حیات ہی نہیں اسکے خاندان اور سوسائٹی کے تمام مرد اسی طرزِ عمل کے حامی تھے۔ لیکن زویا نے نہ کبھی ایسی غلامی اور حکمرانی قبول کی تھی اور نہ کرنے والی تھی۔ وہ ایسے گھر میں پیدا تو ہو گئی تھی لیکن

اُس ماحول کا حصہ کبھی بھی نہیں بن پائی تھی۔ تقدیر نے اُسے جہاں رکھا تھا وہ اُس قید سے فرار حاصل کرنے کے لئے ہمیشہ سے کوشش کرتی چلی آ رہی تھی۔

"کھانا تو بہت ہی لذیذ تھا مسز ازخان۔" مہرو کی چچیری ساس نے کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے رخشندہ بیگم سے کہا تو وہ مسکرا دیں۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے سب لوگ کھانے کے بعد گرما گرم چائے پی رہے تھے۔ رخشندہ بیگم اور مہرو دونوں کو ہی ملک سفیر قصوری پسند آیا تھا۔ بلیک کلر کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ کافی ڈیسنٹ اور سوبر دکھائی دے رہا تھا۔ بے حد شرافت اور سعادت مندی سے سر جھکائے بیٹھا وہ کافی پُرکشش دکھائی دے رہا تھا۔ رخشندہ بیگم دل ہی دل میں خوش تھیں کہ اُنکی لاڈلی کے لئے کوئی دور پرے نہیں جانا پڑا اور اُس سے بھی بڑھ کر مہرو کے ہونے کی ڈھارس تھی۔

"امی نے تمام ڈشز خود تیار کروائی تھیں خاص آپ لوگوں کے لئے..." مہرو نے فخر سے بتایا۔

"زویا سے بھی ملاقات ہو جاتی تو اچھا ہوتا... بھئی ماشاءاللہ بڑی ہی پیاری بچی ہے۔" چچی نے کہا۔

"ارے بھابھی... بس یہ سمجھ لیں کہ وہ تو ہمارے گھر کی رونق ہے گھر میں نہ ہو تو میرا دل ہی نہیں لگتا۔" سکندر حیات خان بیٹی کے ذکر پہ بول پڑے جو پہلے مردوں سے کاروباری اور سیاسی گفتگو میں مصروف تھے۔

"خان صاحب کی بہت لاڈلی ہے..." رخشندہ بیگم نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

"بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتیں ہیں بھابھی جی..." چچا نے بھی گفتگو میں حصہ لیا اور سفیر سر جھکائے سعادت مندی سے سب کی باتیں سنتا رہا۔

"اب آپکا بزنس تو سفیر ہی سنبھالتا ہوگا...؟" سکندر حیات خان نے ملک امتیاز قصوری سے پوچھا۔

"جی ہاں بالکل... چھوٹا صاحبزادہ تو لندن میں ایم۔ پی۔ اے کر رہا ہے۔ بزنس میں نے سفیر کے حوالے کر رکھا ہے اور سیاست کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔" ملک امتیاز قصوری نے سگار پیتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"میں نے بھی اپنے دونوں بیٹوں کو بیرونِ ملک بھیجا ہوا ہے اعلیٰ تعلیم کے لئے... اور زویا کی ضد تھی کہ وہ لاہور سے پڑھے تو پھر اُسکی خوشی کی خاطر اُسے لاہور بھیج دیا... اب تو بس اُسکا لاسٹ سمسٹر چل رہا ہے۔" سکندر حیات خان نے بتایا۔

"سفیر بیٹا... آپ بھی بتاؤ بزنس کے علاوہ کیا معروفیات اور ہابیز ہیں آپکی؟" رخشندہ بیگم نے پوچھا۔

"آنٹی بزنس کے بعد زیادہ وقت تو بچتا نہیں... بس بابا کے ساتھ سیاسی معاملات دیکھ لیتا ہوں یا پھر کبھی کبھار اگر ہولی ڈے منانے کا پلان ہو تو دوستوں کے ساتھ شکار پہ چلا جاتا ہوں... اکثر فراز بھائی بھی ہوتے ہیں ساتھ..." سفیر نے ملک فراز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو چائے پیتے ہوئے سب کی باتیں سن رہا تھا۔

"امی یہ بہت ظالم شکاری ہے... ابھی بہت معصوم بن رہا ہے مگر تیتر اور مرغابی کا شکار تو اس سے اچھا کر ہی نہیں سکتا ناں..."

ملک فراز نے کزن کی خوبی کو بڑھا چڑھا کر فخر سے بتایا۔

"بھئی شکار ہے ہی مردوں کا کام... میں بھی جایا کرتا تھا لیکن اب تو بزنس اور سیاست کے علاوہ فرصت ہی نہیں ملتی۔" سکندر حیات نے کہا۔

"یہ جوانی کے شغل ہیں خان صاحب... جوانوں کو ہی کرنے دیں۔" ملک امتیاز نے کہا تو سب کے قہقہے گونج اُٹھے۔

☆......☆......☆

"تم نے منگنی کر کے سارا معاملہ خراب کر دیا ہے حیدر..." زویا اور حیدر کا مسئلہ سننے کے بعد سب دوستوں میں سے اسد نے کہا تھا۔

"ہاں..اگر تم منگنی کرنے کے بجائے اپنے بابا جان سے صاف صاف کہہ دیتے کہ تم زویا سے پیار کرتے ہو اور اسی سے شادی کرو گے تو ایسی مشکل پیش نہ آتی۔" زین نے کہا تھا۔

"میں منگنی کرتا یا نہ کرتا لیکن یہ پھندا میرے گلے میں ہی رہنا تھا۔" حیدر جو پچھلے آدھے گھنٹے سے بیٹھا سب کی لعنت ملامت سن رہا تھا آخر تنگ آ کر بولا۔

"ارے یار... اب یہ ملامت کرنا چھوڑ دو اور مسئلے کا حل سوچو۔" رابعہ نے جھنجھلا کر کہا۔

"اس قربانی کے بکرے کو جتنا بھی کوسا جائے کم ہے..." ایمن نے حیدر کے بازو پہ تھپڑ مارتے ہوئے غصے سے کہا۔

"بالکل ٹھیک کہا... ہماری زویا اس گدھے کے پیار میں اپنی جان پہ کھیل گئی اور بجائے اسکے کے یہ اسے عمر بھر کے ساتھ نبھانے کا وعدہ کرتا اس نے اُلٹا گاؤں جا کر منگنی کر لی۔" فراز نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"بس بھی کرو اب یار... جو ہونا تھا ہو گیا حیدر بیچارے نے تو زویا کی بھلائی کیلئے ہی کیا تھا لیکن زویا کو خود شوق ہے ایڈونچر کرنے کا تو اس میں حیدر کا کیا قصور اس نے تو اپنی جگہ ٹھیک ہی کیا تھا۔" سارہ نے کہا تو سب قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

"میرے خیال میں زویا تمہیں پہلے اپنی فیملی میں بات کرنی چاہیے.. پھر حیدر تم کو بھی اپنے بابا جان کو ساری حقیقت بتا دینی چاہیے۔" اسد نے حقیقت پسندی سے کہا۔

"ہاں اور تمہارے خیال میں وہ کہیں گے کہ بیٹا کوئی بات نہیں... منگنی توڑ دو اور کرلو زویا سے شادی... ہے ناں... اتنا آسان نہیں ہے یہ۔" حیدر نے بُرا سا منہ بنایا تھا۔

"تو پھر اب تم کرنا کیا چاہتے ہو؟" زویا جو کافی دیر سے خاموش تھی آخر بول پڑی۔

"مجھے خود نہیں پتہ کہ میں کیا کروں... بابا جان کو میں ہاں کرتا یا نہ کرتا کوئی فائدہ نہیں تھا اُنہوں نے جو کہا تھا وہ کروا کر ہی رہنا تھا مجھ سے..." حیدر نے بے بسی سے کہا۔

"ایک آئیڈیا ہے ویسے میرے پاس..." زین نے کہا تو سب چونک کر اسکی طرف دیکھنے لگے۔

"کیا جلدی بتاؤ...؟" اسد نے بے تابی سے کہا اور سب ہمہ تن گوش تھے۔

"تم منگنی نہ توڑو... ایک گاؤں والی اور ایک شہر والی... دو شادیاں کر لو... بابا بھی خوش اور تم بھی خوش... ہاہاہا۔" بھاری بھرکم زین نے بھرپور قہقہہ لگایا۔

"تمہارا منہ زین... میں بھی کوئی ڈھنگ کا مشورہ دو گے۔" رابعہ نے غصے سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا اور زویا نے اُسے ایک چپت لگائی۔

"یار اگر تم لوگ کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر سکتے تو پلیز مذاق بھی مت بناؤ۔" زویا سنجیدہ تھی۔

"کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے گائز... لیٹس گو..." فراز نے گھڑی پہ ٹائم دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں پلیز یار... جاؤ تم سب لیکچر لو۔" حیدر کو کوفت بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے یار... ٹینشن نہیں لو... دوست تو ہوتے ہی ہنسنے ہنسانے کے لئے ہیں... کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے ہم سب اور پھر تم دونوں کا بھرپور ساتھ بھی دینگے ہر فیصلے میں۔" زین نے حیدر کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"تھینکس بڈی..." حیدر نے کہا۔

"تو تھینکس... تو سوری..." اسد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر سب لوگ کلاس لینے چل دیے لیکن زویا اور حیدر وہیں بیٹھے رہے کیونکہ حیدر کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"حیدر... اب کیا ہوگا؟" زویا نے بیچارگی سے پوچھا۔

"معلوم نہیں... شاید ہمیں بغاوت کرنی پڑے۔" حیدر نے کہا۔

"مجھے یقین ہے کہ میں ڈیڈی کو منا لوں گی۔" زویا نے کہا۔

"مجھے بھی یقین ہے کہ بابا جان کبھی نہیں مانیں گے۔" حیدر نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"حیدر تم صرف میرے ہو... میں تمہارے بغیر نہیں جی سکتی..." زویا نے درد بھری آواز میں کہا۔

"تو میں کب جی سکتا ہوں...؟ تم پریشان نہیں ہو کچھ نہ کچھ حل نکال لیں گے اس مسئلے کا۔"

"اس بار گھر جاؤں گی تو مہر کو سب بتا دونگی... تاکہ وہ ڈیڈی اور موم سے بات کرلے۔"

"ہاں... پہلے تم بات کرو تاکہ پتہ چلے کون ہمارے ساتھ ہے اور کون ہمارے خلاف..." حیدر نے کہا۔

"مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ کون ساتھ ہے اور کون خلاف... مجھے اگر پوری دنیا سے لڑ کر بھی تم سے شادی کرنی پڑی تو میں کرونگی۔" زویا نے اپنے ضدی لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں اپنی وجہ سے مشکلوں میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا زوئی... اسلئے میں تم سے دور بھاگ رہا تھا... لیکن تم نے پھر اپنے لئے نئی

مصیبتیں کھڑی کر لی ہیں۔'' حیدر نے پیار سے زویا کے گالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے لاچارگی سے کہا۔

''تم ساتھ ہو تو پھر کیسی مشکل حیدر... کیسی مصیبت...؟'' زویا نے وارفتگی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میری جان... تم نہیں جانتی... نہیں سمجھتی تم...'' حیدر نے جھنجھلا کر کہا۔

''تو سمجھا دو ناں... بتاؤ کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے؟'' زویا نے ضد کی۔

''میں نہیں جانتا کہ باباجان کے سیاسی حریف کیوں میری جان لینا چاہتے ہیں... شاید اسلئے کیونکہ باباجان مجھے گدی کا وارث بنانا چاہتے ہیں لیکن سیاست کے اس خونی کھیل میں مجھے تمہاری پرواہ ہے زویا... میں کیسے تمہیں تحفظ فراہم کروں گا جبکہ میں خود اپنی حفاظت کے لئے گارڈز کا محتاج ہوں۔'' حیدر نے زویا کی نیلگوں گہری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوا... میں نہیں ڈرتی موت سے...'' زویا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''میں کیسے تمہیں سمجھاؤں زوئی... تم نہیں سمجھو گی مجھے کبھی بھی... بہت ضدی ہو۔'' حیدر نے تمام ہتھیار ڈالتے ہوئے بے بسی سے کہا۔

''وہ تو میں ہوں...'' زویا نے کہا تو دونوں ہنس پڑے۔

☆......☆......☆

''کیسی ہیں امی آپ... اور باباجان کیسے ہیں؟'' مہرو نے فون پہ علیک سلیک کے بعد ماں سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں بیٹا... تمہارے بابا بھی ٹھیک ہیں... تم بتاؤ بچے کیسے ہیں؟'' رخشندہ بیگم نے کہا۔

''جی امی وہ دونوں بھی ٹھیک ہیں۔'' مہرو نے کہا۔

''اور فراز بیٹا کیسا ہے؟'' رخشندہ بیگم نے داماد کے بارے میں پوچھا۔

''جی وہ بھی ٹھیک ہیں بالکل...'' مہرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہارے باباجان بہت یاد کر رہے تھے بچوں کو...'' رخشندہ بیگم نے بیٹی کو بتایا۔

''وہ بھی اپنے ناناجان کو بہت مس کرتے ہیں۔''

''امی آپ نے اپنی رائے نہیں بتائی...؟'' مہرو نے پوچھا۔

''ہاں بیٹا... تمہارے باباجان سے بات ہوئی تھی وہ چاہتے ہیں کہ زویا لاہور سے آجائے تو سفیر کی اور اُسکی ملاقات کروادی جائے اُسکے بعد زویا کو بتایا جائے...''

''اسکا مطلب ہے کہ آپکو اور باباجان کو سفیر پسند ہے؟''

''ہاں... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ فراز کے خاندان سے ہے... کھاتا پیتا ہماری ہی طرح کا سیاسی خاندان ہے...''

''جی امی... چچا جان کا سارا بزنس سفیر کے ہاتھوں میں ہے... ہماری زویا عیش کرے گی اور اُنہیں زویا پسند بھی بہت ہے سر

آنکھوں پہ بٹھائیں گے اُسے۔" مہرو نے خوشی سے کہا۔

"اور وہاں تم بھی ہو گی۔ اُسکا خیال رکھنے کے لئے۔"

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ اس ویک اینڈ پہ جب زویا گھر آئے گی تو میں آپ لوگوں کو اور چچا جان کی فیملی کو اپنے یہاں لنچ پہ بلا لیتی ہوں اس طرح ملاقات ہو جائے گی زویا کی سفیر اور اُسکی فیملی سے..." مہرو نے جھٹ سے پلان بنا لیا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے.. میں تمہارے بابا جان کو بتا دونگی۔" رخشندہ بیگم نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر میں بھی فراز کو خوشخبری سنا دیتی ہوں.. بہت ایکسائٹڈ ہیں وہ زویا اور سفیر کے رشتے کو لیکر.. اگر یہ رشتہ ہو گیا ناں امی تو فراز کو بے حد خوشی ہو گی اور میری عزت اور بھی بڑھ جائے گی اس گھر اور خاندان میں..."

"ہاں بیٹا.. بس دعا کرو کہ ہماری صاحبزادی مان جائیں۔" رخشندہ بیگم نے کہا۔

"مان جائے گی امی آپ فکر نہ کریں.. میں منا لوں گی اُسے۔"

"چلو ٹھیک ہے بیٹا.. خدا حافظ۔"

"خدا حافظ.." فون بند کرنے کے بعد رخشندہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں کہ اگر زویا نہ مانی تو کہیں مہرو کی ساکھ اُسکے سسرال میں متاثر نہ ہو جائے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں گم تھیں کہ پورچ میں گاڑی کے رُکنے کی آواز آئی۔ داخلی دروازے سے زویا کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر حیران بھی ہوئیں اور خوش بھی۔

"اسلام وعلیکم موم۔" زویا نے دور ہی سے ماں کو دیکھ کر بلند آواز میں کہا۔

"وعلیکم السلام میری جان... ارے دیکھو تو آج سورج کہاں سے نکلا ہے جو ہماری لاڈلی کو گھر کی یاد آ گئی..." رخشندہ بیگم نے اُسے گلے سے لگاتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"بس آ گئی یاد... اور ہم چلے آئے۔" زویا نے مسکراتے ہوئے شاہانہ انداز میں کہا۔

"میری پیاری شہزادی۔" رخشندہ بیگم نے محبت سے اُسکے حسین بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جو کندھوں پہ جھول رہے تھے۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ آپ مجھے ہی یاد کر رہی تھیں..؟" زویا نے شکی نظروں سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"سچ کہا تم نے.. بڑی لمبی عمر ہے تمہاری ابھی مہرو اور میں تمہیں ہی یاد کر رہے تھے۔"

"کیا مہرو آئی ہوئی ہے؟" زویا نے پوچھا۔

"نہیں.. فون پہ بات ہوئی ہے ابھی میری اُس سے... کہہ رہی تھی کہ اس ویک اینڈ پہ اُسکی طرف لنچ ہے ہم سب کا۔" رخشندہ بیگم نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے بتایا۔

"ارے واہ... پھر تو مزہ آ جائے گا۔" زویا نے خوشی سے کہا۔

"ہاں... وہاں سب تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں... بچے، مہرو اور فراز... سب تمہارا ہی ذکر کرتے رہے تھے اُس رات ڈنر پہ بھی۔"

"مجھے بھی بچوں کی بہت یاد آرہی ہے... کافی دن ہو گئے اُن سے ملے ہوئے۔" زویا نے کہا۔

"چلو تم فریش ہو جاؤ... میں تمہارے لئے کھانا لگواتی ہوں۔" رخشندہ بیگم نے کہا۔

"یس موم..." زویا صوفے سے اُٹھتے ہوئے ماں کے چہرے پہ بوسہ دیتی اپنی کمرے کی طرف چل دی۔ زویا ابھی فریش ہو کر واش روم سے نکلی ہی تھی کہ اُسکا سیل فون بجنے لگا۔ اُس نے اپنا سیل فون دیکھا تو اُس پہ حیدر کا نام جگمگا رہا تھا۔ زویا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"ہیلو..." زویا نے جلدی سے فون کان کو لگاتے ہوئے کہا۔

"پہنچ گئی خیریت سے؟" حیدر نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں پہنچ گئی ہوں... تھوڑی دیر ہوئی ہے۔"

"بہت مس کر رہا ہوں تمہیں یہاں... کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا۔" حیدر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

"اوہ... مس تو میں بھی کر رہی ہوں تمہیں۔"

"تو پھر واپس آ جاؤ۔"

"حیدر... کیا ہو گیا ہے تمہیں...؟" زویا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہنس لو... ہنس لو..." حیدر کو جلن محسوس ہوئی تھی۔

"اچھا پھر بات ہو گی... ابھی میں موم کے پاس جا رہی ہوں... بائے۔" زویا نے کہا۔

"او کے... بائے۔" حیدر نے کہا اور کال بند کر دی۔

رات کے کھانے پہ رخشندہ بیگم نے سکندر حیات خان کو کل کے لنچ کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔ زویا رات کو کھانے کے بعد اپنے کمرے میں لیٹی سوچ رہی تھی کہ وہ پہلے کس سے بات کرے ماں سے یا بہن سے۔ لیکن اُسے اس کام کے لئے مہرو سب سے مناسب انتخاب لگ رہی تھی اسلئے اُس نے سوچ لیا تھا کہ کل وہ موقعہ ملتے ہی مہرو سے بات کرے گی۔ یہی سب باتیں اُسکے دماغ میں چل رہی تھیں لیکن وہ اپنے گھر والوں کے ارادوں سے بالکل بے خبر تھی۔ سفیر اور اُسکی فیملی کے بارے میں اُسے قصداً نہیں بتایا گیا تھا۔ اگلے دن سکندر حیات، زویا اور رخشندہ بیگم تینوں مہرو کے گھر موجود تھے۔ ملک امتیاز بھی اپنی فیملی کے ہمراہ وہاں پہلے سے موجود تھے۔ زویا کو وہاں بیٹھے ہوئے سخت کوفت محسوس ہو رہی تھی کیونکہ سامنے بیٹھا ہوا ملک سفیر اُسے گھور رہا تھا۔ اور اُسکی ماں بار بار اُسکے قصیدے پڑھ پڑھ کر دوسروں کو سنا رہی تھی جسے رخشندہ بیگم بہت شوق سے سن رہی تھیں اور خوش بھی ہو رہی تھیں۔ زویا وہاں سے اُٹھ کر مہرو کے پیچھے پیچھے کچن میں آ گئی جہاں وہ ملازموں سے لنچ کی تیاری کروا رہی تھی۔

"مہرو..مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" زویا نے اُسے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

"ارے..تم ادھر کیا کر رہی ہو؟ جاؤ جا کر وہاں سب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھو..کیا سوچیں گے سب؟" مہرو نے حیرانگی سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں تھک گئی ہوں تمہاری چاچی ساس کی بک بک سنتے سنتے...مجھے نہیں جانا وہاں۔" زویا نے غصے سے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔

"بُری بات ہے زویا..بڑوں کے بارے میں ایسے نہیں کہتے۔" مہرو نے خفگی سے کہا۔

"اچھا اچھا بس..زیادہ لیکچر دینے کی ضرورت نہیں..اور مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" زویا نے کہا۔

"اچھا کر لینا...لنچ سے تو فارغ ہو نے دو پھر تسلی سے بیٹھ کر سنوں گی تمہاری بات۔" مہرو نے ملازمہ سے سپیشل قسم کا ڈزرٹ نکلواتے ہوئے کہا۔

"اچھا..ٹھیک ہے میں باہر لان میں جا رہی ہوں کیونکہ وہ تمہارا بدتمیز دیور مجھے زہر لگ رہا ہے جو ہونقوں کی طرح مجھے گھور رہا ہے مسلسل۔" زویا نے بُرا سا منہ بنا کر اُسکی نقل اُتاری تھی جس پہ مہرو کو ہنسی آ گئی۔

"اب اس میں سفیر بیچارے کا کیا قصور..تم ہو ہی اتنی حسین کہ دل چاہتا ہے دیکھتے ہی رہو۔" مہرو نے کہا تو زویا نے اُسے گھورا۔

"بی بی جی تواڈی بھین بڑی سوہنی ہے جی..ایناں دیاں اَکھاں وڈیاں وڈیاں...لگدا اے حور ہے۔" پاس کھڑی ماسی نے بھی اپنا خیال ظاہر کیا تھا جسے سن کر مہرو اور زویا قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔

"توبہ ہے...یہاں کے تو نوکر بھی پاگل ہیں بالکل۔" زویا نے کہا اور کچن سے نکل کر لان کی طرف چل دی۔لان میں پہنچ کر اُس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا تھا۔وہ وہاں بیٹھی بیٹھی بور ہو گئی تھی۔سکندر حیات اور ملک امتیاز کی سیاسی گفتگو اور سکار کی بدبو کے ساتھ ملک سفیر کی بے باک نظریں اُسے وہاں سے بھگانے کے لئے کافی تھیں۔وہ لان میں بیٹھ کر ٹھنڈی ہوا کے مزے لینے لگی۔لان میں سبز گھاس اور پھولوں کی مہک اُسکے دل و دماغ کو تازگی بخش رہے تھے۔پرندوں کی چہچہاہٹ اور نرم دھوپ ماحول کو مزید خوشگوار بنا رہے تھے۔وہ کُرسی کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے حیدر کے خیالوں میں گم تھی جب ملک سفیر اُسکے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور یک ٹک بنا پلکیں جھپکائے اُسکے حسین چہرے کو اپنی نگاہوں میں سمونے لگا۔کچھ دیر بعد زویا نے آنکھیں کھولیں تو اُسے سامنے دیکھ کر وہ ایک جھٹکے سے سیدھی ہو گئی۔

"وہ..آپ شاید اندر کے سیاسی ماحول سے اُکتا کر باہر آ گئیں ہیں..؟" سفیر نے بڑے مودبانہ لہجے میں کہا لیکن اُسے دیکھ کر زویا کو شدید غصہ آیا تھا۔

"اور بھی بہت سی باتیں تھیں جن سے اُکتا کر میں باہر آئی تھی..." زویا نے بُرا سا منہ بنا کر بے باکی سے اُسے کہا۔

"مثلاً...؟" سفیر نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں آپکو جواب دہ نہیں ہوں..." زویا نے غصے سے تیز نظر سے دیکھ کر اسے کہا۔

"سوال کرنے والے کو جواب تو دینا ہی پڑتا ہے..." سفیر نے کہا لیکن زویا نے نخوت سے منہ پھیر لیا جو کہ سفیر کو بے حد ناگوار گزرا۔

"اندر آ جائیں... آپکا انتظار ہو رہا ہے۔" سفیر نے اُسکا غصہ نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"آپ چلیں... میں آ جاؤں گی جب میرا دل چاہے گا۔" زویا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے... میں اندر جا کر سب کو کہہ دیتا ہوں کہ وہ لنچ پہ آپکا انتظار نہ کریں۔" سفیر نے عام سے لہجے میں کہا۔

"اوہ... لنچ کے لئے بُلا رہے ہیں پہلے بتانا تھا ناں۔" زویا نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"جی آپ نے موقعہ ہی کب دیا بتانے کا..." سفیر نے زیرِ لب مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"ہٹیں میرے راستے سے..." زویا نے کہا اور جلدی سے اُسکے سامنے سے ہوتی ہوئی اندر کی طرف بڑھ گئی لیکن سفیر وہیں کھڑا اُسکی خوشبو کو محسوس کرتا رہا۔ لنچ کرتے ہوئے بھی سفیر سے اپنی نظریں اُسکے چہرے سے ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ زویا کے حسن اور نزاکت نے اُسے بے حد متاثر کیا تھا۔ اور پھر اُسکا بے باک انداز گفتگو اُسے مکمل طور پہ زیر کرنے کے لئے کافی تھا۔ دونوں خاندانوں کی ملاقات کافی دلچسپ رہی تھی لیکن زویا کو سفیر ایک آنکھ بھی نہیں بھایا تھا۔ ویسے بھی زویا اس بات سے بے خبر تھی جو کچھ بھی اُسکی فیملی نے پلان کیا ہوا تھا۔ دعوت کی مصروفیات میں مہرو اور زویا کو وقت ہی نہیں ملا تھا بات کرنے کا لیکن مہرو نے جاتے ہوئے زویا سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگلے دن اُس سے ملنے گھر ضرور آئے گی کیونکہ زویا ہی نہیں مہرو بھی اُس سے کچھ بات کرنا چاہتی تھی۔ وعدے کے مطابق مہرو اگلے دن بارہ بجے سکندر حیات کے بنگلے پہ موجود تھی۔ زویا ناشتے کے بعد ٹی۔وی دیکھتے ہوئے مہرو ہی کی منتظر تھی۔

"شکر ہے محترمہ آپ تشریف لے آئیں ہیں..." زویا نے مہرو کو آتا دیکھ کر کہا۔

"زویا جی بلائیں اور کوئی نہ آئے... ایسا ہو سکتا ہے بھلا؟" مہرو نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا جنابِ عالی... چائے پیو گی؟" زویا نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ..."

"نوراں... چائے لے آؤ باجی آ گئیں ہیں۔" زویا نے ملازمہ کو حکم دیا جو کافی دیر سے بیٹھی اُسکے پاؤں دبا رہی تھی۔

"ہاں... بتاؤ اب کیا بات کرنی تھی۔" مہرو نے پوچھا۔

"نہیں... پہلے تم بتاؤ پھر میں بتاؤں گی۔" زویا نے کہا۔

"ٹھیک ہے... اچھا یہ بتاؤ کہ تمہیں کل ملک امتیاز اور اُنکی فیملی کیسی لگی؟" مہرو نے شوق سے اُسکے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک تھے.." زویا نے لاپرواہی سے کہا جیسے کوئی خاص بات نہ ہو۔

"کیا مطلب..ٹھیک تھے؟"

"مطلب جیسے لوگ ہوتے ہیں..عام سے۔چھچھورا سا وہ سفیر تو مجھے بہت زہر لگا۔" زویا نے سفیر کے نام پہ بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں..اُس نے ایسا کیا کر دیا؟" مہرو نے خفگی سے کہا۔

"کیا کر دیا...یہ پوچھو کونسی ایسی گھٹیا حرکت تھی جو اُس نے نہیں کی..ایک نمبر کا لوفر لفنگا لگا مجھے۔" زویا جتنا بُرا اُسے کہہ سکتی تھی کہہ دیا اور مہرو حیرت سے منہ کھولے اُسے تکتی رہی۔

"ہیلو...کیا ہو گیا؟" زویا نے مہرو کو حیرت سے منہ کھولے دیکھا تو اُسکے منہ کے آگے چٹکی بجاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے کہ وہ کتنا بڑا بزنس چلا رہا ہے اور کتنا سمارٹ اور جینٹلمین ہے وہ؟" مہرو نے سفیر کے حق میں بولنا شروع کیا۔

"ہاں..ہاں معلوم ہے مجھے..." زویا نے بسکٹ چائے میں ڈبو کر منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہے..؟؟؟ لیکن کیسے؟" مہرو کو مزید حیرت ہوئی۔

"کل پورا وقت اُسکی ماں اُسی کے قصیدے تو پڑھ کر سناتی رہی...تو معلوم تو ہونا ہی تھا۔" زویا نے چائے کا گھونٹ بھرا تھا۔

"تمہیں اُن لوگوں سے اسلئے ملوایا گیا تھا کیونکہ ہم تمہارا اور سفیر کا رشتہ کرنا چاہتے ہیں۔" مہرو نے کہا تو چائے پیتے ہوئے زویا کو اچھولگا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے مہرو کو دیکھنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہو...؟" زویا کو حیرت ہوئی تھی۔

"سچ کہہ رہی ہوں..ڈیڈی اور امی کو بھی سفیر پسند ہے اور اُنکی بھی یہی خواہش ہے۔" مہرو نے سنجیدگی سے کہا۔

"Are you ssrious?" زویا نے تصدیق چاہی۔

"Yess, I am" مہرو نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ نا ممکن ہے۔" زویا نے اٹل لہجے میں کہا۔

"لیکن کیوں؟" مہرو نے پوچھا۔

"کیونکہ...میں حیدر کو پسند کرتی ہوں اور اُسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔" زویا نے کہا۔

"حیدر...وہی حیدر جسکی وجہ سے تم موت کے منہ سے واپس آئی ہو؟" مہرو کو حیرت ہوئی۔

"زویا...یہ ٹھیک نہیں ہے۔" مہرو نے کہا۔

"کیوں ٹھیک نہیں ہے؟ حیدر بھی ہماری طرح سیاسی خاندان سے ہے..ہم سے زیادہ امیر لوگ ہیں اور اُسکے بابا ملتان میں گدی نشین ہیں...اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں اور حیدر محبت کرتے ہیں۔" زویا نے مہرو کو منانے کی کوشش کی۔

"ایسے لوگ نہ تو خاندان سے باہر شادیاں کرتے ہیں اور نہ ہی اتنی ماڈرن قسم کی پڑھی لکھی بہو گھر لاتے ہیں گی..." مہرو نے اُسے دیکھتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"حیدر اپنے بابا کو منالے گا۔وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے مہرو اور وہ میرے لئے سب کچھ کر سکتا ہے۔" زویا نے کہا۔

"ڈیڈی کبھی بھی نہیں مانیں گے زویا...وہ ہمارے سیاسی حریف ہیں تمہیں اندازہ ہے اس بات کا؟" مہرو نے اُسے حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس بات کی کوئی پرواہ نہیں مہرو...سیاست کا محبت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔" زویا نے خفگی سے منہ پھیر کر کہا۔

"لیکن زندگی سے ہوتا ہے...تم کیوں ڈیڈی کے خلاف جا کر انہیں تکلیف پہنچانا چاہتی ہو؟"

"میں اُنکے خلاف نہیں جا رہی...میں صرف اپنا حق استعمال کر رہی ہوں..اپنی مرضی کی شادی کرنا میرا حق ہے اور یہ بات کس کے خلاف ہے مجھے اسکی ذرہ برابر بھی پرواہ نہیں۔" زویا نے اٹل لہجے میں کہا۔

"تمہیں اپنی بات پہ غور کرنا چاہیے زویا...یہ بھی تمہیں ہے کہ تم خود غرض ہو کر صرف اپنے بارے میں سوچو...تم کس خاندان سے تعلق رکھتی ہو یہ تمہیں ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہیے۔" مہرو نے اُسے تنبیہ کی۔

"آخر اس میں پرابلم کیا ہے...؟ میں کسی ایرا غیرا نتھو خیرا سے شادی نہیں کرنا چاہتی کہ امیری غریبی سے ہمارے سٹیٹس کے حوالے سے کوئی ایشو کھڑا ہو جاHe is Peer Haider Ali Gillani.... Do you understand? یہ کوئی چھوٹی بات نہیں مہرو...تمہارے سسرال جیسے لوگ بھی اُنکی جوتیاں سیدھی کرتے ہیں۔" زویا نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"بے وقوف ہو تم...بات سٹیٹس کی نہیں ہے۔" مہرو نے غصے سے کہا۔

"تو پھر اور کیا بات ہے؟" زویا نے چڑچڑے انداز میں کہا۔

"وہ ہمارے سیاسی حریف ہیں...اور یہ بات ہم بھی جانتے ہیں اور وہ بھی...ایسے میں تمہیں لگتا ہے کہ یہ دو خاندان آپس میں رشتہ جوڑنے کے لئے تیار ہو جائیں گے؟" مہرو نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"دنیا میں کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی مہرو...صرف سچی لگن اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔" زویا چند لمحے سوچنے کے بعد بولی۔

"او اچھا...تو اسکا مطلب ہے تم یہ ناممکن کام ممکن بنا سکتی ہو؟" مہرو نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں...کیونکہ ڈیڈی کے ذہن کو میں تم سے بہتر طور پہ سمجھتی ہوں...تم بس میری خواہش اُن تک پہنچا دو۔" زویا نے پُر سوچ انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی...میں اور فراز تو بہت خوش تھے کہ تم بھی ہمارے خاندان کا حصہ بنو گی اور ہم سب ہمیشہ ایک ساتھ رہیں گے...لیکن تم نے تو اپنے لئے بالکل جدا راہیں چُن لی ہیں زویا..." مہرو نے بجھے ہوئے اُداس لہجے میں کہا۔

''مہرو... پلیز یار اب ایسے اُداس تو نہ ہو.. دل کس کے اختیار میں ہوتا ہے یہ تو کسی پہ بھی آ سکتا ہے.. میں حیدر کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی مجھے اُس سے عشق کی حد تک محبت ہے۔'' زویا نے بےبسی سے کہا۔

''خدا کرے تمہیں تمہاری محبت حاصل ہو جائے۔'' مہرو کے دل میں بہن کی محبت ہر دوسری چیز اور مفاد سے بالاتر تھی۔ مہرو نے دعا دی تو زویا اُسکے گلے سے لگ گئی۔ اتنے میں رخشندہ بیگم جو خانساماں کے ساتھ گروسری کرنے گئی ہوئی تھیں داخلی دروازے سے اندر آئیں۔ اُنکے پیچھے پیچھے ملازم بہت سا سامان اُٹھائے چلے آ رہے تھے۔

''ارے.. مہرو. تم آج اس وقت کیسے آ گئیں؟'' مہرو کو بیٹھا دیکھ کر وہ حیران ہوئی تھیں۔

''بس آ گئی.. آپکی لاڈلی نے کچھ ضروری بات کرنی تھی اسلئے آنا پڑا۔'' مہرو نے کہا۔

''اچھا. تبھی تو.. ورنہ کل ملاقات ہوئی ہے اور تم مہینے بھر سے پہلے کب آتی ہو..'' رخشندہ بیگم نے اُنکے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

''موم آپ کیا پورا اسٹور خرید لائی ہیں. ایک سال کی گروسری آج ہی کر لی کیا؟'' زویا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بس بیٹا.. روز روز کہاں نکلا جاتا ہے اسلئے میں خانساماں کو ساتھ لیکر دو مہینے کی گروسری کر آئی ہوں۔'' رخشندہ بیگم نے پانی کا گلاس ملازمہ سے لیتے ہوئے کہا۔

''چلیں اب آپ ریسٹ کریں.. تھک گئی ہونگی۔'' مہرو نے کہا۔

''کیا باتیں ہو رہی تھیں تم دونوں میں.. اتنی ضروری؟'' رخشندہ بیگم نے بیٹیوں کے چہرے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپکو بھی بتا دیں گے.. آپ ریسٹ کریں ابھی پھر رات کو ڈیڈی کے ساتھ ہی آپکو بھی بتاؤں گی۔'' مہرو نے کہا تو زویا وہاں سے قصداً اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''کوئی خاص بات ہے کیا..؟ تم نے زویا سے اُسکی مرضی پوچھی سفیر کے حوالے سے؟'' رخشندہ بیگم نے مہرو سے پوچھا۔

''جی اسی.. اسی حوالے سے بات کرنی ہے میں نے آپ سے اور ڈیڈی سے۔'' مہرو نے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے.. میں کچھ دیر آرام کرلوں پھر تمہارے ڈیڈی بھی آ جائیں گے تو بات کریں گے۔'' رخشندہ بیگم نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیں۔ مہرو بھی اپنے کمرے میں آرام کرنے لیٹ گئی۔

''ہیلو. حیدر کہاں ہو بھئی؟'' کافی دیر بیل ہونے کے بعد جب حیدر نے فون اُٹھایا تو زویا نے بےتابی سے پوچھا۔

''تمہارے دل میں ہوں..'' حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''رومانس کرنے کے لئے نہیں بولا. ٹھیک بتاؤ کہاں ہو؟'' زویا نے کہا۔

''گاؤں میں ہوں زوئی.. کیا ہوا؟'' حیدر نے کہا۔

''میں نے مہرو سے بات کرلی ہے.. وہ آج رات ڈیڈی سے بات کرے گی۔''

''!Thats great..'' حیدر نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

''اور مجھے یقین ہے جو بات میں ڈیڈی سے کہوں گی وہ ضرور مان جائیں گے۔''

''بابا جان بھی مان گئے ہیں۔ تمہاری سوچ اور ویژن واقعی لاجواب ہے زوئی... یو آر جینئس۔'' حیدر نے خوشگوار انداز سے کہا۔

''دیکھا۔ میں نے کہا تھا ناں مان جائیں گے۔ آخر تھوڑی بہت سیاست تو مجھے بھی کھیلنی آتی ہے... میں بھی اسی سسٹم کی پیداوار ہوں آخر۔'' زویا نے فخر سے کہا۔

''سہی کہا تم نے.. تمہاری بات واقعی کارگر ثابت ہوئی لیکن ایک پرابلم ہے۔'' حیدر نے کہا۔

''کیسی پرابلم؟''

''اُنہوں نے شرط رکھ دی ہے شادی کے لیے...'' حیدر نے مایوس لہجے میں کہا۔

''کیسی شرط؟'' زویا نے بے تابی سے پوچھا۔

''اُنہوں نے کہا ہے کہ اگر میں سوہائی سے بھی شادی کر لوں تو وہ ہماری شادی میں رکاوٹ نہیں بنیں گے...'' حیدر نے بتایا۔

''what nonsense haidsr... ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' زویا کو ناگوار لگا۔

''تمہاری کہی ہوئی بات جب میں نے ان سے کی تو وہ کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر مان گئے لیکن اُنکی شرط یہی ہے کہ سوہائی سے شادی ہوگی تو تم سے ہوگی۔'' حیدر نے تفصیل بتائی۔

''یہ ناممکن ہے... میں تمہیں کبھی بھی کسی کے ساتھ شیئر نہیں کر سکتی۔ تم سمجھ رہے ہو ناں حیدر...'' زویا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''زویا پلیز خود کو سنبھالو... میں نے ان سے سوچنے کا وقت مانگا ہے لیکن یہ اچھی بات ہے کہ وہ ہماری شادی کے لئے مان گئے ہیں ورنہ مجھے تو اتنی سی بھی اُمید نہیں تھی۔'' حیدر نے اُسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے حیدر... لیکن اُنہوں نے ایسی کڑی شرط اس لئے لگائی ہے تا کہ ہم نہیں مانیں اور تمہیں سوہائی سے ہی شادی کرنی پڑے۔'' زویا کی آواز سے پریشانی عیاں تھی۔

''لیکن ہمارے پاس اُنکی شرط ماننے کے سوا کوئی اور آپشن ہے کیا؟'' حیدر نے پوچھا۔

''میرے ذہن میں ایک بات ہے۔ لیکن وہ کام آئے گی یا نہیں میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔''

''اچھا بتاؤ تو سہی...''

''جیسے تمہارے بابا جان نے شرط لگائی ہے تم بھی ایک شرط لگا دو...''

''میں کیا شرط لگا سکتا ہوں؟'' حیدر نے حیرانگی سے پوچھا۔

''وہ یہ کہ پہلے تمہاری شادی مجھ سے ہوگی...'' زویا نے کہا۔

"وہ ایسی شرط کبھی نہیں مانیں گے... کیونکہ سوہائی میرے چچا کی بیٹی ہے اور وہ ایسا ہونے نہیں دیں گے کہ منگنی اُن کی بیٹی سے اور شادی کسی اور سے..." حیدر نے کہا۔

"اُنہیں کوئی بتائے گا تو ہی اُنہیں پتہ چلے گا ناں... ہماری شادی شہر میں ہوگی گاؤں میں نہیں۔" زویا نے کہا۔

"کاش ہم عام لوگ ہوتے تو شہر میں شادی کرتے یا گاؤں میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہ میڈیا والے کتوں کی طرح ہم جیسے لوگوں کی بُو سونگھتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں اور شادی ہو یا مرگ اگلے ہی دن اخبار کی پہلی ہیڈ لائن بن جاتی ہے تصویروں سمیت..." حیدر نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے مجھے سوچنے کا وقت دو۔ ابھی تو مجھے ڈیڈی سے بھی بات کرنی ہے۔ کہیں وہ بھی نہ کوئی شرط لگا دیں۔" زویا نے اُلجھے ہوئے انداز سے کہا۔

"اچھا اب زیادہ اپ سیٹ نہیں ہو پلیز... میں تمہارے ساتھ ہوں ہر حال میں۔" حیدر نے اُسے تسلی دی۔

"i know..." زویا نے آہستہ سے کہا۔

"چلو موڈ ٹھیک کرو یار... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" حیدر نے کہا۔

"اچھا بعد میں بات ہوتی ہے۔" زویا نے کہا۔

"خدا حافظ۔" حیدر نے کہا اور زویا نے فون بند کر دیا۔ وہ سوچ میں پڑ گئی تھی جب سے حیدر نے اُسے شہباز علی گیلانی کی شرط سے آگاہ کیا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اُس نے اس پہلو پہ غور کیوں نہیں کیا جب وہ حیدر کو اپنے باپ سے بات منوانے کا طریقہ سمجھا رہی تھی۔ زویا اپنی ہی کہی ہوئی باتوں کو دوبارہ یاد کر کے اُن کے کمزور پہلوؤں پہ غور کرنے لگی تھی۔

"حیدر مجھے ایک آئیڈیا آیا ہے جس سے تم اپنے بابا اور میں اپنے ڈیڈی کو منا سکتی ہوں ہماری شادی کے لئے..." زویا جو حیدر کے پہلو میں بیٹھی کافی دیر سے سوچوں میں گم تھی اچانک سے بول پڑی۔

"کیسا آئیڈیا زوی...؟" حیدر نے اُسے حیرت سے دیکھا۔

"تمہارے بابا اور میرے ڈیڈی اسلئے نہیں مانیں گے کہ وہ دونوں سیاسی حریف ہیں... لیکن اگر ہم دونوں اُن دونوں کو حریف بننے کے بجائے دوست بننے کا مشورہ دیں تو یہ دشمنی ختم کی جا سکتی ہے۔" زویا نے خوشی سے کہا۔

"ہاں اور وہ دونوں تو بچے ہیں ناں کہ ہم کہیں گے چلو بیٹا لڑائی لڑائی معاف کرو اللہ کا گھر صاف کرو اور وہ خوشی خوشی ہاتھ ملا لیں گے۔" حیدر نے منہ بناتے ہوئے کہا اُسے زویا کا آئیڈیا بے حد بچگانہ لگا تھا۔

"سٹوپڈ میں یہ نہیں کہہ رہی۔ تم میری بات نہیں سمجھے۔" زویا نے اُسکے ہاتھ پہ زور کا تھپڑ مار کر کہا۔

"تو پھر آپ کیا فرما رہی ہیں محترمہ... ذرا سمجھائیں گی؟" حیدر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تم اپنے بابا جان کو میرے ڈیڈی کے ساتھ سیاست میں ہاتھ ملا کر مزید اپنے قدم مضبوط کرنے کو بولو گے اور میں اپنے ڈیڈی سے یہی بات کہوں گی جب وہ کوئی اعتراض کریں گے... اس طرح ہم دو سیاسی دشمنوں کو ایک دوسرے کا حامی بنا دیں گے بلکہ میں اپنے ڈیڈی کو کہوں گی کہ وہ تمہارے بابا کی سیاسی پارٹی کو جوائن کر لیں اس طرح سیاست میں اُن کی پوزیشن زیادہ سٹرانگ ہو جائے گی.." زویا نے کہا اور جواب کے لئے اُسکا منہ تکنے لگی۔

"ارے واہ.. تم تو بڑی سیاسی سوچ رکھتی ہو۔" حیدر نے چند لمحے سوچنے کے بعد زویا کی معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کو سراہا تھا۔

"اس سے بہتر طریقہ اور کوئی نہیں ہو سکتا... اس طرح وہ دونوں اپنے اپنے مفاد کی خاطر مان جائیں گے اور ہمیں کوئی غلط قدم بھی اٹھانا نہیں پڑے گا۔" زویا نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"سچی کہہ رہی ہو... میں ویسے بھی کورٹ میرج کے حق میں نہیں تھا لیکن تمہارے لئے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں زویا۔" حیدر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"تو بس پھر اس ویک اینڈ تم بھی گھر جا رہے ہو اور میں بھی پھر تم بھی اپنے بابا سے یہ بات کرنا اور میں بھی اپنے ڈیڈی سے کروں گی اور پوری کوشش اور وسیلے سے ہم انہیں منا لیں گے۔" زویا نے کہا۔

"یس باس... کوئی اور حکم میرے آقا؟" حیدر نے اپنا سر جھکا کر کہا تو زویا ہنس دی۔

زویا ابھی اپنے کمرے میں کاؤچ پہ لیٹی ابھی سوچوں میں گم تھی کہ کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی اور وہ اپنی سوچوں کی وادی سے باہر آئی تھی۔ "آ جاؤ" زویا نے کہا۔

"بی بی جی.. آپکو صاحب بلا رہے ہیں۔" نوراں نے دروازے سے منہ نکال کر کہا تھا۔

"تم چلو.. میں آتی ہوں۔" زویا نے کہا تو وہ سر جھکا کر چلی گئی۔ زویا جلدی سے کاؤچ سے اُتر کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آئی اور اپنا حلیہ درست کرتی ہوئی کمرے سے نکل کر سیڑھیوں سے نیچے اُتر آئی جہاں لاؤنج میں مہرو اور رخشندہ بیگم موجود تھیں۔

"ڈیڈی کہاں ہیں؟" زویا نے سکندر حیات خان کو وہاں نہ پا کر پوچھا۔

"سٹڈی میں تمہارے منتظر ہیں.." مہرو نے کہا اور رخشندہ بیگم اُسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگیں جیسے اُن کی آنکھوں میں کوئی ملال ہو۔

"ڈیڈی..." زویا نے سٹڈی کے دروازے پہ ناک کرتے ہوئے باپ کو مخاطب کیا۔

"آ جاؤ... اور میرے پاس بیٹھو" سکندر حیات خان نے کہا تو زویا آہستہ سے چل کر اُنکے سامنے رکھی ہوئی کرسی پہ بیٹھ گئی۔

سکندر حیات نے کتاب سٹڈی ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اپنے گلاسز بھی اُتار کر رکھ دیے۔ زویا کو دل ہی دل میں خوف بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن وہ پُر اعتماد تھی۔

"مہرو نے بتایا ہے کہ تم نے سفیر کے رشتے سے منع کر دیا ہے؟" سکندر حیات نے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ڈیڈی..." زویا نے آہستہ سے سر جھکا کر کہا۔

"اور اسکی وجہ وہ پیر شہباز علی گیلانی کا بیٹا حیدر علی گیلانی ہے...؟" سکندر حیات نے کہا تو زویا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"جی ڈیڈی..."

"حیدر علی گیلانی میرے سیاسی حریف کا بیٹا ہے.. اور اُسکے ساتھ تمہاری زندگی محفوظ نہیں ہے"

"لیکن میں اُسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں ڈیڈی... اور حادثہ تو کبھی بھی کسی کے بھی ساتھ ہو سکتا ہے۔" زویا نے معقول دلیل پیش کی تو سکندر حیات سوچ میں پڑ گئے۔

"اُنکا خاندانی نظام ہم سے یکسر مختلف ہے اور تم وہاں ایڈجسٹ نہیں کر پاؤ گی۔"

"حیدر اور میں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں اور ایسے میں ایڈجسٹمنٹ کا کوئی پرابلم نہیں ہوگا..."

"پیر شہباز علی گیلانی جیسے لوگ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے.. میرا نہیں خیال کہ وہ ہم سے رشتہ جوڑنا چاہیں گے اسلئے بہتر یہی ہے کہ تم سفیر کے رشتے پہ غور کرو۔" سکندر حیات خان نے حتمی طور پہ کہا۔

"مجھے سفیر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے.. میں صرف حیدر سے ہی شادی کرونگی ڈیڈی۔" زویا نے ضدی بچوں کی طرح کہا۔

"وہ ہمارے مخالفین ہیں اور کبھی بھی ہم سے رشتہ نہیں جوڑیں گے۔"

"تو پھر مخالفین کو اپنا بنانے کا اس سے بہتر اور کوئی موقع نہیں ملے گا ڈیڈ... اس طرح سیاست میں آپکی پوزیشن مزید اچھی ہو جائے گی اور اُنکی پارٹی جوائن کر کے آپ الیکشن بھی باآسانی جیت سکیں گے۔" زویا نے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اس رشتے پہ راضی ہو جائیں گے؟"

"جی ڈیڈی... مجھے یقین ہے حیدر اُنہیں منا لے گا... سفیر سے آپکو سیاست میں وہ فائدہ نہیں ملے گا جو حیدر کے ساتھ میری شادی کے بعد آپکو ہوگا... آپ خود سوچئے کہاں پیر شہباز علی گیلانی ایک خاندانی جانے مانے سیاست دان جو سالوں سے سیاست کرتے آ رہے ہیں اور کہاں ملک امتیاز قصوری ایک سٹرگلنگ سیاست دان جو نئے نئے بزنس سے نکل کر سیاست میں قدم جمانے کی کوشش کر رہے ہیں... اور جب میڈیا والوں تک یہ بات پہنچے گی کہ سکندر حیات خان کی بیٹی زویا سکندر کی شادی پنجاب کے جانے مانے سیاست دان پیر شہباز علی گیلانی کے بیٹے کے ساتھ لاہور میں انجام پائی تو سوچئے ڈیڈی پورے پاکستان کے سیاستدانوں میں آپکی دھوم مچ جائے گی۔" زویا نے پورا منظر کھینچتے ہوئے باپ کو رام کرنے کی کوشش کی۔

"چلو ٹھیک ہے... سوچتے ہیں اس بارے میں..." سکندر حیات نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اسکا مطلب آپکو کوئی اعتراض نہیں...؟" زویا نے پوچھا۔

"جیسے میری بیٹی کی خوشی..." سکندر حیات نے کہا۔

"اوہ ڈیڈی.. آپ کتنے اچھے ہیں۔ آئی لو یو۔" زویا نے خوشی سے اُنکے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا تو سکندر حیات مسکرا دیے۔ ایک تو وہ اپنی لاڈلی کی ہر بات مانتے تھے دوسرا اُنکا ہر فیصلہ نفع و نقصان کی بنیاد پہ ہوا کرتا تھا۔ وہ دوستیاں اور رشتے داریاں جوڑتے ہوئے اُن سے حاصل ہونے والے فائدوں کو بھی نظر میں رکھا کرتے تھے اور اپنے باپ کی اس فطرت سے زویا اچھی طرح واقف تھی اسلئے اُس نے اپنے فائدے سے زیادہ اپنے باپ کے فائدے کی بات کی تھی۔ زویا کا تیر نشانے پہ لگا تھا اور اب مسئلہ تھا تو صرف اور صرف پیر شہباز علی گیلانی کی لگائی گئی شرط کا تھا جو ابھی حل طلب تھا۔

ٹی۔ وی لاؤنج میں آرام کرسی پہ بیٹھے ملک فراز قصوری ایک نجی چینل پہ نشر ہونے والا ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ فائر پلیس پہ ہیٹر کے جلنے سے ماحول بہت کوزی ہو رہا تھا اور ایسے میں مہرو کے ہاتھ کی بنی کافی نے فراز کا موڈ اور بھی خوشگوار بنا دیا تھا۔

"مہرو تم نے بتایا نہیں کہ ڈیڈی نے سفیر کے رشتے کے بارے میں کیا فیصلہ کیا...؟" فراز کے اچانک سوال پہ مہرو گڑبڑا سی گئی کیونکہ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اُسے زویا کے انکار سے کیسے آگاہ کرے کہ بات بھی بن جائے اور برا بھی نہ لگے۔

"وہ... دراصل.. بات یہ ہے کہ زویا نہیں مان رہی۔" مہرو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"کیوں... وہ کیوں نہیں مان رہی؟" فراز نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"فراز... میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی کیونکہ آج نہیں تو کل بات کھل کر آپکے سامنے آ ہی جائے گی۔" مہرو نے اپنی اُلجھن دور کرتے ہوئے سچ بتانا درست سمجھا۔

"ہاں.. تو بتاؤ ناں کیا بات ہے۔ اتنا سسپنس کیوں کریٹ کر رہی ہو؟" فراز نے کہا۔

"زویا کسی اور کو پسند کرتی ہے اسلئے اُس نے سفیر کے پروپوزل کو ریجیکٹ کر دیا ہے.. اور ڈیڈی کو بھی اُنکے فیصلے پہ کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ زندگی اُس نے گزارنی ہے تو اسلئے اُسکی خوشی اس بات میں ہونی ضروری ہے۔" مہرو نے تفصیلاً بتاتے ہوئے کہا۔

"اوہ.. تو یہ بات ہے... تو پھر وہ کس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟" فراز نے معاملہ فہمی سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"پیر شہباز علی گیلانی کا نام سنا ہے آپ نے...؟" مہرو نے فراز کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... اُسے کون نہیں جانتا... پنجاب کے جانے مانے سیاست دان اور ملتان کے گدی نشین خاندان سے ہیں... اور ہمارے سب سے بڑے سیاسی حریف۔" فراز نے پوری تفصیل بتائی۔

"اُنہی کا چھوٹا بیٹا.. زویا کا کلاس فیلو اور دوست... پیر حیدر علی گیلانی..." مہرو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو ملک فراز کے چہرے پہ ایک رنگ آ کر ایک گزر گیا کیونکہ وہ ایسی بڑی بات کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"پیر شہباز علی گیلانی کا بیٹا... حیدر علی گیلانی..." فراز زیرِ لب بڑبڑایا جیسے اُسے اپنے کانوں پہ یقین نہ آ رہا ہو۔

"ہم سب تو سفیر کے رشتے کے لئے راضی بھی تھے اور خوش بھی... لیکن زویا کی ضد تھی کہ وہ حیدری سے شادی کرے گی ورنہ ڈیڈی کو بھی سفیر کے رشتے پہ کوئی اعتراض نہیں تھا۔" مہرو نے وضاحت کی کیونکہ وہ سمجھ رہی تھی کہ فراز کو سفیر کے رشتے سے انکار پہ دکھ پہنچا ہے۔

"ہمم..." فراز کے پاس جیسے الفاظ نہیں رہے تھے اور اُس کا ذہن اب کہیں اور ہی بھٹک رہا تھا۔

"آپ پلیز بُرا مت مانیے گا... اور چچا جان کو بھی طریقے سے بتا دیجیئے گا۔" مہرو نے فراز کے ہاتھ کی پشت پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے اپنائیت سے کہا۔

"ہاں... ہاں تم فکر مت کرو۔" فراز مہرو کے ہاتھ کے لمس سے اپنے خیالات سے باہر نکلا تو جلدی سے اپنے حواس درست کرتے ہوئے بولا۔

"تھینکس فراز... آپ کتنے اچھے ہیں۔" مہرو نے خوشی اور شرمندگی کے ملے جلے جذبات سے کہا۔

"لیکن ڈیڈی اس رشتے پہ کیسے مان گئے مہرو... وہ لوگ تو سیاست میں ہمارے سب سے بڑے حریف ہیں... پھر کیسے راضی ہو گئے؟" فراز سے پوچھے بنا رہا نہیں گیا۔

"معلوم نہیں زویا کے پاس ایسی کیا گیدڑ سنگھی ہے جسے وہ ڈیڈی کو سنگھاتی ہے اور وہ وہی کرتے ہیں جو زویا چاہتی ہے..." مہرو نے حیرت اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

"اچھا... ٹھیک ہے... میں سونے جا رہا ہوں کل کچھ ضروری کام ہیں۔" ملک فراز نے آرام کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ مہرو وہیں صوفے پہ بیٹھی اُسے یاسیت بھری نگاہوں سے جاتا دیکھتی رہی جیسے فراز کے دل کو ٹھیس پہنچنے پہ خود کو رنجیدہ محسوس کر رہی ہو۔

"وہ لڑکی آخر خود کو سمجھتی کیا ہے؟" ملک سفیر نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا جب ملک فراز نے اُسے زویا کے رشتے پہ انکار سے آگاہ کیا تھا۔

"میں نے تمہیں اسی مسئلے پہ بات کرنے کے لئے فارم ہاؤس بلایا ہے سفیر... کیونکہ بات صرف انکار تک کی نہیں ہے۔" ملک فراز نے فارم ہاؤس کے وسیع و عریض لان پہ نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" سفیر نے اُلجھی ہوئی نظروں سے فراز کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ انکار کے پیچھے جو وجہ ہے اُسے سن کر تم دنگ رہ جاؤ گے..."

"کیوں ایسی کیا بات ہے...؟" سفیر نے پوچھا۔

"زویا کے انکار کی وجہ پیر شہباز علی گیلانی کا بیٹا ہے۔" فراز نے کہا تو سفیر ایک دم چونک کر اُس کی جانب دیکھنے لگا جیسے اُسے یقین نہ آ رہا ہو۔ فراز نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

''اُسکا بڑا بیٹا تو میرا دوست ہے...اور چھوٹے کی کچھ عرصہ پہلے ہی منگنی ہوئی ہے..پھر زویا کا اُس سے کیا تعلق؟'' سفیر اُلجھ سا گیا تھا۔

''چھوٹے کی منگنی ہو چکی ہے..یہ تمہیں کس نے کہا سفیر..؟ فراز کو حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''جی بھائی...مجھے خود پیر شباب علی گیلانی نے بتایا تھا وہ میرا کافی قریبی دوست ہے۔'' سفیر نے اُسے یقین دلانے کے لئے اپنی بات پہ زور دیا۔

''وہ تمہارا دوست کیسے ہو سکتا ہے..؟ جبکہ وہ جانتا ہے کہ ہمارا خاندان اور اُنکا خاندان سیاست میں حریف ہیں ایک دوسرے کے...'' فراز نے حیرت سے پوچھا۔

''اسی لئے تو اُسے دوست بنایا ہے...تا کہ دشمنی میں دوستی سے فائدہ اُٹھایا جا سکے۔'' سفیر کے چہرے پہ مکروہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

''حیدر علی گیلانی...زویا کا کلاس فیلو ہے اور اب بہت جلد اُس سے شادی بھی ہو جائے گی اُسکی۔'' ملک فراز نے کہا۔

''ایسا تو میں ہونے نہیں دونگا بھائی...زویا کو میرا ہونا پڑے گا۔''سفیر نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''سب سے بڑا مسئلہ تو یہ ہے کہ زویا کے ساتھ آنے والی دولت تو ہاتھ سے جائے گی ہی...لیکن سکندر حیات خان کا ہمارے حریفوں کی پارٹی میں شمولیت سے ہماری حیثیت دو کوڑی کی رہ جائے گی...'' ملک فراز نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے غصے سے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں بھائی...میرے جیتے جی تو ایسا نہیں ہوگا کیونکہ میں گیلانی ہاؤس کے بہت سے رازوں سے واقف ہوں۔''

''کیسے راز؟'' فراز نے چونکتے ہوئے کہا۔

''حیدر علی گیلانی کا سب سے بڑا دشمن خود اُسکا بھائی شباب علی گیلانی ہے..اُسکا جانی دشمن اُسکا بھائی...''

''کیا...واقعی..تم سچ کہہ رہے ہو...اُنکی دشمنی کی وجہ کیا ہے؟'' فراز نے پھٹی پھٹی آنکھوں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''پیر شہباز علی گیلانی کی شباب کی طرف سے لاپرواہی...اور حیدر کی طرف جھکاؤ..اور اب حیدر کی اُنکی چچا زاد سے منگنی جسے شباب دل و جان سے چاہتا ہے ایک اور بڑی وجہ بن چکی ہے۔'' سفیر نے بتایا۔

''یعنی یہ سب اختلافات ہمارے حق میں جاتے ہیں...اس طرح ہم آسانی سے زویا کی حیدر سے شادی رُکوا سکتے ہیں۔'' فراز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل...پیر شہباز علی گیلانی کا اپنے بیٹوں کے درمیان غیر منصفانہ رویہ ہی اُنکی بربادی کا باعث بنے گا...وہ بیرونی دشمنوں سے اپنے لاڈلے کو بچاتا پھرتا ہے اور آستین میں جو سانپ پال رکھا ہے اُسکی خبر ہی نہیں اُسے۔'' سفیر نے کہا تو دونوں ایک بلند قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

''شباب کی دوستی سے فائدہ اُٹھا کر ہم حیدر اور زویا کو الگ کریں گے اور پھر اسی طرح ہم شباب اور حیدر دونوں کی باہمی دشمنی سے

اپنے سب سے بڑے دشمن شہباز علی گیلانی کی کمر بھی توڑ دیں گے..." سفیر نے کینہ توز لہجے میں غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے ہوئے کہا۔

"بس پھر تو مسئلہ ہی کوئی نہیں رہا...تمہاری دور تک سوچنے کی عادت مجھے بہت پسند ہے سفیر۔" فراز نے سفیر کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"زدیا میری ضد بن چکی ہے اب...آج تک کسی عورت نے مجھے ناں نہیں کی تو پھر زدیا کیسے کر سکتی ہے..." سفیر نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں تھیں۔

"اُس کی مثال ایک بے لگام منہ زور گھوڑی کی طرح ہے...جسے قابو کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ایسا کرنا آسان ہوتا تو سکندر حیات خان جیسا آدمی ہی کافی تھا۔" فراز نے کہا۔

"جو کام سکندر حیات نہیں کر سکا وہ کام اب میں کروں گا...زدیا کو میرا ہونا پڑے گا ورنہ وہ کسی کی بھی نہیں ہو سکے گی میرے جیتے جی..." سفیر نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"کہیں تمہیں اُس سے محبت تو نہیں ہو گئی...؟" فراز نے اُسکے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں...وہ صرف میری ضد ہے۔اور مجھے ٹھکرا کر اُس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے اور غلطی کا خمیازہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔" سفیر نے غصے سے کہا۔

"غصے اور جذبات کو عقل پہ حاوی نہیں کرتے ورنہ سیدھی چال بھی اُلٹی پڑ جاتی ہے میرے بھائی..." فراز نے سفیر کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ ہلکے سے مسکرا دیا۔

❀......❀

باب نمبر ۷

تبریز کو اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا ہے۔ اُسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا رہا تھا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ روحی کو ایسی حالت میں پائے گا۔ سر پہ لگی چوٹ سے خون بہتا ہوا آنکھوں سے ہوتا ہوا اُسکی گردن کو بھگو رہا تھا۔ سفید چہرہ اور گردن خون سے لال ہو چکے تھے۔ اور بہت سی چوٹوں کے نشان اُسکے حسین چہرے کو داغ دار بنا رہے تھے۔ تبریز اُسے اپنی بانہوں میں سمیٹے زار و قطار آنسو بہا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُسکے چہرے پہ ہاتھ پھیر رہا تھا جیسے یقین کرنا چاہ رہا ہو لیکن کر نہیں پا رہا ہو۔ "روحی... روحی۔ آنکھیں کھولو.. پلیز ایک بار آنکھیں کھول کر مجھے دیکھو..." وہ زور زور سے اُسے ہلا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ دنیا و مافیا سے بے خبر اُسکا وجود تبریز کی بانہوں میں جھول رہا تھا۔ تبریز جلد از جلد اُسے ہسپتال پہنچانا چاہتا تھا لیکن گاڑی میں موجود اُس شخص سے اُسے اچانک ہی نفرت محسوس ہوئی تھی۔ رات کے اندھیرے میں دھند بڑھتی ہی جا رہی تھی اور آس پاس کوئی آدم ذات نظر نہیں آ رہا تھا۔ دور دور تک خاموشی اور دھند کا راج تھا۔ ایسے میں تبریز اپنی زندگی کے مشکل ترین دوراہے پہ کھڑا تھا۔ ایک طرف اُسکی محبت تھی اور دوسری طرف اُسکا رقیب تھا۔ دل اور دماغ میں گھمسان کی جنگ جاری ہو گئی تھی۔ "کیا سوچ رہے ہو... تمہارا رقیب اس وقت تمہارے رحم و کرم پہ بے بس پڑا ہے... اُسے ختم کیوں نہیں کر دیتے؟" سامنے کھڑا اُسکا ہمزاد اُسے پوچھ رہا تھا۔ "نہیں... وہ روحی کا شوہر ہے... میں کیسے اُسے ختم کر دوں؟" تبریز نے کہا۔

"تو پھر تمہاری روحی جو اس وقت تمہاری بانہوں میں ہے پھر سے کھو دو گے اُسے..." ہمزاد نے کہا تو تبریز نے بے بسی سے اپنی بازوؤں میں روحی کے ہوش سے بیگانے وجود کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"میں کیسے کسی کو قتل کر سکتا ہوں... میں ایسا نہیں کروں گا.. میں ان دونوں کی زندگی بچاؤں گا۔" تبریز نے کہا اور جلدی سے رومیسہ کے شوہر کو گاڑی سے نکالنے کے لئے آگے بڑھا۔

"بے وقوف انسان.. قدرت نے تمہیں ایک موقعہ دیا ہے اپنی محبت کو واپس پانے کا.. چھین لو اپنی محبت کو اس دنیا سے.. سب کو مات دے دو.. ان سب کو مات دے دو تبریز جنہوں نے تمہیں روحی سے دور کیا تھا۔" تبریز حیرت سے آنکھیں کھولے اُسکی بات پہ غور کر رہا تھا۔

"جلدی کرو... مار ڈالو اپنے رقیب کو.. اس سے اچھا موقعہ اور کوئی نہیں ملے گا تمہیں... جلدی کرو اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے اور یہ موقعہ تمہارے ہاتھ سے نکل جائے... جلدی کرو تبریز... مار ڈالو اسے اور اپنی رومیسہ کو بچا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُسے اپنا بنا لو۔" تبریز کو لگا واقعی وہ سچ کہہ رہا ہے شاید قدرت نے اُسے اُسکی چاہت سے ملانے کے لئے یہ موقعہ دیا ہے۔ تبریز نے جلدی سے ایمبولینس کو

کال کی اور رومیسہ کی گاڑی کے ڈرائیور والی سیٹ سے اُسکے شوہر کو گاڑی سے کھینچ کر اُسکا سر باہر نکالا۔ وہ بُری طرح زخمی اور خون میں لت پت تھا۔ سانس کی رفتار بھی بے حد مدھم تھی یوں لگ رہا تھا جیسے اُس میں برائے نام ہی جان باقی رہ گئی ہے۔ اُسکے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے تبریز کو اُسکی قسمت پہ ایک بار رشک آیا تھا۔ قریب المرگ یہ شخص کتنا خوش نصیب تھا جو اُسکی روحی کے ساتھ اپنی زندگی جی رہا تھا۔ "اسے کیوں ماروں میں.. یہ تو خود اب شاید مرنے ہی والا ہے۔" تبریز نے سوچا۔ "لیکن اگر یہ زندہ بچ گیا تو روحی ایک بار پھر تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی.. یہ موقعہ ضائع نہیں کرو اور فوراً اسے قتل کر دو۔" وہی آواز پھر سے اُسکے کانوں میں گونجی۔

"نہیں... میں کسی کو قتل نہیں کر سکتا.. میں قاتل نہیں بن سکتا۔" تبریز کے ماتھے پہ ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔ "محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے... دنیا نے ایک بار تم سے روحی کو چھینا تھا۔ اب خدا تمہیں موقعہ دے رہا ہے دنیا سے روحی کو چھین لینے کا... چھین لو اس دنیا سے اپنا حق اپنی محبت... محبت میں لوگ ایک تو کیا کئی قتل کر رہے ہیں تبریز.." ہمزاد اُسکے سامنے کھڑا اُسے سمجھا رہا تھا۔ "ہاں کرتے ہوں گے.. لیکن میں نہیں کر سکتا۔" تبریز نے معصومیت سے کہا۔ "تمہیں کرنا ہوگا ورنہ تم پھر سے روحی کو کھو دو گے.. تم زندگی بھر جدائی کی آگ میں جلو گے اور تمہارا یہ رقیب تمہاری محبت کی چھاؤں میں زندگی بسر کرتا رہے گا... کیا تمہیں منظور ہے؟"

"نہیں.. نہیں... میں ایسا نہیں ہونے دونگا.. روحی صرف میری ہے صرف میری.." تبریز نے کہا اور جلدی سے اپنی گاڑی میں سے ونڈ سکرین صاف کرنے والے ڈسٹر کا کپڑا نکالا اور اُسکے ناک اور منہ پہ رکھ کر اپنی پوری قوت سے دبانے لگا۔ گنتی کے چند سانس جو وہ زخمی لے رہا تھا تبریز نے وہ بھی چھین لئے اور اُسے مردہ حالت میں گاڑی میں واپس دھکیل دیا۔ کچھ ہی دیر میں ایمبولینس کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ تبریز اب مطمئن سا ہو کر ایمبولینس کا انتظار کرنے لگا۔

☆......☆......☆

"دونوں میاں بیوی کا تعلق لاہور سے ہے۔ انکی گاڑی سے ملنے والے سامان سے جو انفارمیشن اکٹھی ہوئی ہے اُسکے ذریعے اُنکے گھر والوں کو اطلاع کر دی گئی ہے۔ آدمی کی ڈیتھ ہسپتال پہنچنے سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔" ہسپتال کے ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے سینئر سرجن کو بتاتے ہوئے کہا۔

"ایکسیڈنٹ ہوا کیسے تھا؟" سینئر سرجن نے ڈاکٹر سجاد سے پوچھا۔

"دھند کی وجہ سے.... تیز رفتار ٹرک نے پیچھے سے انکی گاڑی کو ہٹ کیا تھا جسکی وجہ سے گاڑی اُلٹ گئی اور دونوں بری طرح زخمی ہو گئے۔ ہسپتال دیر سے پہنچے جسکی وجہ سے ایک کی خون ضائع ہونے کی وجہ سے موت واقع ہو گئی۔" ڈاکٹر سجاد نے بتایا۔

"لڑکی کی حالت اب کیسی ہے؟" سینئر سرجن نے پوچھا۔

"وہ اب خطرے سے باہر ہے.. لیکن ابھی ہوش نہیں آیا۔" ڈاکٹر سجاد نے کہا۔

"ہر سال دھند کی وجہ سے سینکڑوں ایکسیڈنٹ ہوتے ہیں اور بہت سے لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔" سینئر سرجن نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"بالکل ایسا ہی ہے..." ڈاکٹر سجاد نے بھی افسوس سے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے میں چلتا ہوں... میرا آج ایک آپریشن بھی ہے.. تم نے رپورٹ تیار کر لی ہے؟"

"جی سر... میں نے پولیس کو میڈیکل رپورٹ تیار کر کے دے دی ہے جس میں موت کی وجہ اور دوسری اہم معلومات درج ہیں۔" ڈاکٹر سجاد نے کہا۔

"او۔ کے... گڈ جاب۔" سینئر سرجن نے کہا اور چلا گیا۔ ڈاکٹر سجاد اپنے معمول کے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆......☆......☆

اشعر کی ڈیڈ باڈی گھر پہنچتے ہی کہرام مچ گیا۔ اشعر کی ماں کو غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ جوان بیٹے کی موت پہ باپ کو تو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ وہ ہراساں نظروں سے اپنی بیوی اور بیٹی کو اشعر کے مردہ جسم پہ ماتم کرتا دیکھ رہے تھے۔ ایسی جوان موت پہ ہر آنکھ اشک بار تھی اور پورے گھر میں سوگ کا عالم چھایا ہوا تھا۔

"کوئی سوچ سکتا ہے بھلا جوان بیٹا ہنی مون پہ گیا تھا اور واپس اسکی لاش آئی ہے۔" ایک عورت نے دوسری کو افسوس سے کہا تھا۔

"ہائے ری قسمت... اور بہو کا کیا ہوا... میت کی بیوہ کہاں ہے..؟" دوسری نے پہلی سے پوچھا۔

"میں نے تو یہی سنا ہے کہ وہ زخمی حالت میں ہسپتال میں بے ہوش پڑی ہے۔"

"اوہ... بے چاری اپنے شوہر کا آخری دیدار بھی نہیں کر سکے گی... ہائے اللہ.." دوسری خاتون نے افسوس سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

اشعر کی بہن شہلا اپنے بھائی کے لاشے سے چمٹی زار و قطار رو رہی تھی اور ماں جب بھی ہوش میں آتی تھی اشعر کو زور زور سے پکارنے لگتی تھی۔ کچھ دیر بعد چند رشتے دار جنازے کو لے جانے کے لئے آگے بڑھے تو شہلا اُن سب سے جھگڑنے لگی۔ "چھوڑ دو... میرے بھائی کو مت لے جاؤ... وہ آج ہی گھر آیا ہے..." شہلا رو رو کر التجا کر رہی تھی۔

"میرے بیٹے کو مت لے جاؤ۔ ابھی تو میں نے اسکے بچے کھلانے تھے... ارے ابھی تو اسکے سر پہ سہرا سجایا تھا میں نے... ہائے میرا بچہ..." اشعر کی ماں بین کر رہی تھی۔ سننے اور دیکھنے والوں کے دل غم سے پھٹے جا رہے تھے۔ "بس کرو اشعر کی ماں... ہمارے نصیب میں نہیں تھیں ایسی خوشیاں... ہم بڑے بدقسمت ہیں۔" اشعر کے باپ نے بیوی کو کہا۔

"ہائے میرا جوان بیٹا... کتنے نازوں سے پالا تھا میں نے... کتنے چاؤ سے اسکی شادی کی تھی... ہائے میرا اشعر... کاش میں مر جاتی اسے کچھ نہ ہوتا... اسکے حصے کی موت مجھے کیوں نہ آگئی..." اشعر کی ماں کا برا حال تھا وہ روئے جاتی تھی اور بین کئے جاتی تھی۔ رشتے دار جنازہ لے کر چلے تو اشعر کی ماں کو ایک بار پھر غشی کا دورہ پڑا اور وہ بے سدھ ہو کر گر گئیں۔

☆......☆......☆

"بابا... اشعر کہاں ہے؟" رومیسہ کو جیسے ہی ہوش آیا کچھ دیر خود کو زندہ محسوس کرتے ہوئے اُس نے فوراً سامنے کھڑے اپنے باپ سے اشعر کے بارے میں پوچھا۔

"بیٹا تم کیسی ہو... خود کو کیسا محسوس کر رہی ہو؟" انہوں نے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے پوچھا۔ روحی کی ماں جو اُس پہ جھکی ہوئی اُسکا چہرہ دیکھ رہیں تھیں اچانک ہی پیچھے ہٹ کر منہ پھیر لیا تھا۔

"امی... آپ نے منہ کیوں پھیر لیا... بتائیں ناں اشعر کہاں ہے؟" رومیسہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"بیٹا اشعر بھی آجائے گا... تم پریشان نہ ہوا اور اپنے ذہن پہ اتنا بوجھ نہ ڈالو" روحی کی والدہ جو اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں اُسکی طرف پلٹتے ہوئے کہا۔

"ابو اشعر کہاں ہے... وہ یہاں کیوں نہیں ہے میرے پاس..؟" روحی کی بے چینی کسی طرح کم نہیں ہو رہی تھی۔ "وہ ٹھیک تو ہے ناں...؟" روحی سوالیہ نظروں سے جواب کی منتظر تھی لیکن دونوں میں سے کوئی بھی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

"آپ لوگ مجھے کیوں نہیں بتا رہے کچھ... مجھے اشعر کے پاس جانا ہے۔" روحی نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن سر میں درد کی ٹیس نے اُسے واپس اپنی جگہ پر لیٹنے پہ مجبور کر دیا۔

"روحی میری بچی... تم اس طرح نہ اٹھو ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں... تم ٹھیک ہو جاؤ تو ہم اشعر سے ملنے چلیں گے۔" روحی کی امی نے اُسے اُسکی جگہ پہ لیٹاتے ہوئے کہا۔

"وہ ٹھیک تو ہے ناں؟ کیا وہ گھر پہ ہے؟" روحی نے پھر سوال کیا۔

"ہاں.. وہ اب پہلے سے بہتر ہے اور گھر پہ ہے۔" روحی کے والد نے مصلحتاً جھوٹ بولا تو روحی کی ماں دکھ اور افسوس بھری نظروں سے اُسے دیکھنے لگیں۔ وہ مجبور تھے ایسی حالت میں اُسے اتنی بُری خبر نہیں سنا سکتے تھے۔

"انکل.. آنٹی.. اور شہلا بھی مجھے ملنے نہیں آئے.. اور اشعر بھی مجھے چھوڑ کر گھر چلے گئے..؟" روحی نے حیرت سے کہا۔

"بیٹا تم ہوش میں نہیں تھی وہ سب تمہیں دیکھ کر چلے گئے تھے کیونکہ اشعر کو ابھی آرام کی ضرورت ہے ناں..." امی نے روحی کے سر پہ محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سمجھایا۔ روحی حیران نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا تو اچانک ہی سائیڈ ٹیبل پہ پڑے اُسکے ابو کے موبائل فون پہ اُسکی نظر پڑ گئی۔

"ابو... آپ اشعر کو فون کریں اُسے بتائیں کہ میں ہوش میں ہوں.. میری بات کروائیں اُس سے.." روحی نے بے تابی سے اپنے ابو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ روحی کی بے چینی پہ پشیمان سے ہو گئے۔

"ابھی رات بہت ہو گئی ہے بیٹا.. صبح میں اُنکو بتا دوں گا تو وہ سب تمہیں ملنے آجائیں گے۔" روحی کے ابو نے بہانہ بنایا۔

"نہیں ابو.. آپ ابھی فون کریں مجھے اشعر سے بات کرنی ہے.. مجھے آواز سننی ہے اُنکی۔" روحی نے ضد کی تھی۔ اُسکی بے چینی

کسی طرح کم ہو کے نہیں دے رہی تھی۔ اور دوسری طرف اُسکے ماں باپ کی مجبوری اور بے بسی کہ وہ اشعر سے اُسکی بات کیسے کروائیں۔ وہ بے چارہ تو منوں مٹی تلے جا سویا ہے اُسے کیسے بتائیں۔

"آپ فون ملائیں... میں بات کرونگی۔" روی نے پھر سے کہا۔

"اچھا میں اپنے فون میں بیلنس لوڈ کروا کر آتا ہوں پھر تم اشعر سے لمبی بات کرنا۔" روی کے ابو نے جھوٹا بہانہ کیا اور کمرے سے باہر نکل آئے۔ باہر آ کر وہ بینچ پہ بیٹھ کر رونے لگے۔ روی اُنکی اکلوتی اور بے حد نازوں پلی اولاد تھی اور اُس پہ جو غم کا پہاڑ ٹوٹا تھا وہ اُسے کیسے اُس سے آگاہ کریں اُنکی سمجھ سے باہر تھا۔ وہ روی کے ڈاکٹرز سے ملے اور اُنکو سارے حالات سے آگاہ کیا تا کہ وہ روی کو نیند کا انجکشن دے کر سلا دیں کیونکہ وہ ابھی اتنا بڑا صدمہ سہنے کی حالت میں نہیں تھی۔ روی کے ابو جب ڈاکٹرز اور نرس کے ہمراہ کمرے میں داخل ہوئے تو روی کی امی اُسے سوپ پلانے میں کامیاب ہو چکی تھیں۔

"ابو آپ آ گئے... اب میری فون پہ بات کروائیں۔" روی نے اُنہیں دیکھتے ہی بے تابی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا... پہلے ڈاکٹر صاحب آپکا چیک اپ کر لیں پھر کرواتا ہوں۔" روی کے ابو نے کہا۔

"اب کیسا فیل کر رہی ہیں آپ...؟" ڈاکٹر نے روی کی آنکھوں کو چیک کرتے ہوئے پوچھا۔ دوسری طرف پاس کھڑی نرس اُسکا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی۔ اُسکے بعد نرس نے فوراً دو انجکشن روی کو لگائے جس سے وہ نیند کی وادیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔

☆......☆......☆

"تبریز میرے بچے... کیسا ہے تُو؟" بہت دنوں بعد تبریز نے ماں کو فون کیا تو اُنہوں نے بھیگی آنکھوں اور رندھی آواز میں پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں ماں... آپ کیسی ہیں؟" تبریز نے کہا۔

"تیری آواز سن لی... اب ٹھیک ہوں۔" بلقیس بیگم نے کہا۔

"گھر میں سب کیسے ہیں؟" تبریز نے ماں سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں بیٹا... تم کب آؤ گے تبریز کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں اسلام آباد گئے ہوئے..." بلقیس بیگم نے اُداس لہجے میں بیٹے سے کہا۔

"میں گھر آنا چاہتا ہوں لیکن بابا... اُنہیں اچھا نہیں لگے گا مجھے دیکھ کر..." تبریز نے کہا۔

"کیوں نہیں اچھا لگے گا... اتنا بدگمان نہ ہو بیٹا... وہ تیرے باپ ہیں۔"

"اسلئے اُنکو افسوس ہے کہ میں اُنکا بیٹا ہوں..." تبریز نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں میرے بچے... ایسا نہ سوچ۔ تمہارے بابا بہت اُداس رہتے ہیں جب سے تم گئے ہو... میں خود اُنکو تیری تصویر سے باتیں کرتے دیکھا ہے... وہ جیسے بھی ہیں تمہارے باپ ہیں اور ماں باپ کے لئے سب اولاد ایک سی ہوتی ہے بیٹا..." بلقیس بیگم کے لہجے میں دکھ اور ملال جھلک رہا تھا۔

"اگر وہ میری خوشی کا خیال کر لیتے اور مجھے روی سے شادی کرنے دیتے تو آج نہ وہ دُکھی ہوتے اور نہ میں بدگمان ہوتا..."
تبریز نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"وہ منہ سے کچھ نہیں کہتے لیکن میں نے اُنکی آنکھوں میں ملال دیکھا ہے تبریز...وہ اپنی غلطی پہ نادم ہیں۔تم اُنکو معاف کر کے سب بھلا دو بیٹا..روی تمہارے نصیب میں ہوتی تو ایسا کچھ نہ ہوتا..سب کچھ ہمارے ہاتھ میں تو نہیں ہوتا ناں بیٹا تقدیر کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔" بلقیس بیگم نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"سب کچھ بھلا سکتا ہوں ماں...سب کچھ معاف کر سکتا ہوں لیکن روی کے سوا کسی اور کو اپنی زندگی کا ساتھی نہیں بنا سکتا۔"
تبریز نے اٹل لہجے میں کہا۔

"کیوں نہیں بنا سکتے...آخر وہ بھی تو اپنا گھر بسا چکی ہے تو پھر تم کس آس پہ ایسا کر رہے ہو؟" بلقیس بیگم نے اُکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں اس بارے میں کوئی بحث نہیں کرنا چاہتا...میرا فیصلہ کل بھی وہی تھا آج بھی وہی ہے۔" تبریز نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"تو کیا ساری زندگی تنہا گزارو گے...؟" بلقیس بیگم نے پوچھا۔

"نہیں...روی ہی میری زندگی میں آئے گی۔" تبریز نے کہا۔

"وہ اب کسی اور کی بیوی ہے تبریز..." بلقیس بیگم نے اُسے یاد دلایا۔

"بیوی تھی...اب بیوہ ہے۔" تبریز نے کہا۔

"کیا...؟؟؟ بیوہ...کب...کیسے ہوا یہ سب...تمہیں کس نے بتایا؟" بلقیس بیگم نے حیرت اور دُکھ کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا۔

"دو ہفتے قبل ہائی وے پہ ایک ایکسیڈنٹ میں اُسکے شوہر کا انتقال ہو گیا..." تبریز نے بتایا۔

"اوہ میرے خدایا...بیچاری بچی بھری جوانی میں بیوہ ہو گئی..." بلقیس بیگم نے افسوس سے کہا۔

"وہ خود بھی کافی زخمی ہوئی تھی...ابھی چند دن پہلے ہی ہسپتال سے گھر آئی ہے۔" تبریز نے کہا۔

"تم کب ملے اُس سے...کیسے معلوم ہوا تم کو یہ سب جبکہ تم اسلام آباد میں ہو...؟" بلقیس بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

"اسلام آباد کے قریب ہی ایکسیڈنٹ ہوا تھا اُسکا...اخبار میں خبر لگی تھی تو مجھے پتہ چلا اور میں اُسے دیکھنے ہسپتال گیا تھا وہاں اُسکے ابو سے میری ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ روی کے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے۔" تبریز نے تفصیل بتائی۔

"تو اب تم اُس سے شادی کرو گے..یہ چاہتے ہو تم..؟" بلقیس بیگم نے تصدیق چاہی۔

"وہ میری پہلی اور آخری آرزو ہے ماں...اُسکے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا ہے تو میں اُسے کیسے تنہا چھوڑ دوں..؟" تبریز نے دُکھی لہجے میں کہا۔

"ابھی تو وہ عدت میں ہے۔۔عدت ختم ہو جائے تو میں تیرے بابا کے ساتھ جاؤں گی اُس سے ملنے۔" بلقیس بیگم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ماں آپ کے سوا مجھے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔۔" تبریز نے خوشی سے کہا۔

"تیری ماں جو ہوں۔۔۔اپنے پیٹ سے جنے کو میں نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا؟" بلقیس بیگم نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا امی میں آپ سے پھر بات کرونگا ابھی مجھے ایک کلائنٹ کے ساتھ سائیٹ پہ جانا ہے۔۔"

"اچھا بیٹا۔۔خوش رہا کرو۔۔خدا حافظ۔"

"جی امی۔۔اپنا خیال رکھیئے گا۔۔خدا حافظ۔" تبریز نے کہا اور فون بند کر دیا۔ بلقیس بیگم کافی دیر تک بیٹھی سوچتی رہیں اور دل ہی دل میں رومیسہ کے لئے افسوس کرتی رہیں۔۔ماں کا دل اپنی اولاد کے لئے بے حد نرم اور حساس ہوتا ہے اسلئے وہ تبریز کی خوشی کی خاطر اب کچھ بھی کرنے کو تیار تھیں۔ اُنہوں نے سوچ لیا تھا کہ آج وہ تبریز کے بابا سے ضرور بات کریں گی۔

☆.....☆.....☆

"روی بیٹا کب تک بھوکی پیاسی رہو گی۔۔۔کچھ تو کھا لو میری جان۔۔" روی کی امی نے اُسے دکھ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا لیکن وہ کچھ نہیں بولی۔ روی کا وجود ایک زندہ لاش کی مانند نظر آتا تھا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے اور زردی مائل رنگت نے اُسکے وجود سے زندگی کی رمق کو ختم کر دیا تھا۔ وہ جہاں بیٹھتی تھی گھنٹوں بیٹھی سوچتی رہتی تھی اور اُسکی خالی خالی نظریں کسی غیر مرئی نقطے پہ جمی رہتی تھیں۔ ویران آنکھوں سے جھانکتی اُداسی اور کرب اُسکے والدین کو مزید دُکھ اور تکلیف میں مبتلا کیے دیتا تھا۔ اُنکی اکلوتی نازوں پلی بیٹی پہ بیوگی کی چادر تن گئی تھی۔ وہ تو اُسکا گھر آباد کر کے اپنے فرض سے ابھی سبکدوش ہوئے ہی تھے اور اُسکی زندگی میں آنے والی خوشیوں کے منتظر تھے لیکن اچانک ایسا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑے گا کسی نے نہیں سوچا تھا۔ روی کا دُکھ تو بس وہی جانتی تھی۔ اکثر راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر اشعر کو آوازیں دیا کرتی تھی۔ تنہائی میں پاگلوں کی طرح اشعر سے باتیں کیا کرتی اور کبھی کبھی خواب میں ڈر کر اُٹھ جایا کرتی تھی۔ پورے گھر میں اُسکا زندگی سے عاری وجود کسی بھٹکی ہوئی روح کی طرح اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا تھا۔ روی کے ماں باپ اپنی لاڈلی کے دُکھ میں خود کو بے بس محسوس کرتے تھے وہ چاہ کر بھی اُسکے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ تقدیر نے جو ستم اُس پہ ڈھایا تھا وہ اُس کا دُکھ کسی طرح بھی ختم نہیں کر سکتے تھے۔ وہ بہت کوشش کر رہے تھے کہ روی کا دھیان بٹائے رکھیں لیکن اُسکا دُکھ اتنا بڑا تھا کہ وقت کا مرہم ہی اُسے مندمل کر سکتا تھا۔ رومیسہ کو نہ کھانے پینے کی ہوش ہوتی تھی اور نہ پہننے اوڑھنے کی۔۔۔بس یونہی اِدھر اُدھر پڑی سوچوں میں خود کو غرق کیے رکھتی تھی۔ اکثر سوچوں میں ڈوبی کبھی مسکرانے لگتی تھی اور کبھی آنسو اُسکی آنکھوں سے ٹپک کر اُسکے حسین گالوں کو بھگو رہے ہوتے تھے۔

"روی کے ابو۔۔۔آپ ہی کچھ سمجھائیں اسے کہ کچھ کھا لے یا کچھ پی ہی لے۔۔۔" روی کی والدہ نے بے بسی سے اپنے شوہر کو

مخاطب کرتے ہوئے کہا جب وہ آفس سے گھر پہنچے۔

"کیا ہوا.. میری شہزادی کو..." رومی کے والد نے کھتے ہوئے دل کو سنبھال کر رومی کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ابو... کیا میں واقعی منحوس ہوں؟" رومی نے اچانک ہی سوال کیا جس پہ اُسکے امی ابو چونک گئے۔

"نہیں میری جان... ایسا کیوں کہہ رہی ہو؟" ابو نے پیار سے اُسکے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اشعر کی امی نے کیوں کہا کہ اس منحوس کو لے جاؤ... میرے بیٹے کو کھا گئی... بتائیں ناں ابو... کیا اشعر کی موت میری وجہ سے ہوئی؟" رومی نے خالی خالی نظروں اور درد بھرے لہجے میں پوچھا۔

"بیٹا وہ بھی دکھی ہیں اسلئے ایسا بول دیا ہوگا... ورنہ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے... ہم سب کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے اور ہم اُسی پل اس دنیا میں آتے بھی ہیں اور جائیں گے بھی۔" رومی کے ابو نے اُسے سمجھایا۔

"ابو پھر اُنہوں نے مجھے اشعر کے گھر میں رہنے کیوں نہیں دیا... اشعر کے کمرے سے مجھے کیوں نکال دیا اُنہوں نے... مجھے کیوں دور کر دیا اشعر کی چیزوں سے؟" رومی کا لہجہ معصومانہ اور درد بھرا تھا۔

"میری جان... اب تمہیں یہ حقیقت قبول کرنا ہوگی کہ اشعر اب اس دنیا میں نہیں رہا اور اس کے گھر سے بھی اب تمہارا کوئی تعلق نہیں رہا بیٹا۔" رومی کے ابو نے اُسے اپنے سینے سے چپٹا کر رندھی ہوئی آواز میں کہا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ رومی کی والدہ جو پاس بیٹھی تھیں وہ بھی رونے لگیں۔

"تمہیں بہت صبر کرنا ہوگا میری بچی... شاید نصیب میں یہی لکھا تھا۔" رومی کے ابو اُسے خود سے چپٹا کر سمجھانے لگے۔

"ابو میں کیا کروں... مجھے ہر جگہ اشعر ہی نظر آتا ہے... مجھے لگتا ہے وہ ہر پل میرے آس پاس موجود ہے.. اُسکی باتیں میرے کانوں میں گونجتی ہیں... اُسکی آواز مجھے سوتے میں بھی سنائی دیتی ہے..." رومی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔

"صبر کرو میری بیٹی... وقت سب سے بڑا مرہم ہے ہر زخم کو بھر دیتا ہے اور خدا کسی پہ اُسکی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا..."

"مجھ سے برداشت نہیں ہوتا ابو... میرا دل چاہتا ہے میں بھی جا کر کسی قبر میں لیٹ جاؤں... اشعر کی امی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجتے ہیں... مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ مجھے منحوس بھی کہہ سکتی ہیں.. وہ تو بہت پیار کرتی تھیں مجھ سے اور اشعر سے... وہ مجھے کیسے گھر سے نکال سکتی ہیں..." رومی روئے جا رہی تھی اور کہے جا رہی تھی۔

"ایسا نہیں سوچتے بیٹا.. صبر کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں.. نا تو تمہارے آنسو اُسے واپس لا سکتے ہیں اور نہ ہی کسی کے کہنے سے تم منحوس ثابت ہوتی ہو۔" ابو نے اُسکے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے بھی اشعر کے ساتھ مر جانا چاہیے تھا.... خدا مجھے بھی موت دے دیتا تو آج میں ایسی اذیت بھری زندگی نہ گزار رہی ہوتی۔" رومی نے تلخی سے کہا۔

"کتنی خودغرض ہوگئی ہو روحی.. صرف اپنے بارے میں سوچ رہی ہو.. یہ نہیں سوچ رہی کہ تم ہماری اکلوتی اولاد ہو.... ہماری تو کل کائنات تمہارے وجود میں سمائی ہے.. تمہیں کچھ ہو جاتا تو ہم کیسے جی پاتے... ہم تو جیتے جی مر جاتے..." روحی کی والدہ نے رندھی ہوئی آواز میں بھیگی آنکھوں سے کہا تو روحی انکو بے بسی سے دیکھتے ہوئے اُنکے گلے جا لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆......☆......☆

ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہر طرف قد آور درخت اور خار دار جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں۔ کئی بار اُسکا آنچل ان خاردار جھاڑیوں میں پھنسا تھا اور اُسے چھڑاتے ہوئے اُسکی انگلیاں بھی زخمی ہوئیں تھیں۔ وہ مسلسل اُس روشنی کا پیچھا کر رہی تھی جو اُسے بہت دور سے دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ قدم بڑھا رہی تھی اُسکی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ وہ اُس روشنی کے قریب پہنچتی جا رہی تھی۔ اب وہ روشنی اُس سے چند فرلانگ ہی دور رہ گئی تھی۔ روحی کا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ روحی نے دیکھا کہ روشنی جہاں سے آ رہی ہے وہاں بے حد حسین منظر ہے۔ ہر طرف سرسبز گھاس تاحدِ نگاہ نظر آ رہی تھی اور ہر طرف گلاب کے پھول جا بجا کھلے ہوئے تھے۔ وہ ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے آگے بڑھتی گئی اور نرم گھاس اُسکے پیروں کو حرارت دینے لگی۔ چلتے چلتے وہ کافی دور نکل آئی تھی۔ ہوا میں نرمی اور تازگی کا احساس روحی کے وجود کو مہکانے لگا تو وہ آنکھیں موند کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ پھولوں کی خوشبو اُسے بھلی لگ رہی تھی اور اُسکے دل و دماغ کو تازگی بخش رہی تھی۔ روحی آنکھیں موندے لمبے سانس لے رہی تھی کہ اچانک اُسے پیچھے سے کسی نے پکارا تو وہ چونک کر پلٹی۔ اُسکے پیچھے کھڑا اشعر اُسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ سفید لباس میں ملبوس اشعر بہت وجیہ اور جاذبِ نظر دکھائی دے رہا تھا۔ روحی بھی اُسے دیکھ کر مسکرا دی۔ اشعر نے اپنے بازو اُسکے لئے پھیلا دیے اور روحی دوڑتی ہوئی اُسکے سینے سے جا لگی۔ ہوا کے زوردار جھونکے سے جو کمرے کی کھلی کھڑکی سے آیا تھا سائیڈ ٹیبل پہ پڑے فوٹو فریم جس میں روحی کی تصویر لگی تھی فرش پہ گر گئی۔ اچانک شور سے روحی کی آنکھ کھلی اور وہ ہڑبڑا کر اُٹھ گئی۔ "اوہ... تو یہ بھی خواب تھا۔" روحی نے سوچا۔

روحی کی تصویر والا شیشے کا فوٹو فریم ٹوٹ کر فرش پہ بکھرا پڑا تھا۔ اُس نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو وہ کھلی ہوئی تھی۔ روحی بیڈ سے اُتر کر کھڑکی میں جا کر کھڑی ہوگئی اور آسمان پہ چمکتے تارے دیکھنے لگی۔ رات گہری سیاہ تھی اور ستارے اپنی پوری آب و تاب سے جگمگا رہے تھے۔ روحی کی سماعتوں میں اشعر کے الفاظ گونجنے لگے "روحی.... مجھے ستاروں بھری رات چاندنی رات سے بھی زیادہ پسند ہے..." ٹیرس پہ کھڑے اشعر نے کافی کا سپ لیتے ہوئے روحی سے کہا۔ "ساری دنیا تو چاندنی رات کی دیوانی ہے اور آپ سیاہ رات کے شوقین ہیں..." روحی نے مسکراتے ہوئے اشعر کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہاں.. ہوگی ساری دنیا چاندنی رات کی دیوانی میں نہیں ہوں.." اشعر نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ "آپ کیوں نہیں ہیں...؟" روحی نے اشعر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کیونکہ چاند تو میرے ساتھ ہے..." اشعر نے شرارت بھرے انداز میں روحی کو دیکھتے ہوئے کہا تو وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ "باتیں بنانا کوئی آپ سے سیکھے..." روحی نے کہا۔ "جب سے تم ملی ہو میں ایسی باتیں کرنے لگا ہوں.. ورنہ پہلے مجھے یہ چاند ستاروں کی باتیں بہت بکواس لگتی تھیں۔" اشعر نے اُسے پیچھے

سے اپنی باہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔"اچھا...اسکا مطلب آپ میرے پیار میں شاعر ہو گئے ہیں.." رومی نے شرارتی لہجے میں اُسکا مذاق بنایا۔"پتہ ہے رومی.. تمہارے ساتھ گزارے یہ چند مہینے میرے زندگی کے تمام ماہ و سال پہ بھاری ہیں...مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں نے اپنی زندگی جی لی ہے۔"اشعر نے کہا تو رومی نے چونک کر اُسے دیکھا۔"سچ کہہ رہا ہوں..."رومی کی نظروں میں حیرت دیکھتے ہوئے اشعر نے اُسے یقین دلانے کے لئے کہا۔"جی نہیں...ابھی تو پوری زندگی پڑی ہے جینے کے لئے۔" رومی نے اُسکی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔"ہاں۔ابھی تو ہمارے بچے ہونگے...پھر ہم نے ساتھ بوڑھے ہونا ہے..."اشعر اُسے کندھوں سے تھامے جھولتے ہوئے کہنے لگا۔"بچے...کتنے بچے..؟" رومی نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔"اہم..صرف دو بچے..ایک بیٹا...ایک بیٹی...ایک تمہارے جیسا..ایک میرے جیسا..." اشعر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔"وہ کیوں..؟"رومی نے معصومیت سے پوچھا۔"وہ اسلئے کہ جب ہم بوڑھے ہو جائیں تو انھیں دیکھ کر ہمیں اپنی جوانی یاد آجائے..."اشعر نے کہا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس دیے۔

رومیسہ ان سب لمحات کو یاد کر رہی تھی جو اُس نے اشعر کے ساتھ گزارے تھے۔اچانک مسکراتے مسکراتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔وہ وہیں فرش پہ دیوار سے ٹیک لگا کر گھٹنے سمیٹ کر بیٹھ گئی۔آنسو اُسکی آنکھوں سے زاروقطار بہنے لگے۔ابھی وہ یہ سب باتیں یاد کر کے رو ہی رہی تھی کہ اچانک اُسکے کان میں آذان کی آواز پڑی۔رومیسہ نے گھڑی پہ وقت دیکھا تو تہجد کی نماز کا وقت ہو رہا تھا۔وہ آنسو صاف کرتی واش روم میں آگئی۔آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر اُسے مزید رونا آنے لگا۔اشعر کی یادیں اُسکی باتیں اُسے پاگل کئے دے رہی تھیں۔اُسکی موت کو قبول کرنا جتنا مشکل تھا اُس سے کہیں زیادہ مشکل اُسکے بغیر جینے کا تصور کرنا تھا۔کچھ دیر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے وہ وضو کرنے لگی۔وضو کر کے اُس نے تہجد کے دو نفل ادا کئے اور جائے نماز پہ بیٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ جیسے ہی دعا کے لئے پھیلائے تو آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔اُسکی جھیل سی گہری اور بڑی بڑی آنکھوں کے پیالوں سے پانی ندیوں کی طرح بہنے لگا اور ایک ہی دعا اُسکے ہونٹوں پہ آئی تھی۔"اے میرے مشکل کشا...اے میرے چارہ گر...مجھے میرے اشعر سے ملا دے...آمین۔" رومی نے دعا مانگی اور وہیں جائے نماز پہ سجدے میں گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆......☆......☆

خدا نے انسان کو بے پناہ ہمت اور حوصلہ عطا کیا ہے۔زندگی میں آنے والے بڑے سے بڑے دُکھ اور مصائب کا مقابلہ کرنے کی قوت عطا کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ وقت کو سب سے بڑا مرہم بھی بنا دیا ہے جو گہرے سے گہرے زخم کو بھرنے میں اپنا کردار بھرپور ادا کرتا ہے۔رومیسہ کی عدت اب پوری ہو چکی تھی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس نے خود کو کافی حد تک سنبھال بھی لیا تھا لیکن جو ملال ہر پل اُسکے دل کو کچوکے لگاتا رہتا تھا اُس سے نجات پانا اُسکے بس میں نہیں تھا۔اب وہ اپنے ماں باپ کو مزید ذہنی اذیت سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی اسلئے اُس نے اشعر کی جدائی کے غم کو اپنے دل میں سمو لیا تھا۔اب وہ پہلے کی طرح مسکراتی نہیں تھی لیکن ہر وقت آنسو بہانا بھی چھوڑ دیا تھا۔اپنے حالات سے اُس نے اب سمجھوتا کر لیا تھا اور اشعر کی موت کو اپنا نصیب سمجھ کر قبول بھی کر لیا تھا۔رومی کی آنکھوں

میں اب پہلے جیسی چمک باقی نہیں رہی تھی۔ اُس کے دُکھ کی گہرائی کو تو بس وہی جانتی تھی لیکن اپنے ماں باپ کی خاطر وہ خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتی تھی تاکہ اسکی وجہ سے وہ دُکھی نہ ہوں۔ روی اپنے کمرے میں بیٹھی سوچوں میں گم تھی کہ دروازے پہ دستک ہوئی۔

"کون ہے... آجاؤ۔" روی نے چونکتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔

"بی بی جی... آپ سے ملنے کوئی آیا ہے۔" ملازمہ نے آکر اطلاع دی۔

"مجھ سے....؟ کون ملنے آیا ہے؟" روی کو شدید حیرت ہوئی کیونکہ اشعر کی وفات کے بعد سے اُس نے ساری دنیا سے قطع تعلق کر لیا تھا نہ وہ کہیں جاتی تھی اور نہ کسی سے ملتی تھی بس ہر وقت گھر میں ہی رہتی تھی۔

"معلوم نہیں جی... ایک عورت ہے کہہ رہی ہیں رومیصہ سے ملنا ہے تو میں نے اُنکو ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔" ملازمہ نے تفصیل بتائی۔

"تم نے امی کو بتایا ہے؟" روی نے پوچھا۔

"جی میں نے بیگم صاحبہ کو بتا دیا تھا۔ اب وہ اُنکے ساتھ بیٹھی ہیں اور آپکو بلانے کو بولا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے... تم جاؤ میں آتی ہوں۔" روی نے کہا تو ملازمہ چلی گئی۔ روی کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی کہ آخرا تنے مہینوں بعد کون آ گیا ہے اُس سے ملنے لیکن اُسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ پھر اُسکے ذہن میں اشعر کی ماں کا خیال آیا کہ شاید وہ اُس سے ملنے آئی ہوں۔ یہ خیال ذہن میں آتے ہی روی فوراً اپنا دوپٹہ درست کرتے ہوئے کمرے سے نکل کر ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ ابھی وہ دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ اُسکی نظر سامنے رکھے صوفے پہ بیٹھی ہوئی اُس عورت پہ پڑی جو امی سے باتیں کر رہی تھیں۔ روی کو اُسکا چہرہ بہت اجنبی سا لگا تھا۔ جب سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا روی جن لوگوں سے بھی ملی تھی اُنکو پہچاننے میں اُسے کافی وقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ روی نے ذہن پہ زور دیا لیکن اُسے کچھ یاد نہیں آیا کہ وہ اس عورت کو جانتی ہے یا نہیں۔ وہ سوچوں کو جھٹکتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو روی کی امی نے اُسے آتا دیکھ کر کہا "آؤ روی بیٹا۔" روی نے سلام کیا اور آ کر بیٹھ گئی۔ "بیٹا تبریز کی امی تم سے ملنے آئی ہیں... تم ان سے باتیں کرو... میں چائے بھجواتی ہوں۔" روی کی امی نے کہا لیکن اُنکے الفاظ روی کے کانوں میں پڑتے ہی اُسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ "اوہ... تبریز... میں تو اُسے بالکل بھول ہی گئی تھی... تبھی میں اُسکی ماں کو پہچان نہیں پائی۔" روی نے سوچا۔

"کیسی ہو روی بیٹا؟" بلقیس بیگم نے بہت پیار سے پوچھا۔

"جی ٹھیک ہوں..." روی نے حیرت سے اُنہیں دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارے شوہر کی وفات کا پتہ چلا.... بے حد افسوس ہوا... اللہ اُسے اپنی رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔" بلقیس بیگم نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

"آمین..." بلقیس بیگم نے اشعر کا ذکر کیا تو روی کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔

"بیٹا ہم تم سے بے حد شرمندہ ہیں.... ماضی میں جو کچھ بھی ہوا اور تبریز کے ابو نے جو کیا... اُن سب باتوں کی میں تم سے معافی مانگنے آئی ہوں۔" بلقیس بیگم نے سر جھکا کر کہا۔

"نہیں آنٹی.. آپ کا اس سب میں کیا قصور تھا.. آپ کو کوئی ضرورت نہیں معافی مانگنے اور شرمندہ ہونے کی۔" رومی نے کہا۔

"تبریز کے ابو بھی تم سے بہت شرمندہ ہیں بیٹی.... وہ بھی تم سے معافی مانگنے آنا چاہتے تھے لیکن شرمندگی کے مارے نہیں آسکے۔" بلقیس بیگم نے کہا تو رومی کو بہت حیرت ہوئی۔

"میرے دل میں پرانی باتوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے... میں سب کچھ بھلا چکی ہوں اسلئے آپ خوامخواہ خود کو پریشان نہ کیجئے۔" رومی نے اطمینان سے کہا۔

"ہم نے بہت سزا کاٹی ہے تم سے زیادتی کر کے... تمہیں اور تبریز کو الگ کر کے ہم خود بھی خوش نہیں رہ سکے۔" بلقیس بیگم نے نم آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیسی سزا...؟ رومی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم تبریز کو تم سے دور کرتے کرتے... اپنے ہی بیٹے کو خود سے دور کر بیٹھے۔" بلقیس بیگم نے دُکھ اور افسوس کی ملی جلی کیفیت میں کہا۔

"یہ سب باتیں تو اب ماضی کا قصہ ہو گئیں... میں بھولا چکی ہوں سب کچھ آپ لوگ بھی بھول جائیں۔" رومی نے کہا۔

"تم نے تو بھلا دیا.. لیکن تبریز آج بھی تمہاری راہ دیکھ رہا ہے رومیسہ۔" بلقیس بیگم نے کہا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں آنٹی...؟" رومی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔

"ہاں بیٹی... میں سچ کہہ رہی ہوں... تمہارے بعد اُسکی حالت بہت ابتر ہو گئی تھی بڑی مشکل اُس نے خود کو سنبھالا ہے لیکن ایک ہی دھن سوار ہے اُس پہ کہ شادی کرے گا تو صرف تم سے کرے گا ورنہ کسی اور کو اپنی زندگی میں جگہ نہیں دے گا.. ہم سب نے اُسے بہت سمجھایا تھا کہ تمہاری شادی ہو چکی ہے وہ بھول جائے تمہیں لیکن اُس نے کسی ایک کی نہ سنی... آج تک اپنے باپ سے خفا ہے... اُن سے بات تک نہیں کرتا۔" بلقیس بیگم اب باقاعدہ رو رہی تھیں۔

"اوہ میرے خدا.. تبریز ایسا بھی کرسکتا ہے.. میں تو سمجھی تھی وہ اب تک گھر بسا چکا ہوگا۔" رومی نے دل ہی دل میں سوچا۔ "پلیز آنٹی.. آپ روئیں نہیں۔" رومی نے کہا۔

"رومیسہ تم ہی تبریز کو دوبارہ زندگی کی طرف لاسکتی ہو... وہ تمہیں بے پناہ چاہتا ہے اگر تم اُسے نہ ملی تو وہ یونہی بھٹک بھٹک کر اپنی زندگی کو ضائع کرتا رہے گا اور خود پہ زندگی کی ہر خوشی حرام کئے رکھے گا... خدارا میرے بیٹے کو اُسکی خوشیاں لوٹا دو۔" بلقیس بیگم نے اُسکے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ارے۔۔آنٹی یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔۔۔پلیز مجھے شرمندہ نہ کریں۔۔۔میں خود بیوگی کا روگ دل سے لگا کر بیٹھی ہوئی ہوں۔۔میں اُسے کیا خوشی دے سکوں گی؟" رومی نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"تم ہی اُسکی خوشی ہو رومیہ۔۔۔اگر تم اُسکی زندگی میں آ جاؤ تو وہ سب غم بھلا دے گا۔اس سے بڑھ کر اُسکے لئے خوشی کی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔" بلقیس بیگم نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"اب یہ ممکن نہیں ہے۔۔۔میں اشعر کی بیوی تھی اور اب اُسکی بیوہ ہوں۔۔میری زندگی اُسکی یادوں کے سہارے گزر جائے گی اس میں اب کسی اور کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔تبریز کے لئے بھی نہیں۔" رومی نے افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔۔۔تمہاری زندگی تو گزر جائے شاید لیکن اگر تم تبریز کو نہ ملی تو وہ خود کو تباہ کر ڈالے گا۔۔۔برباد ہو جائے گا۔" بلقیس بیگم نے درد بھرے انداز میں کہا۔

"سچ ہے مرنے والوں کے ساتھ انسان مر نہیں جاتا۔۔۔لیکن جیسی زندگی ہم مرنے والے کے ساتھ جی چکے ہوتے ہیں۔۔اُسکے بغیر دوبارہ ویسے ہی جینا بھی ممکن نہیں رہتا۔" رومی نے رنج اور بے بسی کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔

"مرنے والے کی جدائی پہ تو ایک دن رو دھو کر صبر کر لیا جاتا ہے۔۔۔لیکن زندہ کا بچھڑ جانا اُس سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے رومیہ۔۔۔میری بات پہ غور ضرور کرنا۔" بلقیس بیگم نے کہا اور وہاں سے چلی گئیں۔۔رومیہ کی امی جو اُنکے لئے چائے لیکر آئیں تھیں وہیں ڈرائنگ روم کے دروازے پہ ہی کھڑی رہ گئیں۔بلقیس بیگم نے جو کہنا تھا وہ کہہ کر چلی گئیں تھیں لیکن رومیہ کو ایک نئی پریشانی میں مبتلا کر گئیں تھیں۔وہ وہیں بے بس سی بیٹھی اُنکی باتوں پہ غور کر رہی تھی۔"یہ تبریز کی والدہ کس بات پہ غور کرنے کو کہہ کر گئیں ہیں تمہیں۔۔۔؟" رومی کی امی نے اُسے پوچھا۔"معافی مانگ رہیں تھیں جو کچھ اُنکے شوہر سے ہوا تھا اُسکی۔۔اور۔۔۔" رومی کچھ کہتے کہتے خاموش ہوئی۔" اور کیا؟" رومی کی امی کو تجسس ہوا۔"اور یہ کہ۔۔۔میں تبریز کو پھر سے اپنی زندگی میں جگہ دے دوں۔" رومی نے بتایا۔"پھر تم نے کیا کہا اُنھیں۔۔۔؟" رومی کی امی نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں امی۔۔۔میرے پاس ہے ہی کیا اب کسی کو دینے کے لئے۔۔؟" رومی نے مایوس لہجے میں کہا۔

"کیا مطلب ہے ہی کیا۔۔؟" رومی کی امی نے خفگی سے کہا۔

"میں اس بارے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔۔۔میری زندگی میں اب اشعر کی یادوں کے سوا اور کسی کی جگہ نہیں ہے۔" رومی نے کہا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔کمرے میں آ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔زندگی بھی انسان سے کیسے کیسے امتحان لیتی ہے جب ہمیں کسی چیز کی چاہ ہوتی ہے تو وہ ہمیں حاصل نہیں ہوتی اور جب ہمارے دل میں اُسکی خواہش ہی مر جاتی ہے تو وہی چیز ہمارے قدموں میں لا کر ڈال دی جاتی ہے۔جب وہ تبریز سے شادی کرنا چاہتی تھی تب تقدیر نے اُنھیں جدا کر دیا اور اب جبکہ وہ اشعر کی بیوہ بن کر اپنی باقی زندگی گزارنا چاہتی ہے تو تقدیر نے پھر سے تبریز کو اُسکے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ایک طرف اشعر کی یادیں ہیں اور

دوسری طرف تبریز کی زندگی کا سوال ہے۔ رومیسہ خود کو ایک دوراہے پہ کھڑا محسوس کر رہی تھی۔ وہ خود کو بہت بے بس محسوس کر رہی تھی۔ ایک بار پھر وہ دل اور دماغ کی گھمسان جنگ میں خود کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ رہی تھی۔ بظاہر وہ خاموش تھی لیکن اُسکی اندر ایک طلاطم برپا تھا۔ جب سے تبریز کی والدہ روی سے مل کر گئیں تھیں اُس پہ عجیب سی کیفیت تھی۔ روی کے والدین بھی اب الگ ڈھنگ سے سوچنے لگے تھے جس کی وجہ سے اب رومیسہ کو مزید پریشانی کا سامنا تھا۔ اُدھر بلقیس بیگم کے چکر اب کچھ زیادہ ہی لگ رہے تھے۔ لیکن روی بھی ضد پر اڑی تھی کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گی۔ وہ اشعر سے بے وفائی نہیں کرے گی اور کسی طور بھی دوبارہ نکاح نہیں کرے گی۔ تبریز کے والدین اور روی کے والدین مل کر اُسے اس شادی پہ رضامند کر رہے تھے لیکن روی کا دل نہیں مانتا تھا۔

''روی... بیٹا ساری زندگی اس طرح دل پہ روگ لیکر جیو گی کیا...؟'' روی کی امی نے دُکھ بھرے لہجے میں سوال کیا۔

''امی میں روگ لیکر نہیں... اشعر کی خوبصورت یادوں کے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔'' روی نے اُکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔

''اشعر کی یادوں کے سہارے یہ عمر نہیں کٹے گی میری بچی... تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟'' روی کی امی کو اب اُس پہ غصہ آنے لگا تھا۔

''امی.. آپ سب مجھے کیوں مجبور کر رہے ہیں ایسے کام کے لئے جو میں کرنا نہیں چاہتی.. میں دوسری شادی نہیں کرونگی امی.. پلیز آپ سب لوگ مجھے جینے دیں۔'' روی اب چڑچڑی ہو رہی تھی۔

''آخر اس میں بُرائی کیا ہے.. تبریز اور تم پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو اور شادی بھی کرنا چاہتے تھے.. تو تم کیوں خود کو اس اذیت میں مبتلا رکھنا چاہتی ہو روی..؟'' روی کی امی نے کہا۔

''وہ سب ماضی کی باتیں ہیں... اُن کا میرے حال سے کوئی واسطہ نہیں۔'' روی نے خفگی سے کہا۔

''اشعر بھی اب ماضی کی یاد ہے بیٹا... تم کب سمجھو گی..؟'' روی کی امی نے التجائیہ انداز میں کہا۔

''امی... خدا کے لئے.. ایسا بول کر مجھے تکلیف نہ دیں... میں اشعر کو نہیں بھلا سکتی۔'' روی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر آئیں۔

''روی ابھی تو ہم زندہ ہیں... لیکن جب ہم نہیں ہونگے بیٹا تو یہ تنہائی اور دنیا تمہیں جینے نہیں دے گی.. اکیلی لڑکی کی اس معاشرے میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی بیٹا.. اور تبریز جیسا چاہنے والا اور وفا شعار انسان تمہیں کوئی دوسرا نہیں ملے گا جو ہمارے بعد تمہارا خیال رکھے گا۔'' روی کی امی نے نم آنکھوں سے کہا۔

''امی.. آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں.. خدا نہ کرے کہ آپکو اور ابو کو کچھ ہو..'' روی نے زار و قطار روتے ہوئے ماں سے لپٹ کر کہا۔

''ہمارے بعد تمہارا کوئی نہیں ہے بیٹا.. رشتے دار بھی دنیا دار بن جاتے ہیں اگر ماں باپ سر پہ نہ ہوں تو... اور تمہارا تو کوئی بہن یا بھائی بھی نہیں ہے کہ ہمیں آسرا ہو جائے کہ ہمارے بعد کوئی تو ہے تمہارا اپنا...... ہمارے حال پہ رحم کھاؤ روی... ہم مرتے وقت اس سکون سے مرنا چاہتے ہیں کہ ہمارے بعد تم تنہا نہیں ہو۔'' روی کی امی اُسے خود سے لپٹا کر روتے ہوئے اُسے ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک بات سمجھا رہی تھیں۔

"امی۔۔پلیز۔۔بس کریں۔۔ایسا مت کہیں خدارا۔۔" رومی نے تڑپ کر کہا۔

"ماں باپ کی مجبوری ہوتی ہے بیٹیوں کو اگلے گھر بھیجنا۔اگر مجبوری نہ ہو تو کوئی بھی اپنے لختِ جگر کو خود سے دور نہ کرتا۔۔" رومی کی امی بھی اُسکے ساتھ رو رہی تھیں۔

"امی۔۔۔مجھے آپکا ہر فیصلہ قبول ہے۔۔لیکن خدارا مرنے کی باتیں نہ کریں۔۔۔میں اشعر کی موت کو نہیں بھول پا رہی اور اب۔۔۔آپ ایسی باتیں کر رہی ہیں۔۔" رومی ماں کے سینے سے لگی سسک سسک کر کہہ رہی تھی۔

"میں تمہیں آنے والے وقت سے خبردار کرنا چاہ رہی تھی بیٹا۔۔میرا مقصد تمہیں تکلیف پہنچانا نہیں تھا۔۔۔والدین سدا اولاد کے سر پہ سلامت نہیں رہتے اسلئے اُنکی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کو ہنستا بستا چھوڑ کر اطمینان سے اس دنیا سے جائیں۔" رومی کی امی اُسکے بالوں کو اُنگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہہ رہی تھیں اور وہ اُنکے سینے سے لپٹی زار و قطار روئے چلے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

تبریز کے کمرے کو گلاب کے پھولوں سے بہت خوبصورت سجایا گیا تھا۔ہر طرف گلاب کے پھول اور چتیاں بڑی نفاست سے رکھی گئی تھیں۔کمرے میں صرف کینڈل لائٹس تھیں جو ماحول کو خوابناک بنا رہی تھیں۔رومیسہ دلہن کے جوڑے میں بے حد حسین لگ رہی تھی۔یوں جیسے کوئی پری زمین پہ اتر آئی ہو۔سرخ جوڑے میں سجا اُسکا نازک وجود خود میں دنیا جہاں کی کشش سموئے ہوئے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہا تھا۔جو بھی اُسے دیکھتا تھا بس نظر ٹھہرتی نہیں تھی۔گلاب کی پتیوں سے سجے ہوئے بیڈ پہ بیٹھی وہ خود بھی کنول کا پھول دکھائی دے رہی تھی۔بظاہر ہر چیز بہت پُرسکون اور دلکش نظر آ رہی تھی لیکن رومیسہ کا دل رو رو کر اُسے کچھ کے لکار رہا تھا۔وہ کمرے میں جہاں بھی نظر دوڑا رہی تھی اُسے اشعر کی یاد اور بھی زیادہ آنے لگی تھی۔اُسے اشعر کے ساتھ گزاری وہ سب قربت بھری راتیں یاد آنے لگیں تھیں۔اُسکا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس پھولوں کی سیج سے اُٹھ کر بھاگ جائے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔اشعر کی سہاگ رات پہ کہی ہوئی ایک ایک بات اُسکے ذہن میں کسی ٹیپ ریکارڈر کی طرح چلنے لگی تھی۔وہ بیٹھی تو تبریز کی سیج پہ تھی لیکن اُسکا دل اشعر کے ساتھ ہی اُسکی قبر میں دفن ہو چکا تھا۔آج رومیسہ پہ زندگی کا یہ راز کھلا تھا کہ کنواریوں کی سیج تو بس پہلی بار ہی سجتی ہے دوسری بار تو سمجھوتے کی سیج ہوتی ہے مجبوری کی ہوتی ہے۔۔۔خواہشوں اور اُمنگوں کی نہیں۔

ابھی رومیسہ اُنہی سوچوں میں گم تھی کہ تبریز کمرے میں داخل ہوا۔رومی اُسے دیکھ کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔وہ کچھ دیر تو وہیں دروازے کے قریب کھڑا اُسے دور سے دیکھتا رہا جیسے یقین کر رہا ہو۔پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا بیڈ کے قریب آ گیا اور رومیسہ کے سامنے بیٹھ گیا۔رومیسہ نے ایک نظر اُٹھا کر اُسکی طرف دیکھا لیکن اُسکی آنکھوں کے سامنے اشعر کا مسکراتا ہوا چہرہ لہرا گیا۔رومیسہ نے ایک نظر دیکھ کر آنکھیں جھکا لیں تھیں۔تبریز بہت دیر تک بیٹھا اُسے دیکھتا رہا اور وہ سر جھکائے بیٹھی رہی یوں جیسے دونوں کے پاس الفاظ نہیں تھے یا شاید کہنے کو کچھ نہیں تھا۔تبریز نے نرمی سے اُسکا ہاتھ تھام لیا اور اُسے محبت سے دبایا جیسے اپنے ہونے کا احساس دلا رہا ہو۔رومی نے اُسکی طرف

نہیں دیکھا تھا اسکی حالت عجیب سی ہو رہی تھی اسلئے وہ تبریز سے نظر نہیں ملا پا رہی تھی۔ رومی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے تبریز سے نظر ملی تو وہ اسکی آنکھوں میں کہیں اشعر کو نہ دیکھ لے۔ تبریز نے رومی کا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگایا تو رومی نے چونک کر اسکی طرف دیکھا۔ تبریز کے پورا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ تبریز اُسکے سامنے بیٹھا رو رہا تھا اور اُسے خبر تک نہیں تھی رومی کو خود پہ شرمندگی سی محسوس ہوئی تھی۔

"کیا ہوا تبریز...آپ ٹھیک تو ہیں؟" رومی نے پریشان کن لہجے میں پوچھا۔

"تم ساتھ ہو...اب ٹھیک ہوں۔" تبریز نے بمشکل کہا تو رومی کو دل ہی دل میں افسوس ہوا۔

"پھر آپ ایسے رو کیوں رہے ہیں...؟" رومی نے پوچھا۔

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں رومی... یا اُس جدائی کی تکلیف ہے جو آنکھوں سے بہہ کر تمہیں میرا حال بتا رہی ہے۔" تبریز نے کہا تو رومیسہ کو اُس پہ بے حد ترس آیا۔ رومی نے اُسی ہاتھ سے اُسکے آنسو پونچھ دیئے جو تبریز نے تھام رکھا تھا۔ تبریز نے اُسکے ہاتھ کی پشت کو چوم لیا۔

رومی نے پھر سے اپنی نظریں جھکا لیں تھیں۔ اُس پہ جو کیفیت تھی وہ تبریز کو بتا کر اُسے تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔ تبریز اب بہت بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔ یوں جیسے کوئی سالوں قیدِ تنہائی کاٹنے کے بعد ہو جاتا ہے۔ رومیسہ کو تبریز کی حالت پہ بے حد ترس آ رہا تھا۔

"رومی...تم نہیں جانتی کہ میں کس تکلیف سے گزرا ہوں...تمہیں کھو کر میں کیسے زندہ رہا ہوں...اور تمہیں پانے کے لئے میں نے کیا نہیں کیا۔" تبریز یہ کہتے ہوئے کہیں کھو سا گیا تھا۔

"تبریز یہ میری دوسری شادی ہے...اور اب میں وہ پہلے جیسی رومیسہ نہیں رہی...لیکن پھر بھی میں اپنی پوری کوشش کروں گی کہ آپکو مجھ سے کبھی شکایت نہ ہو۔" رومیسہ نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا میرے ساتھ ہونا...میرے سامنے ہونا ہی میرے لئے کافی ہے...اگر مجھے ساری زندگی تمہیں دیکھ کر بھی گزارنی پڑی تو میں ہنس کر گزار دوں گا...کبھی حرفِ شکایت ان ہونٹوں پہ نہیں آئے گا۔" تبریز نے بھرپور جذباتی لہجے میں کہا۔

"آپ آج بھی مجھے اتنا چاہتے ہو تبریز...؟" رومی نے حیرت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری یادوں کے سہارے یہ وقت کاٹا ہے میں نے...کبھی ہنس کے...کبھی رو کے...کبھی خود کو بھلا کر...کبھی تمہاری یادوں میں کھو کر...اور تم پوچھتی ہو آج بھی اتنا چاہتے ہو..."

"شاید خدا کو یہی منظور تھا..." رومی نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے زندگی بھر بھی تمہارا انتظار کرنا پڑتا...تو میں کرتا...چاہے اُس انتظار میں میری زندگی ہی کیوں نہ ختم ہو جاتی..." تبریز نے اسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو رومی نے اپنی پلکیں جھکا لیں۔ تبریز نے اپنے سوٹ کی جیب سے ایک خوبصورت انگوٹھی نکال کر رومی کے ہاتھ میں پہنائی تو اُس کے ہونٹوں پہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆......☆......☆

دنیا کے حسین ترین احساس کا نام ہے 'محبت' اور محبت کا احساس اور بھی حسین ہو جاتا ہے جب ہم اُسے حاصل کر لیتے ہیں جس نے ہمیں اس احساس سے ہمکنار کیا ہوتا ہے۔ محبت جب تک حاصل نہ ہو جائے تب تک اُسکی جستجو رہتی ہے ورنہ لاحاصل بن کر زندگی بھر انسان کو تکلیف میں مبتلا کیے رکھتی ہے۔ تبریز، روی کو پا کر بے حد خوش تھا۔ خوشی سے اُسکے پاؤں زمین پہ نہیں ٹکتے تھے۔ ہر وقت اُسے روی کا خیال رہتا تھا۔ وہ کیا کر رہی ہے اُس نے کچھ کھایا ہے یا نہیں، کب سوئے گی کب اُٹھے گی، اُسے کس چیز کی ضرورت ہے غرض اُسکی ہر چھوٹی اور بڑی سے بڑی بات کا خیال رہتا تھا۔ رومیسہ نے بھی کبھی اُسے شکایت کا موقع نہیں دیا تھا وہ اپنی طرف سے ایک اچھی بیوی بننے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ تبریز کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بلقیس بیگم کے دل کو اطمینان رہنے لگا تھا۔ اور روی کے والدین بھی اپنی بیٹی کو ہنستا بستا دیکھ کر خوش اور مطمئن تھے۔ بیوگی کی چادر اُسکے سر سے اُتر کر پھر سے سہاگ کے آنچل کے رنگوں میں بدل گئی تھی۔ سب کچھ بہت اچھا چل رہا تھا لیکن تبریز کے دل میں ایک چبھن اور بے کلی سی تھی جو دن رات بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی۔ اکثر رومیسہ کو دیکھ کر یہ بے کلی مزید بڑھ جاتی تھی۔ ایک احساسِ ندامت اُسے گھیرے میں لے لیتا تھا۔ اور تبریز دل ہی دل میں خود کو ایک نہ ختم ہونے والے ملال میں مبتلا محسوس کرتا تھا۔ آفس میں اپنی چیئر کو جھلاتے ہوئے تبریز نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا کہ اچانک اُسکے موبائل کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ تبریز نے موبائل اُٹھا کر دیکھا تو سکرین پہ سمیر کا نام جگمگا رہا تھا۔ ایک مسکراہٹ تبریز کے ہونٹوں پہ بکھر گئی۔ اُس نے جلدی سے فون کان کو لگا کر ہیلو کہا ہی تھا کہ دوسری طرف سے سمیر کی گالیوں نے اُسے چونکا دیا۔

"ذلیل... کمینے... خبیث آدمی... تین مہینے ہو گئے شادی کو اور مجھے بتانا تک گوارہ نہیں کیا تم نے..." سمیر بہت تپا ہوا تھا۔

"ارے بابا... سانس تو لو یار... مانتا ہوں میری غلطی ہے لیکن تم بھی تو بلوچستان پوسٹنگ کروا کر بیٹھ گئے..." تبریز نے کہا۔

"بلوچستان ہی گیا تھا ناں... کوئی کوہ قاف تو نہیں چلا گیا تھا کہ تم نے مجھے شادی پہ انوائیٹ کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔" سمیر اب بھی غصے میں تھا۔

"یار سادگی سے نکاح کیا تھا... تیری قسم کوئی دھوم دھڑکا نہیں ہوا... بس سادگی سے نکاح کیا اور تمہاری بھابھی کو گھر لے آیا۔" تبریز نے اُسے یقین دلایا۔

"نکاح کے دو چھوارے میں بھی کھا لیتا تو تمہارا خرچہ بڑھ تو نہیں جانا تھا..." سمیر نے غصے سے کہا تو تبریز کو ہنسی آ گئی۔

"اچھا بابا... معاف کر دو غلطی ہو گئی میرے باپ... اب بتاؤ کہاں ہو آج کل...؟" تبریز نے ہنسی دباتے ہوئے کہا۔

"جناب آج کل ہم واپس آپکے دیار میں پہنچ چکے ہیں... اب جلدی سے ملاقات کرواؤ بھابھی سے میری اور شادی کی ٹریٹ تو میں لیئے بغیر تمہاری جان نہیں چھوڑنے والا..." سمیر نے رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں.. ہاں... کیوں نہیں.. جب دل چاہے گھر آ جانا... بس مجھے ایک کال کر دینا پہلے۔"

"ٹھیک ہے کل آ رہا ہوں میں... ابھی بتا رہا ہوں تا کہ تم عین وقت پہ کوئی بہانہ نہ بنا دو..." سمیر نے کہا تو تبریز ہنس دیا۔

"چلو اب بکواس نہیں کرو... میں ڈنر پہ تمہارا انتظار کرونگا۔" تبریز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"او۔کے.. بائے۔" سمیر نے کہا اور کال ڈراپ کر دی۔ سمیر تبریز کا سب سے قریبی اور گہرا دوست تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے ہر سیاہ و سفید کے رازدار تھے اور ہمیشہ ایک دوسرے کے اچھے بُرے وقت میں کام آنے والے بھی۔ تبریز کو لگا شاید سمیر اُسے کوئی اچھا مشورہ دے سکے۔ تبریز نے گھڑی کی طرف دیکھا تو شام کے سات بج رہے تھے۔ وہ جلدی جلدی سارے پیپرز سمیٹنے لگا اور لیپ ٹاپ کو آف کر کے اپنا کوٹ لیکر آفس سے نکل آیا۔

"آپ آ گئے... کھانا لگواؤں آپکے لئے..." تبریز جب گھر پہنچا تو رومی نے اُسے دیکھ کر کہا۔

"ہاں... تھوڑی دیر تک کھاؤنگا..." تبریز نے کوٹ اُتار کر رومی کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے کچھ تھکے تھکے سے لگ رہے ہیں آپ...؟" رومی نے تبریز کے چہرے پہ تھکان دیکھی تو بولی۔

"نہیں... ہاں بس۔ وہ کام کی زیادتی کی وجہ سے ہے... شاید۔" رومی کے سوال پہ تبریز کچھ گڑبڑا سا گیا جیسے اُسکی چوری پکڑی گئی ہو۔ وہ اکثر یونہی اُسکے سوالوں پہ گڑبڑا سا جاتا تھا جیسے پہلے سے کسی بات پہ خوفزدہ ہو۔

"اچھا.. آپ فریش ہو جاؤ... میں کھانا لگاتی ہوں۔" رومیسہ نے کہا اور وہاں سے جانے لگی تھی کہ تبریز نے اُسکا ہاتھ تھام کر اُسے روک لیا۔ رومیسہ اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

"تم ٹھیک ہو ناں...؟" تبریز نے بغور اُسکے چہرے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی.. میں ٹھیک ہوں.. کیا ہوا؟؟" رومی کو تبریز کا سوال بہت غیر متوقع لگا تھا۔

"نہیں... کچھ نہیں... وہ مجھے تمہیں ایک بات بتانی تھی۔" تبریز نے خجالت سے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"جی... بتائیں سب ٹھیک تو ہے ناں...؟" رومی نے پریشانی سے کہا اُسے تبریز کی حالت بہت عجیب سی لگ رہی تھی جیسے وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اُسکا دل اُسے کہہ دینے کے لئے مچل رہا ہو۔

"وہ میرا بیسٹ فرینڈ ہے ناں... سمیر.. وہ کل ہمارے یہاں ڈنر پہ آ رہا ہے۔" تبریز نے خود پہ قابو پا کر خوشگوار موڈ میں کہا۔

"اوہ... اچھا.. میں بھی پتہ نہیں کیا بات ہے.." رومی ہلکے سے مسکرا دی۔

"تم تو ایسے ہی پریشان ہو جاتی ہو جان..." تبریز نے پیار سے اُسکے گال پہ چٹکی بھرتے ہوئے کہا۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں... اب آپ جاؤ فریش ہو کر آؤ.. بہت بھوک لگ رہی ہے مجھے کب سے انتظار کر رہی تھی آپکا..." رومی نے اُسے واش روم کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "اچھا بابا... تم چلو میں بس دو منٹ میں آیا..." تبریز نے کہا اور واش کی طرف چل دیا اور رومی ڈائننگ ہال کی جانب چل دی۔

☆......☆......☆

پسینے میں اُسکا وجود شرابور ہو رہا تھا اور اُسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا یوں جیسے کوئی اُسکا گلا دبا رہا ہو۔ گھبراہٹ کے باعث اُسکی آنکھ کھل گئی لیکن وہ خود کو جکڑا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا اور کہیں بھی کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تبریز نے ایک بار اُٹھنے کی کوشش کی لیکن اُسکے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا لیکن بے سود۔۔ رسیوں سے اُسکے ہاتھ اور پاؤں مضبوطی سے جکڑے گئے تھے۔ اُسے بہت گرمی محسوس ہو رہی تھی اور پیاس کی شدت سے اُسکا حلق خشک ہو گیا تھا۔ اُسے شدید وحشت محسوس ہو رہی تھی اور خود کو اس جکڑن سے آزاد کروانا چاہتا تھا لیکن کہیں بھی کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا اور خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ "مجھے پانی چاہیے... مجھے پیاس لگی ہے... خدا کے لئے پانی دے دو..." چلاتے چلاتے جب وہ تھک گیا تو رو رو کر التجائیں کرنے لگا۔ لیکن کوئی نہیں تھا جو اُسکی پکار سنتا۔ اچانک کہیں سے شعلے جیسی روشنی آتی دکھائی دی اور جیسے جیسے وہ روشنی قریب آ رہی تھی گرمی اور حبس بھی بڑھ رہا تھا۔ اب یہ روشنی تیز شعلے بھڑکاتی آگ کی مانند ہو گئی تھی اور تبریز کو جلانے کے لئے پوری طرح قریب آ چکی تھی۔ وہ زور زور سے چیخ رہا تھا اور معافیاں مانگ رہا تھا۔ لیکن آگ نے اُسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا اور اب وہ اُسکے وجود کو جھلسانے لگی تھی۔ تبریز رو رہا تھا، چیخ رہا تھا اور چلا رہا تھا لیکن کوئی اُسکی مدد کو نہیں آ رہا تھا۔ "یہ سب تمہارے گناہوں کا پھل ہے جو تم نے کمایا ہے تبریز" ایک رعب دار اور بھاری آواز میں کہا گیا جس نے اُسکے پورے وجود میں سنسنی اور خوف کی لہر دوڑا دی۔ اچانک ایک زبردست دھماکے سے آگ اُسکے پورے وجود پہ چھا گئی اور وہ اندھیروں میں گم ہوتا چلا گیا۔

"نہیں... ایسا نہیں ہو سکتا..." تبریز ایک جھٹکے سے اُٹھ بیٹھا اور لمبے لمبے سانس کھینچنے لگا۔ اُسکا چہرہ پسینے سے تر تھا اور اُسکا پورا وجود خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ وہ خود کو بے حد خوفزدہ محسوس کر رہا تھا اور احساس ندامت اُسکے دل کو شدید رنج و ملال میں مبتلا کر رہا تھا۔ کچھ دیر خود کو سنبھالنے میں لگی تھی۔ تبریز نے اپنے پہلو میں بے خبر سوئی ہوئی رومیسہ کے چہرے کی طرف دیکھا۔ سکون اور اطمینان سے چمکتا دمکتا اُسکا معصوم چہرہ خود میں ساری دنیا کی طمانیت اور خوبصورتی سموئے ہوئے تھا۔ تبریز کو اُسے دیکھ کر رشک آیا تھا۔ "بے گناہ اور معصوم انسان ایسے ہی پُرسکون نیند سویا کرتے ہیں" تبریز نے اُسے دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ اُسے خود پہ رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اور اب یہ غصہ بے بسی میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بیڈ سے اُٹھ کر واش روم کی طرف چل دیا اور صابن سے اپنے ہاتھ مَل مَل کر دھونے لگا۔ لیکن اُسے کسی طرح بھی تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ اُس نے وحشت بھرے انداز میں آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھا۔ اُسے اپنے چہرے سے بھی نفرت محسوس ہو رہی تھی اور وجود میں ایک آگ سی بھڑکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنے کپڑے اُتارنے لگا۔ کپڑے اُتار کر وہ شاور کے نیچے کھڑا ہو کر اپنے آپ کو بھگونے لگا۔ نہ جانے کتنی دیر تک وہ خود کو بھگوتا رہا اور گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا وہ کسی غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے کھڑا رہا۔ بہت دیر تک بھیگنے کے بعد وہ شاور کو بند کر کے کپڑے پہن کر باہر نکل آیا۔ اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سٹڈی روم میں آ کر وہ جائے نماز بچھا کر نماز کے لئے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر نماز پڑھنے میں وہ وقت محسوس کرتا رہا لیکن پھر کافی دیر نماز پڑھنے کے بعد وہ جائے نماز پہ یوں بیٹھ گیا جیسے مجرم منصف کے آگے پیش کیا جاتا ہے... شکست

خوردہ.. احساس ندامت اور شرم سے جھکا ہوا سر ۔ وہ بیٹھ کر زاروقطار آنسو بہانے لگا۔ روتے روتے اُسکی ہچکی بندھ گئی لیکن اُسکے آنسو تھم نہیں پا رہے تھے۔ وہ احساس جُرم سے دوچار تھا۔ وہ رو رو کر خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگنے لگا لیکن اُسکا دل کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ بس روتا چلا جا رہا تھا اور اُسکی آہیں اور سسکیاں اس بڑے سے گھر میں گونجنے لگیں تھیں۔ رومی کی آنکھ کھلی تو تبریز کو بستر پہ نہ پا کر وہ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگی لیکن واش روم کی لائٹ بھی آف تھی اور کمرے کی بھی۔ رومی نے سائیڈ ٹیبل لیمپ آن کیا اور بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلی اور لابی سے گزرتے ہوئے وہ ٹی۔ وی لاؤنج میں پہنچی لیکن وہاں بھی تبریز نہیں تھا۔ وہ کچن سے گزر کر اب سٹڈی روم کی طرف بڑھنے لگی۔ اُسے کسی کے رونے اور سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اُسکا دل بے چین ہو رہا تھا وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی چپکے سے سٹڈی روم کے دروازے پہ آ کر کھڑی ہو گئی۔ تبریز قبلہ رُو بیٹھ کر زاروقطار رو رہا تھا۔ رومیسہ کو بہت حیرت ہو رہی تھی۔ "تبریز تو عید اور جمعے کی نماز بڑی مشکل سے پڑھتا تھا اور اب تہجد کے وقت آخر کس بات کی رو رو کر معافی مانگ رہا ہے خدا سے..." رومی نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اُسے کچھ سمجھ نہیں آئی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ "اے میرے پاک پروردگار... مجھے معاف کر دے۔ اگر تو نے مجھے نہ بخشا تو مجھے جہنم کی آگ سے کوئی نہیں بچا پائے گا۔" تبریز اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے خدا سے رو رو کر التجا تیں کر رہا تھا۔ رومی نے اُسے ایسی حالت میں اپنی طرف متوجہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور کچھ سوچتی ہوئی وہ واپس اپنے بیڈ روم میں آ کر لیٹ گئی اور سائیڈ لیمپ بھی آف کر دیا۔ تبریز فجر کی نماز کے بعد جب ہلکی سی روشنی پھیل چکی تھی کمرے میں آیا اور چپکے سے آ کر لیٹ گیا۔ رومیسہ نے بھی اُس پہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ اُسکا انتظار کر رہی تھی اور آنکھیں موندے لیٹی رہی اور نہ جانے پھر کب دوبارہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

☆......☆......☆

"ارے بھابی آپ مت پوچھیں... تبریز تو آپکی جدائی میں بالکل مجنوں ہو گیا تھا... خدا کی قسم اگر آپ اسے اب تک نہ ملی ہوتیں تو کوئی بعید نہیں تھی اس سے کہ یہ صحراؤں میں رومیسہ، رومیسہ پکارتے ہوئے بھٹک رہا ہوتا۔" ڈنر کے بعد چائے پیتے ہوئے گپ شپ لگاتے ہوئے سمیر نے تبریز کا مذاق اُڑاتے ہوئے کہا تو رومیسہ ہنسنے لگی اور تبریز بھی خجالت سے مسکرا دیا۔

"ارے یار۔ تیری بھابی اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں اُنہیں کتنا چاہتا ہوں.. تجھے مجنوں کی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔" تبریز نے سمیر کو اُسکا مذاق بنانے سے روکنے کے لئے کہا۔

"ہاں۔ اب تو وہ تجھ جیسے جنونی کی منکوحہ و زوجہ جو بن گئیں ہیں تو اُن سے بہتر اور کون جان سکتا ہے بھلا۔" سمیر نے مزاحیہ انداز میں کہا تو تبریز ایک قہقہے کے ساتھ ہنس پڑا اور رومی بھی مسکرا دی۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے کہ تبریز جنونی ہیں.. اب تو تبریز بہت ٹھیک ہو گئے ہیں.. تہجد بھی پڑھنے لگے ہیں۔" رومی نے سمیر کی تردید کرتے ہوئے کہا تو چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے تبریز کو اچھو لگا تھا۔ اُسکے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ رومی اُسکے تہجد کے وقت نماز پڑھنے سے واقف ہے۔

"ارے دھیان سے... آپ ٹھیک تو ہیں؟" روحی نے تبریز کو کھانستے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"میں ٹھیک ہوں... بیٹھی رہو پلیز" روحی اپنی نشست سے اٹھ کر اسکی طرف بڑھنا چاہ رہی تھی لیکن تبریز نے منع کر دیا تو وہ واپس بیٹھ گئی۔

"ارے آپ پریشان نہ ہوں رومیسہ بھابھی... چائے اسکا کیا بگاڑے گی... آپ اسکے کارناموں سے ابھی واقف نہیں ہیں... یہ تو..." سمیر ابھی مزید کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ تبریز کے گھورنے سے وہ خاموش ہو گیا۔

"آپ لوگ باتیں کریں... میں ابھی آتی ہوں" روحی نے انہیں اکیلا چھوڑنا مناسب سمجھتے ہوئے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

"ذرا سوچ سمجھ کر بولا کر یار... میری بیوی ہے وہ... کیوں کلاس کروانا چاہتے ہو؟" تبریز نے سمیر سے کہا۔

"اوئے ہوئے... تبریز صاحب کو ڈر لگ رہا ہے بیوی سے... یا خدا میں یہ سب دیکھنے سے پہلے مر کیوں نہیں گیا..." سمیر نے مزاحیہ انداز میں کہا تو تبریز ہنسنے لگا اور صوفے کا ایک کشن اٹھا کر اسے دے مارا۔

"ویسے یہ تو بتاؤ... یہ تہجد والا کیا سین ہے باس... آپ کب سے اتنے نمازی پرہیزی ہو گئے؟" سمیر نے سنجیدگی سے پوچھا تو تبریز کچھ گڑبڑا سا گیا۔

"کیوں... کیا نہیں پڑھ سکتا... مسلمان ہوں آخر..." تبریز نے اپنی اندرونی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔

"ہاہاہاہا... بیٹا تجھے میں بچپن سے جانتا ہوں... تجھ جیسا کمینہ آدمی جو سپارہ پڑھنے جانے کے بجائے ویڈیو گیمز کھیلنے جایا کرتا تھا اور عید کی نماز بھی جو زندگی میں ایک، دو بار پڑھی ہو گی... وہ تہجد کی نمازیں پڑھنے لگے... ماننے میں نہیں آتا... یقیناً بھابھی نے کوئی خواب دیکھا ہو گا یا پھر وضو نہیں ہو گا۔" سمیر نے انگلی سے اسکی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"زندگی میں کبھی کبھی ایسے حالات اور وقت بھی آتا ہے کہ انسان بالکل بدل جاتا ہے... اور اسکے اندر سے ایک نیا انسان جنم لیتا ہے..." تبریز کے چہرے پہ اب بلا کی سنجیدگی چھا گئی تھی جسے دیکھ کر سمیر اندر تک ہل گیا تھا کیونکہ اس نے اسکی کیفیت اپنے دوست کے چہرے پہ اس وقت بھی نہیں دیکھی تھی جب وہ رومیسہ کی جدائی میں تڑپا پھرتا تھا تو پھر اب اپنی محبت پا کر بھی اسکے چہرے پہ یہ بے اطمینانی کیسی تھی جو سمیر کی سمجھ سے باہر تھی۔

☆......☆......☆

"روحی میری جان... کیسی ہو تم؟" آج بہت دنوں بعد روحی نے اپنی ماں کو فون کیا تو انہوں نے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں... آپ اور ابو کیسے ہیں؟" روحی نے کہا۔

"وہ بھی ٹھیک ہیں... تم بتاؤ کہاں مصروف تھی اتنے دن سے...؟" امی نے پوچھا۔

"مصروف تو اتنی نہیں تھی لیکن کچھ دن سے طبیعت ٹھیک نہیں... آج صبح تبریز کو آفس بھیج کر میں ناشتہ کرنے لگی تو دل متلی کر رہا تھا۔" روحی نے بتایا۔

"اوہ... تم نے ڈاکٹر کو چیک کروایا؟" امی نے پوچھا۔

"نہیں امی... میں سوچ رہی تھی ایک، دو دن کے لئے آپکے پاس آجاؤں پھر ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔" روی نے کہا۔

"ہاں میری جان ضرور... تم آجاؤ میں خود تمہیں لیکر چلوں گی۔" امی نے کہا۔

"آپ اور ابو اتنے دن سے نہیں آئے مجھے ملنے... میں آپ دونوں کو بہت مس کر رہی ہوں۔" روی نے اُداس لہجے میں کہا۔

"بس بیٹا کہیں نکلنا نہیں ہوتا... تمہارے ابو تو بس اخبار اور ٹی۔وی میں ہی مصروف رہتے ہیں۔" امی نے کوفت بھرے لہجے میں کہا۔

"میں خود آج کل بس سستی کی وجہ سے لیٹی رہتی ہوں یا سوئی رہتی ہوں... کچھ کھایا پیا بھی نہیں جاتا ٹھیک سے..." روی نے کہا۔

"کہیں میں نانی تو نہیں بننے والی...؟" روی کی امی نے پُر جوش انداز میں سوال کیا تو روی شرما گئی اور زیرِ لب مسکرا دی۔

"ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو..." روی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے میری بیٹی کی گود ہری کر دی..." امی خوشی سے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔

"ارے امی... پہلے کنفرم تو ہونے دیں..." روی نے شرمیلے لہجے میں کہا۔

"کنفرم بھی ہو جائے گا... تم نے تبریز کو بتایا...؟" امی نے پوچھا۔

"نہیں امی... ابھی نہیں بتایا جب کنفرم ہو جائے گا پھر بتاؤں گی۔" روی نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر کل تم آجاؤ... میں ڈاکٹر طاہرہ سے اپائنمنٹ لے لیتی ہوں کل کی۔" امی نے کہا۔

"جی ٹھیک ہے میں صبح آجاؤں گی..." روی نے کہا۔

"چلو اپنا خیال رکھنا... اور وقت پہ آجانا میں کل دوپہر کا وقت لوں گی ڈاکٹر سے۔" امی نے کہا۔

"جی امی... خدا حافظ۔" روی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ ماں بننے کے احساس نے روی کے رگوں میں خوشی کی ایک نئی لہر دوڑا دی تھی۔ وہ خوشی سے مسکرا رہی تھی اور آنے والے وقت کو سوچ کر خوش ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی جب تبریز کو معلوم ہوگا کہ وہ باپ بننے والا ہے تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ اُسے بچے بہت پسند ہیں وہ تو خوشی سے پھولے نہیں سمائے گا۔ صبح سے شام تک تبریز کا انتظار کرتے گزر گئی لیکن تبریز رات کو دیر سے گھر لوٹا تھا۔

"آج اتنی دیر کیوں کر دی آپ نے...؟" روی دروازے پہ اُس کا انتظار کر رہی تھی تبریز گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جیسے ہی اُسکے قریب آیا اُس نے بے تابی سے پوچھا۔

"آج ایک فارن ڈیلیگیشن کو سائٹ وزٹ کروانی تھی اسلئے میں اور رضا بھائی اُنہیں لے کر سائٹ پہ گئے ہوئے تھے اسلئے واپسی میں رات ہو گئی..." تبریز کے لہجے میں تھکن واضح تھی۔

"اوہ... میں نے کال بھی کی تھی لیکن آپ نے ریسو نہیں کی.." روبی نے اُسکے کندھوں سے کوٹ اُتارتے ہوئے کہا۔

"ہاں وہ میرے سیل فون کی بیٹری ڈیڈ پوائنٹ پہ تھی اسلئے... آئم سوری.." تبریز نے خجالت سے کہا کیونکہ اس سے پہلے کبھی اُس نے ایسی لاپرواہی نہیں دکھائی تھی۔

"کوئی بات نہیں.." روبی نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"چلو کھانا لگواؤ... بہت بھوک لگ رہی ہے.. میں نے وہاں ڈنر نہیں کیا کیونکہ میں تمہارے ساتھ کرتا ہوں۔" تبریز نے اُسے خوش کرنے کے لئے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ فریش ہو جاؤ... میں بھی آپکا انتظار کر رہی تھی۔" روبی نے کہا اور کچن کی طرف چل دی۔ کچھ دیر بعد تبریز فریش ہو کر آ گیا تھا جب روبی ٹیبل پہ کھانا لگا رہی تھی۔

دونوں ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگے۔

"آج امی کا فون آیا تھا.." روبی نے بات شروع کی۔

"اوہ اچھا... کیسے ہیں امی ابو؟" تبریز نے خوشی سے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں... مجھے بہت یاد کر رہے ہیں.. ان فیکٹ کل امی نے مجھے کہا ہے کہ میں سارا دن کے لئے اُنکے پاس رہوں۔" روبی نے بات بتاتے ہوئے کہا۔

"ہاں... ضرور جاؤ.. اکلوتی بیٹی ہو اُنکی.. اُنکا اور ہے کون جسے وہ یاد کرینگے؟" تبریز نے خوشگوار لہجے میں کہا تو روبی مسکرا دی۔

"ٹھیک ہے پھر آپ مجھے صبح آفس جاتے ہوئے ڈراپ کر جانا.." روبی نے مسکراتے ہوئے خوشی سے کہا۔

"ضرور میری جان... چلو اب ٹھیک سے کھانا کھاؤ.. میں بہت دن سے نوٹ کر رہا ہوں آجکل تم ٹھیک سے کھاتی پیتی نہیں..." تبریز نے اُسکی خالی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں تو... میں کھا رہی ہوں..." روبی نے جلدی سے اپنی پلیٹ میں چاول ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک سے کھاؤ..." تبریز نے اُسے حکم دینے والے انداز میں کہا۔

"کھا رہی ہوں..." روبی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا تو تبریز کو ہنسی آ گئی۔

☆......☆......☆

تبریز اگلی صبح آفس جاتے ہوئے روحیہ کو اُسکی امی کے پاس ڈراپ کر کے خود ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے چلا گیا۔ روبی اور اُسکی امی وقت پہ ہسپتال پہنچ چکے تھے اور اب ویٹنگ روم میں اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔

"روبی بیٹا تم خوش ہو ناں تبریز کے ساتھ...؟" امی نے روبی کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی امی.. ایسے کیوں پوچھ رہی ہیں آپ...؟" روی کو امی کا سوال بہت عجیب اور بے تکا سا لگا تھا۔

"میرا مطلب ہے وہ تمہارے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے ناں..مزاج کیسا ہے اُسکا؟" امی نے تفصیل سے پوچھا۔

"جی امی.تبریز بہت اچھے ہیں اور میرا بہت خیال رکھتے ہیں...لیکن وہ کچھ بدل سے گئے ہیں اب.." رومیسہ نے کہا۔

"کیا مطلب بدل گیا ہے...؟" امی کو تشویش ہوئی۔

"جب ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے تو تبریز کا لائف سٹائل اور تھا...وہ بہت غیر مذہبی قسم کا انسان تھا لیکن اب وہ پانچ وقت کی نماز کے علاوہ..تہجد بھی باقاعدگی سے پڑھتے ہیں اور میں نے اکثر تبریز کو سجدوں میں گر گر کر روتے بلکتے دیکھا ہے..." رومیسہ کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔

"تو میری بچی اس میں پریشانی کی کیا بات ہے...؟ اچھا ہے ناں کہ وہ نماز پڑھتا ہے.. پرہیزگار ہو گیا ہے..." امی نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے امی۔ لیکن اس قدر شدت اُس میں کیسے آ گئی ہے.. وہ گھنٹوں سجدوں اور دعاؤں میں گڑگڑا کر روتا اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے..میں جب سو جاتی ہوں تو وہ چپکے چپکے رات کو اُٹھ کر نماز پڑھتا ہے اور فجر کی نماز کے بعد سوتا ہے۔" روی نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

"وقت اور حالات انسان کو بدل دیتے ہیں بیٹا...اور یہ تو اچھی بات ہے کہ وہ اپنے رب سے اتنے قریب ہو گیا ہے...ویسے بھی اُسے تم جیسی شریکِ حیات ملی ہے اُسے اپنے رب کا شکر گزار ہونا بھی چاہیے..." امی نے مسکراتے ہوئے اُسے سمجھایا۔ ابھی وہ دونوں باتیں ہی کر رہی تھیں کہ اُنکا نمبر آ گیا۔ ڈاکٹر نے چیک اَپ کے بعد ایک بلڈ ٹیسٹ کروانے کو بولا جسکی رپورٹ ایک گھنٹے بعد ملی۔

"آپکی رپورٹس پازیٹو (Positive) ہیں۔Congratualtions you are pregnant" ڈاکٹر نے روی کو خوشگوار لہجے میں بتایا۔

"یا اللہ تیرا شکر ہے... کتنی خواہش تھی ہمیں کہ اپنی اکلوتی بیٹی کی اولاد کو اپنے ہاتھوں میں کھلائیں گے۔" روی کی امی نے ڈاکٹر کے کنفرم کرنے کے بعد خوشی سے کہا تو روی شرما گئی۔

"یہ میں کچھ میڈیسن لکھ رہی ہوں... ابھی آرلی منتھس میں آپکو بہت احتیاط کرنی ہوگی اور اپنی وائٹ کا خاص خیال رکھیں.. بلکہ ایک وائٹ پلان بنا کر دے رہی ہوں جس میں ملٹی وٹامنز بھی ساتھ لینے ہونگے....اسکو آپ تھری منتھس تک فالو کریں گی۔" ڈاکٹر نے پرسکرپشن لکھتے ہوئے کہا۔

"جی ٹھیک ہے۔" روی نے کہا اور ڈاکٹر نے پرچی اُسکی امی کو پکڑا دی۔ دونوں خوشی خوشی میڈیسن لیکر گھر کی طرف چل دیں۔ روی کے قدم زمین پہ نہیں پڑ رہے تھے وہ بے حد خوشی محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ جلد سے جلد یہ خوشخبری تبریز کو سنانا چاہتی تھی اور اُسکے چہرے پہ خوشی کے رنگ بکھرتے دیکھنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

میٹنگ کے بعد تبریز آفس میں بالکل فارغ تھا۔ آج اُسکے سر میں صبح سے درد ہو رہا تھا اسلئے اُس نے سوچا کیوں نہ گھر جا کر آرام کیا جائے پھر شام کو رومیسہ کو اُسکی امی کے گھر سے پک کر لے گا۔ یہی سوچ کر وہ آفس سے نکل آیا۔ ابھی وہ ڈرائیو کرتا ہوا گھر کے راستے میں ہی تھا کہ موبائل کی رنگ ٹون بجی۔ فون کی سکرین پہ سمیر کا نام جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو..." تبریز نے فون کان کو لگا کر کہا۔

"کیسے ہو جگر...؟" دوسری طرف سمیر کی خوشگوار آواز آئی۔

"بس سر میں کچھ درد تھا اسلئے آفس سے گھر جا رہا ہوں راستے میں ہوں۔" تبریز نے اُسے بتایا۔

"اوہ... میں تو سوچ رہا تھا آج کہیں باہر ملاقات ہو جائے...؟" سمیر نے کہا۔

"باہر تو نہیں... لیکن تم گھر آ جاؤ میں گھر ہی جا رہا ہوں..." تبریز نے کہا۔

"گھر پہ تو بھابھی ہونگی... میں چاہ رہا تھا اکیلے میں ملاقات ہو۔" سمیر نے کہا۔

"رومیسہ اپنی امی کے گھر گئی ہوئی ہے رات دیر سے اُسے لینے جاؤں گا۔ تم گھر ہی آ جاؤ۔" تبریز نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے... تم پہنچو میں آتا ہوں۔" سمیر نے کہا اور تبریز نے فون بند کر دیا۔ تبریز گھر پہنچ کر شاور لیکر نماز پڑھنے لگا۔ کچھ ہی دیر میں سمیر بھی پہنچ چکا تھا۔ دونوں بیٹھے چائے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

"اور کتنے دن کے لئے ہو تم یہاں...؟" تبریز نے سمیر سے پوچھا۔

"بس ایک ہفتے بعد واپس چلا جاؤں گا ڈیوٹی پہ..." سمیر نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"سمیر تم میرے سب سے قریب اور قریبی دوست ہو... تم نے ہمیشہ میری مدد کی ہے۔" تبریز کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا۔

"کیا بات ہے تبریز... تمہیں کیا چیز پریشان کر رہی ہے میرے دوست...؟" سمیر نے اُسے اُلجھا ہوا دیکھ کر پوچھا۔

"احساسِ جرم... احساسِ ندامت... احساسِ گناہ..." تبریز نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو تبریز... کیسا جرم... کیسا گناہ...؟؟؟" سمیر کو حیرانگی ہوئی۔

"مجھ سے بہت بڑا گناہ ہو گیا ہے سمیر... گناہِ کبیرہ..." تبریز نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

"کیا کیا ہے تم نے... ایسا کیا ہو گیا تبریز... مجھے بتاؤ... پریشان نہیں کرو... کھل کر بتاؤ..." سمیر اُسکی بات سن کر کچھ بوکھلا سا گیا۔

"مجھ سے قتل... قتل ہو گیا ہے سمیر..." تبریز نے روتے ہوئے اُسے بتایا۔

"اوہ میرے خدا... یہ تم کیا کہہ رہے ہو تبریز... کس کا قتل...؟؟؟" سمیر کی سماعتوں پہ تبریز کے الفاظ بجلیاں گرا گئے تھے۔

"رومیسہ کے پہلے شوہر کا..." تبریز نے زار و قطار روتے ہوئے کہا تو سمیر کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا اور وہ جہاں بیٹھا تھا وہیں بیٹھا اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا۔

☆......☆......☆

"مما... بھائی کو گزرے ایک سال ہو گیا ہے... اور آپ آج بھی یوں روتی ہیں جیسے وہ کل فوت ہوا ہو..." شہلا نے ماں کو اشعر کی تصویر سینے سے لگا کر روتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

"تم کہہ سکتی ہو... تم ماں نہیں ہو ناں... مجھ سے پوچھو کہ مجھ پہ کیا گزرتی ہے۔" اشعر کی ماں نے سسکیاں بھرتے ہوئے بیٹی سے کہا۔

"مما ایسے روتے رہنے سے بھائی واپس تو نہیں آ جائے گا ناں..." شہلا نے بے بسی اور رنج کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔

"ابھی تو چند مہینے ہوئے تھے میرے لعل کے سر پہ سہرا سجے... ابھی تو اُسکے بچوں کی دادی بننا تھا میں نے..." اشعر کی ماں یہ کہتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مما پلیز... حوصلہ کریں... ہمارے آنسو اور ہماری تکلیف اشعر بھائی کو واپس نہیں لا سکتی..." شہلا نے ماں کو بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"ہائے میرا تو ایک ہی بیٹا تھا.... وہ بھی کسی ظالم نے مجھ سے چھین لیا..." اشعر کی ماں روتے ہوئے بین کرنے لگیں۔

"مما... خود کو سنبھالیں پلیز..." شہلا بھی اب رونے لگی تھی۔

"اُسکی کوئی اولاد ہوتی تو بھی میرے دل کو قرار آ جاتا اپنے اشعر کی زندہ نشانی دیکھ کر... لیکن میرے نصیب میں تو یہ بھی نہ تھا..." اشعر کی ماں نے اذیت بھرے لہجے میں کہا۔

"کاش بھائی کو کچھ نہ ہوتا تو آج ہم سب کتنے خوش ہوتے..." شہلا نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا۔

"خدا غارت کرے... برباد کرے اُسے جس نے میرے اشعر کی جان لی... تباہ ہو جائے وہ ٹرک والا جسکی زد میں آ کر میرے بچے کی جان گئی..."

اشعر کی ماں جھولی اُٹھا کر بددعائیں دے رہی تھی اور شہلا کے گلے لگ کر روئے جا رہی تھیں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھونے کی تکلیف دنیا کا کوئی شکوہ کم نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو ایک ماں ہی جانتی ہے کہ اُسکے لیے اولاد کیا ہوتی ہے۔ اولاد کا غم ماں باپ کے لیے کسی سوہانِ روح سے کم نہیں ہوتا۔ اشعر کی وفات کو ایک سال ہو چکا تھا لیکن اُسکے گھر میں آج بھی اُس دن جیسی سوگوار فضا تھی جس دن اشعر کی ڈیڈ باڈی گھر آئی تھی۔ اشعر کی ماں ہر وقت رو رو کر اُسے یاد کرتی رہتی تھیں اور اپنے لختِ جگر کی موت کے ذمہ داروں کو بددعائیں دیا کرتی تھیں۔

☆......☆......☆

"امی... میں گھر جانا چاہتی ہوں..." رومی نے ماں کو کہا۔

"ارے اتنی جلدی... تبریز تو تمہیں رات کو لینے آنے والا ہے اور تم ابھی سے جانے کا کہہ رہی ہو...؟" امی نے حیرانگی سے پوچھا۔

"بس امی... مجھ سے رہا نہیں جا رہا... میں جلد از جلد تبریز کو یہ خوشخبری سنانا چاہتی ہوں..." رومیسہ نے خوشی اور جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے.. میں ڈرائیور کو کہتی ہوں تمہیں گھر چھوڑ آئے.. تمہارے ابو تو صبح سے جنگ گئے ہوئے ہیں۔" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی.. آپ ڈرائیور سے کہیں گاڑی نکالے.. میں اپنا ہینڈ بیگ لے آؤں۔" روی نے ماں کو کہا اور لاؤنج سے اپنا بیگ اُٹھا کر باہر پورچ میں آ گئی۔

"اچھا امی.. میں جا رہی ہوں.. خدا حافظ۔" روی ماں سے گلے مل کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ اُسکی امی اُسے جاتا دیکھ کر مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلا رہی تھیں پھر وہ گیٹ بند کر کے اندر چلی گئیں۔ روی کا چہرہ خوشی سے گلال ہو رہا تھا اور وہ تمام راستے میں یہی سوچتی رہی کہ وہ تبریز کو یہ خبر کیسے سنائے گی اور وہ اُسکی بات پہ کس طرح ردعمل ظاہر کرے گا۔ ہاتھ میں اپنی پریگنینسی کی رپورٹ تھامے وہ بار بار اُسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ کبھی اپنے پیٹ پہ ہاتھ لگا کر خود کو یقین دلاتی تھی تو کبھی کچھ سوچ کر مسکرا دیتی تھی۔ اس نے تو کئی بار نام بھی سوچے تھے لیکن پھر یہ کام تبریز کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ ابھی سوچوں میں گھر کب آ گیا اُسے پتہ ہی نہیں چلا۔ "رومیسہ بی بی... آپکا گھر آ گیا۔" ڈرائیور نے کہا تو روی اپنے خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔ "اوہ... اچھا۔" رومیسہ نے کہا اور جلدی سے پرس سے گھر کی چابیاں نکالیں اور گاڑی سے اُتر کر اندر داخل ہو گئی۔ تبریز کی گاڑی کھڑی دیکھی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ گھر آ چکا تھا۔ روی کو اور خوشی ہوئی کہ آج تبریز گھر جلدی آ گیا ہے اب وہ اُسے یہ خوشخبری سنائے گی۔ وہ جلدی سے داخلی دروازہ عبور کرتی ہوئی بیڈروم کی طرف گئی لیکن تبریز وہاں نہیں تھا۔ پھر اُسے ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ وہ اُسی طرف آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی ڈرائنگ روم کے پاس پہنچی لیکن اس سے پہلے کہ وہ اندر داخل ہوتی تبریز کے الفاظ نے اُس کے قدم روک دیئے۔ "مجھے سکون نہیں ملتا سمیر... گناہ کا احساس ہر وقت میرے دل کو کچوکے لگاتا رہتا ہے.. میں روی کو دیکھتا ہوں تو میرے سامنے اُس رات کے تمام مناظر گھوم جاتے ہیں۔ سوتا ہوں تو جہنم کی آگ میں خود کو جلتا محسوس کرتا ہوں... میں خدا سے گڑگڑا کر معافی مانگتا ہوں لیکن مجھے سکون نہیں ملتا۔" تبریز روتے ہوئے سمیر سے کہہ رہا تھا۔ رومیسہ کو سمجھ نہیں آئی کہ وہ کس گناہ کی بات کر رہا ہے اور کس رات کے مناظر کا ذکر کر رہا ہے۔ "تم نے جسے قتل کیا ہے جب تک اُسکے وارثین سے معافی طلب نہیں کرو گے اور جب تک اپنے گناہ کا اعتراف کر کے مقتول کے وارثوں کو معافی کے لئے راضی نہیں کر لیتے تب تک تمہیں خدا سے بھی معافی نہیں ملے گی تبریز..." سمیر نے تبریز کو کہا لیکن اُسکے الفاظ باہر کھڑی رومیسہ کی سماعتوں پہ ہتھوڑے کی طرح برسے تھے۔ "اوہ میرے خدا... تبریز نے کسی کا قتل کیا ہے.. تبھی وہ راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر خدا سے سجدوں میں گر کر معافی طلب کرتا تھا... لیکن اُس قتل کا مجھ سے کیا تعلق ہے...؟" روی نے دل ہی دل میں سوچا۔

"میں کیسے معافی مانگوں... اور کس سے مانگوں... رومیسہ کو کیسے بتاؤں کہ اُسکے شوہر کی جان لینے والا میں تھا... اُنہیں اُس رات ہسپتال پہنچانے والا میں تھا۔ اُسکے شوہر کو ہسپتال پہنچنے سے پہلے ختم کرنے والا بھی میں تھا... کیسے بتاؤں گا اُسے میں یہ سب.. کیسے اعتراف کروں اور کیسے معافی مانگوں میں..." تبریز نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ باہر کھڑی رومیسہ پہ حیرت اور دُکھ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ اُسے اپنے زمین و آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ "اے میرے خدا... یہ میں کیا سن رہی

رہوں..'' رومیسہ سے کھڑے ہونا دشوار ہو رہا تھا اُسے اپنے پیروں سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔وہ وہیں دیوار کی اوٹ میں سہارا لے کر بے خودی کھڑی تھی۔'' تبریز...یار خود کو سنبھالو... تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہے..تم نادم ہو اور توبہ کر چکے ہو اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے..توبہ گناہ کو مٹا دیتی ہے تبریز۔'' سمیر نے اُسے کندھوں سے تھام کر سمجھایا۔'' تو پھر مجھے سکون کیوں نہیں ملتا...کیوں مجھے جہنم کی آگ دکھائی دیتی ہے..کیوں میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے..کیوں؟'' تبریز نے بے بسی سے کہا۔'' کسی بھی باضمیر انسان پہ گناہ کا بوجھ زیادہ دیر تک چھپا نہیں رہتا۔اگر اس سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اُسکا ضمیر اُسے ملامت کرتا ہی رہتا ہے جب تک وہ اپنے گناہ کا اعتراف کر کے شرمسار ہو کر اُسکا مداوا نہیں کر لیتا...ضمیر کی ملامت سے اُسکی جان نہیں چھوٹ پاتی۔'' سمیر نے کہا۔'' مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا...میں کیسے مداوا کروں اپنے گناہ کا...میں تو اُسکا نام تک نہیں جانتا تھا بس رومیسہ کو پانے کی خاطر میں نے اُسکی ڈوبتی ہوئی سانسوں کو ہمیشہ کے لئے روک دیا۔اس رات قدرت نے میرا امتحان لینے کے لئے مجھے اُن سے ملوایا تھا۔لیکن میں نے اپنے لئے گناہ اور کبھی نہ ختم ہونے والی اذیت کو چن لیا..اب شاید میری یہی سزا ہے کہ جب تک جیوں اسی احساسِ ندامت کے ساتھ جیوں جو مجھے اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کرتا جا رہا ہے۔'' تبریز نے کرب بھرے انداز میں کہا۔

'' خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو تبریز...غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔'' سمیر نے کہا۔

'' ہاں..اور اُن غلطیوں کا خمیازہ ہمیں بھگتنا ہی ہوتا ہے..اور بعض غلطیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا کفارہ ہمیں عمر بھر ادا کرنا پڑتا ہے۔'' تبریز نے کہا۔

'' تم خود کو سنبھالو پلیز...میں کچھ کرتا ہوں..کسی مفتی صاحب سے مل کر اُن سے تمہارے لئے کوئی فتویٰ لیتا ہوں..ایسا حل نکالتے ہیں کہ جس سے تمہارا بھرم بھی رہ جائے اور تلافی بھی ہو جائے...'' سمیر نے کہا۔

'' پتہ نہیں یہ تلافی کس طرح ہو گی...'' تبریز نے پریشان کُن لہجے میں کہا۔

'' میں اب چلتا ہوں اور کچھ کرتا ہوں اس سلسلے میں...'' سمیر نے جانے کے لئے مصافحہ کیا اور ڈرائنگ روم کے بیرونی سمت کے دروازے سے باہر نکل گیا۔تبریز اپنے آنسو پونچھتا ہوا ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے نکلنے لگا تو باہر کھڑی رومیسہ کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔'' تت..تم کب آئی..؟'' تبریز بُری طرح بوکھلا گیا۔رومیسہ کے چہرے پہ نفرت اور کرب کا احساس واضح تھا اور یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ سب کچھ سن چکی ہے۔'' جب تم اپنے گناہ کا اعتراف کر رہے تھے...'' یہ کہتے ہوئے رومیسہ کی آنکھوں میں تبریز کے لئے نفرت اُتر آئی تھی اور اُسکی آنکھوں سے کرب کے دو آنسو بہہ کر اُسکے رخساروں پہ بکھر گئے تھے۔'' رومی...میری جان...پلیز میری بات ایک بار سن لو پھر کوئی فیصلہ کرنا۔'' تبریز نے اُسکے چہرے سے آنسو صاف کرنے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن رومی نے اُسے نفرت سے جھٹک دیا اور منہ موڑ کر بیڈروم کی طرف بڑھ گئی۔رومی کے ہاتھ سے اُسکی پریگننسی رپورٹ نکل کر تبریز کے پیروں میں آ گری۔تبریز نے سر جھکا کر دیکھا تو فوراً اُٹھا کر پڑھنے لگا۔لفافے پہ میڈیکل رپورٹ کا عنوان تھا اور اندر کاغذ میں اُسکی رپورٹس میں پریگننسی کے سامنے پازیٹو لکھا ہوا پڑھ کر تبریز پہ شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔وہ تیزی سے بیڈروم کی طرف بڑھا۔رومیسہ الماری سے اپنے

کپڑے نکال کر ایک سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ "روی... یہ تم کیا کر رہی ہو...؟" تبریز نے اُسے یہ سب کرتے دیکھ کر کہا۔ "وہی جو مجھے کرنا چاہیے..." روی نے تلخی سے کہا۔ "روی پلیز... میری بات سنو.. چھوڑو یہ سب..." تبریز نے اُسے بازو سے پکڑتے ہوئے کہا۔ "ہاتھ مت لگاؤ مجھے... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اس قدر گھٹیا انسان ہو.. اس قدر مکروہ اور غلیظ انسان..." روی نے نفرت بھرے لہجے میں کہہ کر ایک جھٹکے سے اپنا بازو اُس سے چھڑوا لیا۔ "روی.. مجھے مارو.. مجھ پہ غصہ کرو... مجھے برا بھلا کہو... لیکن پلیز مجھے چھوڑ کر نہ جانا.. تمہیں ہماری ہونے والی اولاد کا واسطہ ہے..." تبریز نے اُسکے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "میں ایک قاتل کے ساتھ ایک چھت تلے زندگی نہیں گزار سکتی... اور قاتل بھی وہ جس نے میرے اشعر کی جان لی... مجھے دنیا کی نظر میں منحوس بنا دیا... میری ہنستی بستی دنیا اُجاڑ دی.. اور تم کہتے ہو کہ میں تمہارا گھر آباد کروں... ہرگز نہیں..." رومیسہ رو رہی تھی اور چلا رہی تھی۔ "روی... ایسا مت کہو.. مجھ سے غلطی ہو گئی.. میں خود غرض ہو گیا تھا... تمہیں اپنے سامنے دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے اُسے راستے سے ہٹانے کے لئے ایسا کیا... صرف اور صرف تمہیں پانے کے لئے..." تبریز نے روتے ہوئے اُس سے کہا۔

"نہیں... تم نے میرے اشعر کا قتل کیا ہے... تم قاتل ہو اور میں ایک قاتل کی بیوی بن کر نہیں جی سکتی اور نا ہی ایک قاتل کے بچے کو جنم دے سکتی ہوں... مجھے نفرت ہے تم سے... سنا تم نے... نفرت..." رومیسہ نے چلاتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تبریز اُسے پکارتا ہوا اُسکے پیچھے بھاگا لیکن وہ نہیں رُکی۔ وہ تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی گھر سے باہر نکل گئی۔ "روی... تمہیں خدا کا واسطہ ہے خود اور میرے بچے کو کچھ نہ کرنا... میں ہر سزا بھگتنے کے لئے تیار ہوں.. خدا کے لئے رُک جاؤ میری بات سنو..." تبریز اُسے پیچھے سے پکار رہا تھا۔ روی نے اُس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئے وہ مین روڈ پہ نکل آئی۔ "روی پلیز... جو ہو گیا اُسے میں بدل نہیں سکتا لیکن میں اپنے کیے پہ شرمندہ ہوں اور توبہ کر چکا ہوں... خدا کے لئے مجھے معاف کر دو... اس بچے کی خاطر معاف کر دو... تمہیں کبھی مجھ سے بھی تو محبت تھی.. اُس محبت کی خاطر مجھے معاف کر دو..." تبریز دوڑتا ہوا اُسکے سامنے آ کر کہنے لگا اور اُسکا ہاتھ تھام لیا۔ آس پاس سے گاڑیاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ "ہٹ جاؤ میرے راستے سے... میں تمہارا چہرہ بھی اب دیکھنا نہیں چاہتی۔" رومیسہ نے اُسے اپنے راستے سے دھکا دے کر ہٹایا اور تیز تیز بھاگنے لگی۔ "روی... رُک جاؤ... روی گاڑیاں بہت تیز چل رہی ہیں... رُک جاؤ...... روی...." تبریز بھی اُسکے پیچھے دوڑنے لگا لیکن وہ نہ رُکی۔ وہ روئے جا رہی تھی اور بھاگتی جا رہی تھی۔ تبریز اُسے جتنی آوازیں دے رہا تھا اُسکی رفتار میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ بھاگتی ہوئی سڑک پہ دوسری جانب مُڑ رہی تھی کہ ایک تیز رفتار کار کی ٹکر نے اُسے ہوا میں اُچھال کر دور لے جا پھینکا۔ "روی......." ایک دل خراش چیخ تھی جو تبریز کے منہ سے نکل کر پوری فضا میں پھیل گئی تھی اور وہ وہیں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ سامنے رومیسہ کا خون میں لت پت وجود ایک بار پھر اُس کے حواس معطل کر گیا۔ اُسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اور لوگوں کی بڑھتی ہوئی بھیڑ میں روی کا وجود اُسکی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

باب نمبر ۸

احمد کامران اور صبیحہ بیگم اپنی بیٹی کو تیمور اور اُسکی ماں کے چنگل سے چھڑوا لائے تھے لیکن اپنی بیٹی کا گھر نہ بسا پانے کا دُکھ اُنکو اندر ہی اندر دیمک کی طرح چاٹنے لگا تھا۔ تیمور نے جو وحشیانہ سلوک اُنکی پھولوں جیسی بیٹی کے ساتھ روا رکھا تھا وہ اُس پہ خود کو ذمہ دار اور قصوروار سمجھنے لگے تھے۔ ایک ملال تھا جو دل میں ایک خلش بن کر چبھتا تھا۔ ہر پل اپنی بیٹی کے اُداس چہرے کا رنج اُنکے لئے سوہانِ روح بن چکا تھا۔

"مجھ سے عرشی کے چہرے کی اُداسی نہیں دیکھی جاتی صبیحہ..." کامران احمد نے بیوی سے کہا۔ دونوں اپنے بیڈروم میں لیٹے اپنی چہیتی کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

"میری بچی... خود ہی سہتی رہی سب کچھ... نہ کوئی گلہ نہ کوئی شکایت... بس چپ چاپ خود پہ ظلم سہتی رہی اور ہمیں خبر تک نہ ہونے دی۔" صبیحہ بیگم نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"وہ لوگ ایسے ذلیل اور کمینے نکلیں گے میں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا.. عرشی کا سارا زیور بیچ کھایا.. اُسکے بنک بیلنس پہ عیاشیاں کرتے رہے اور وہ چپ چاپ اپنا گھر بچانے کی خاطر سب کچھ برداشت کرتی رہی..." کامران احمد نے افسوس سے کہا۔

"دُکھ کی بات تو یہ ہے احمد صاحب کہ ہماری بچی نے اتنے ظلم سہے.. اُن لوگوں کی خاطر اتنی قربانی دی لیکن پھر بھی اُنہوں نے اُسکی قدر نہ کی... خدا غارت کرے اُس تیمور کو اور اُسکی ماں کو... ہاتھ ٹوٹیں اُنکے جن سے وہ میری بچی کو تکلیف دیتے تھے۔" صبیحہ بیگم نے روتے ہوئے بددعا دی۔

"جو لوگ دوسروں کی بیٹیوں کی زندگی اجیرن کرتے ہیں... اُنکی اپنی بیٹیاں بھی کبھی خوشحال نہیں رہتیں.. اپنے بویا ہوا پھر اُنکو کاٹنا ہی پڑتا ہے صبیحہ بیگم..." کامران احمد نے دکھ اور افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

"ہماری بچی کا مقدر ہی خراب تھا۔ پہلے شادی نہیں ہوتی تھی اور جب اتنی کوششوں کے بعد ہوئی بھی تو اُسکا گھر نہ بس سکا.." صبیحہ بیگم نے کہا۔

"نہیں... اُسکا مقدر برا نہیں تھا... غلطی تو ہم سے ہوئی تھی جو ہم اُن لوگوں کے لالچ اور گھٹیا پن کو پہچان نہ سکے۔.. ہماری سب سے بڑی غلطی ہی اُن سے رشتہ جوڑنا تھا ورنہ عرشی کا اُس سے کوئی جوڑ نہیں بنتا تھا... ہم ہی اندھے ہو گئے تھے بس.. اپنی ذمہ داری سے جلد سبکدوش ہونے کے لئے ہم نے اپنی بچی کو ذلالت میں ڈال دیا... اپنی بچی کو اُن کمینے لوگوں کے رحم و کرم پہ چھوڑ دیا..." کامران صاحب نے رنج و ملال سے کہا تو اُنکی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"والدین اپنی اولاد کے لئے اچھا ہی سوچتے ہیں.. جو بھی کرتے ہیں اُنکی بھلائی سمجھ کر ہی کرتے ہیں.. بس نہیں دے سکتے تو قسمت نہیں دے سکتے..." صبیحہ بیگم نے کہا۔

"ہاں سچ کہتی ہو... ہم نے اپنی بیٹی کو کیا نہیں دے کر بھیجا تھا.. بس ایک قسمت ہی تھی جو ہم خرید کر نہ دے سکے..." کامران صاحب نے بے بسی سے کہا۔

"میں جب اُسکی بے رونق آنکھوں میں جھانکتی ہوں تو میرا کلیجہ کٹنے لگتا ہے ... یوں لگتا ہے جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔" صبیحہ بیگم نے اپنی کیفیت بتاتے ہوئے کہا۔

"تم ماں ہو تمہیں تو ایسا لگے گا... لیکن مجھ پہ کیا گزرتی ہے یہ ایک باپ ہی جان سکتا ہے... میں خود کو کتنا بے بس اور قصوروار محسوس کرتا ہوں تم نہیں جانتی.. اس سے تو بہتر تھا کہ میں عمر بھر اُسے اپنے سینے سے لگا کر رکھتا.. میری پھولوں جیسی بچی اُن بدبختوں کی ٹھوکروں میں تو نہ آتی..." کامران صاحب نے درد بھرے انداز میں کہا۔

"اچھا... آپ زیادہ دل پہ بوجھ نہ لیں.. آپکی طبیعت بگڑ جائے گی۔" صبیحہ بیگم نے شوہر کو اس قدر ملال میں ڈوبا ہوا دیکھ کر فکرمندی سے کہا۔

"یہ بوجھ تو شاید میرے ساتھ قبر تک جائے گا..." کامران صاحب نے کہا تو آنکھیں موند لیں لیکن صبیحہ بیگم کو اُنکے الفاظ اندر تک ہلا گئے تھے۔

☆.....☆.....☆

"عرشی..... شیراز... جلدی آؤ.. دیکھو تمہارے ابو آنکھیں نہیں کھول رہے۔" صبیحہ بیگم کی آواز پہ ڈائننگ ٹیبل پہ بیٹھے عرشیہ اور شیراز ہڑبڑا کر کمرے کے جانب لپکے تھے۔

"کیا ہوا... امی کیا ہوا ابو کو...؟" عرشیہ جلدی سے ماں کی جانب آتے ہوئے بولی۔

"پتہ نہیں... میں کب سے اُنہیں جگانے کی کوشش کر رہی ہوں.. آنکھیں نہیں کھول رہے نہ اپنی جگہ سے ہل رہے ہیں۔" صبیحہ بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

"ابو... ابو... ابو اُٹھیں.. ابو آنکھیں کھولیں.." شیراز کامران صاحب کو زور زور سے ہلا کر کہہ رہا تھا لیکن اُنکا جسم بے جان تھا اُس میں کوئی حرکت نہیں تھی۔

"ابو پلیز.. آنکھیں کھول کر مجھے دیکھیں... مجھ سے بات کریں...." عرشیہ نے روتے ہوئے باپ کو ہلاتے ہوئے کہا لیکن کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ "شیراز بھائی... دیکھیں ناں ابو کو کیا ہوا ہے.. ڈاکٹر کو فون کریں.. ایمبولینس کو بلائیں.. آپ خاموش کیوں کھڑے ہیں.. جلدی کریں.." عرشیہ نے شیراز کو کہا جو سکتے کی سی حالت میں کھڑا تھا۔ "عرشی... ابو نہیں رہے..... ہمارے ابو نہیں رہے..." شیراز نے

روتے ہوئے یمین کو کہا تو صبیحہ بیگم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ "نہیں.. ایسا نہیں ہو سکتا.. ابو مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ آپ ڈاکٹرز کو فون کریں.. جلدی کریں.. ہٹیں میں خود فون کرتی ہوں..." عرشیہ نے چلاتے ہوئے کہا۔ "اب کوئی فائدہ نہیں.... ابو اب اس دنیا میں نہیں رہے عرشی..." شیراز نے اُسے کندھوں سے تھام کر گلے لگاتے ہوئے کہا۔ "نہیں..... یہ جھوٹ ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا.. ابو نہیں جا سکتے..." عرشیہ نے بچوں کی طرح روتے بلکتے ہوئے کہا۔ صبیحہ بیگم وہیں بیڈ کے پاس فرش پہ بیٹھ کر زاروقطار رو رہی تھیں۔ "ابو ہمیں چھوڑ کر چلے گئے امی.. امی ہم یتیم ہو گئے...." شیراز بھی ماں کے پاس بیٹھ کر رونے لگا۔ "ابو اٹھیں.. آپ نہیں جا سکتے......" عرشیہ وہیں باپ کے اوپر گر کر رونے بلکنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

"میں نے سنا ہے آپ نے اپنی بہو کو گھر سے مار پیٹ کر نکال دیا ہے...؟" شبانہ کی ساس نے رخسانہ بیگم سے سوال کیا تو وہ کچھ بوکھلا سی گئی۔

"نہیں.. نہیں.. ایسا تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" رخسانہ بیگم نے گڑبڑاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا ہوا جو نوبت طلاق تک پہنچ گئی...؟" شبانہ کی ساس کا لہجہ سخت تھا۔

"بس.. کیا بتاؤں بہن... بڑی ہی بدتمیز لڑکی تھی اور مغرور بھی..." رخسانہ بیگم سے فوراً کوئی بہانہ نہیں بن پایا تھا۔

"مجھے خود آس پڑوس سے معلوم ہوا ہے کہ تیمور نے اُسے مارا پیٹا تھا تبھی تو گھر چھوڑ کر چلی گئی۔" شبانہ کی ساس نے کہا۔

"لوگوں کا کیا ہے.. وہ تو کچھ بھی کہتے ہیں.." رخسانہ بیگم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"بھئی سچی جو بات ہے ہم تو منہ پہ کہیں گے... ہمیں تو وہ بچی بہت بااخلاق اور سلجھی ہوئی لگی تھی۔ ضرور تیمور نے ہی کچھ کیا ہوگا..." شبانہ کی ساس نے صاف بات کی تو رخسانہ بیگم کی تیوری چڑھ گئی۔

"ارے.. ایسے کیسے آپ میرے بیٹے پہ الزام لگا سکتی ہیں...؟" رخسانہ بیگم نے خفگی سے کہا۔

"ہم نے تو یہ بھی سنا ہے کہ آپ لوگوں نے اُن شریفوں کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے... اور تیمور کا بزنس بھی اُنہوں نے سیٹ کروا کر دیا تھا۔" شبانہ کی نند نے کہا۔

"ایسا کچھ نہیں ہے... آپ خوامخواہ بات کو بڑھا رہی ہیں.. صاف صاف بات کریں جو کہنا چاہ رہے ہیں آپ لوگ..." رخسانہ بیگم کی برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

"صاف بات یہ ہے کہ اب ہم لوگ یہاں رشتہ نہیں کرنا چاہتے... یہ رہی منگنی کی انگوٹھی۔" شبانہ کی ساس نے پرس سے منگنی کی انگوٹھی نکال کر واپس کرتے ہوئے کہا۔

"ارے بہن... ایسے کیسے آپ منگنی ختم کر سکتے ہیں...؟" رخسانہ اُن کی بات پہ ہڑبڑا گئی۔

"ہماری طرف سے رشتہ ختم سمجھئے اور کل ڈرائیور آ جائے گا... آپ کل ہمیں منگنی کی چیزیں واپس بھجوا دینا۔" شبانہ کی ساس نے کہا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"لیکن آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں... بیٹھ کر تسلی سے بات کیجئے... کچھ تو بتائیں آخر ہوا کیا ہے؟" رخسانہ بیگم نے انہیں روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھئی... ہم نہیں کرتے ایسے لوگوں میں رشتہ... بہو کے ساتھ ایسا کیا ہے.. پتہ نہیں کل کو انکی بیٹی ہمارے گھر آ کر کیا گل کھلائے... چلو یہاں سے..." شبانہ کی ساس نے کہا اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف نکل گئی۔

"میری بات سنئے... بہن... سنئے تو..." رخسانہ بیگم آوازیں دیتی رہ گئیں اور وہ یہ جا وہ جا۔

دروازے کی اوٹ میں کھڑی شبانہ اور فرزانہ دونوں یہ منظر دیکھ رہیں تھیں۔ شبانہ نے اپنی ساس کو منگنی توڑ کر جاتے دیکھا تو وہ آپے سے باہر ہو گئی۔ "ہائے.. امی اب کیا ہوگا.. میری منگنی ٹوٹ گئی..." شبانہ نے روتے ہوئے ماں کے پاس بیٹھ کر کہا۔ "پتہ نہیں کس کم بخت نے اُنکو بتا دیا تیمور کی طلاق کا..." رخسانہ بیگم نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"دیکھا... میں نہ کہتی تھی کہ اُس بے چاری عرشیہ کی ہائے نہ لو... لیکن آپ تینوں میری سنتے ہی کہاں تھے... بھائی کا بزنس دوست نے دھوکے سے ہتھیا لیا اور شبانہ کی ساس منگنی توڑ گئی... آہ لگ گئی ہے عرشیہ کی ہم سب کو..." فرزانہ نے ماں اور بہن کو کوستے ہوئے کہا۔ "اری.. تُو تو چپ ہو جا منحوس ماری... جب دیکھو بکواس کرتی رہتی ہے... چپل اُٹھا کے تیرے منہ پہ ماروں گی۔" رخسانہ بیگم نے چپل اُتار کر اُسکی طرف پھینکتے ہوئے کہا تو وہ بلی کی طرح دُم دبا کر بھاگ گئی۔ "امی... یہ سب تیمور کی وجہ سے ہوا ہے... نہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دیتا اور نہ میری منگنی ٹوٹتی..." شبانہ نے روتے ہوئے کہا۔ "رو... اور رو... رو میری جان کو تم سب بیٹھ کر۔ منحوسو... تم سب ایک ہی جیسے ہو کم بختو... پتہ نہیں اب کون رشتہ کرے گا تم تینوں سے... کوئی بیا ہنے آتا بھی ہے اب کہ نہیں... اور وہ بڑا کم بخت تمہارا بھائی... اپنی عیاشیوں میں سارا جما جمایا کاروبار لٹا کر بیٹھ گیا... کتنے پاپڑ بیل کر عرشیہ اور اُسکے ماں باپ سے پیسے نکلوائے تھے... نہ بیوی کو رکھ سکا نہ ہی کاروبار ہی سنبھال پایا۔" رخسانہ بیگم اپنا سر پیٹ کر رہ گئی۔ "تم بھی تو سکون سے رہنے نہیں دیتی تھی اُسکی بیوی کو... اب سارا قصور ہمارا کیوں گنوا رہی ہیں ہو امی...؟" شبانہ نے بدتمیزی سے کہا تو رخسانہ بیگم کا غصہ مزید دو بالا ہو گیا۔ "دیکھو تو ذرا... کیسے زبان چلا رہی ہے ماں سے... چل دفع ہو جا یہاں سے... ورنہ کان کے نیچے دوں گی ایک..." رخسانہ بیگم نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھا تو وہ بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اُٹھ گئی۔ "اچھا ہوا جو وہ چھوڑ کر چلی گئی... اور طلاق دے ماری تم ماں بیٹے کے منہ پہ... دونوں ہی بے فیض اور بدلحاظ ہیں... ہونہہ..." شبانہ زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کہا تو منہ بناتی ہوئی وہاں سے پیر پٹختے ہوئے چلی گئی۔ رخسانہ بیگم وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ اُسے عرشیہ کے ساتھ کی گئی اپنی ہر زیادتی یاد آنے لگی تھی۔ پچھتاوے کے آنسو اُسکے چہرے کو بھگونے لگے تھے۔ کبھی کبھی انسان پچھتانے اور شرمندہ ہونے میں بھی اتنی دیر کر دیتا ہے کہ پھر واپسی کا کوئی راستہ باقی نہیں بچتا۔ ندامت کے آنسو پھر بے سود ہوتے

ہیں.. پھر کوئی فرق نہیں پڑتا انسان پچھتائے یا نہ پچھتائے۔ ہم جو کچھ کھو دیتے ہیں پھر وہ ہمارے لاکھ آنسو بہانے پہ بھی ہمیں واپس نہیں ملتا کیونکہ ہم نے اُسکی قدر ہی نہیں کی ہوتی۔

☆......☆......☆

''ابو... آپ مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے...؟'' عرشیہ نے باپ کی قبر پہ پھول ڈالنے کے بعد اُس پہ سر رکھ کر کہا تو دو موٹے موٹے آنسو اُسکی رخساروں پہ بہہ نکلے۔ ''ابو... آپکے بغیر میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں... مجھے لگتا ہے کسی نے میرے سر سے سائبان چھین لیا ہے...'' عرشیہ روتے ہوئے اپنے ابو کی قبر سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ آس پاس سے بے خبر اپنے آپ ہی میں مگن بولے چلے جا رہی تھی۔ ''امی بھی آپکے بغیر خاموش سی ہو گئیں ہیں... ہر پل آپکو یاد کرتی رہتی ہیں...'' عرشیہ یوں باتیں کر رہی تھی جیسے کامران احمد قبر میں بھی اُسکی تمام باتوں کو سن رہے ہیں اور جواب دے رہے ہیں۔ پے در پے صدموں نے اُسکے ذہن کو بُری طرح متاثر کیا تھا۔ ''آپ تو کہتے تھے ابو کہ تیمور میری بہت قدر کرے گا... آپکے جانے کے بعد میں تنہا نہیں رہوں گی.... ابو دیکھیں ناں... میں تو آج بھی تنہا ہوں... میرا تو کوئی بھی نہیں ہے... آپ بھی مجھے اور امی کو اس دنیا میں چھوڑ کر چلے گئے... ابو آپ کیوں چلے گئے... ہمیں بھی اپنے ساتھ لے جاتے ابو...'' وہ وہیں قبر پہ گر کر سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

عرشیہ سے کچھ فاصلے پہ ایک قبر پہ کوئی آدمی پھول ڈالتے ہوئے اور فاتحہ پڑھتے ہوئے اُسکی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اُسکی اس اضطرابی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔ عرشیہ اپنی ابو کی قبر پہ روتے روتے نڈھال سی ہو گئی تھی۔ اُس شخص کو لگا شاید عرشیہ روتے ہوئے وہیں بے ہوش ہو گئی ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اُسکے قریب آ کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر اُسے دیکھنے کے بعد ذرا سا جھکا تھا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں محترمہ...؟'' اُس نے کہا تو عرشیہ چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اپنی چادر درست کرنے لگی۔ ''جی... میں ٹھیک ہوں۔'' عرشیہ نے اپنے چہرے سے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ اُسکا حسین چہرہ اور خوبصورت آنکھیں جو رونے کی وجہ سے سُرخ ہو رہی تھیں بہت ہی خمار آلود لگ رہیں تھیں۔ وہ عرشیہ کو دیکھتا ہی رہ گیا اور اُسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ''کوئی اتنا حسین اور معصوم بھی ہو سکتا ہے...'' اُس نے دھڑکتے دل کے ساتھ سوچا۔ ''آپ پانی پئیں گی...؟'' اُس نے پانی ایک چھوٹی سی بوتل عرشیہ کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''جی نہیں... شکریہ۔'' عرشیہ نے کہا اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''کیا میں آپکا نام جان سکتا ہوں...؟'' اُس شخص نے اُسکے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ ''جی نہیں... میں اجنبی لوگوں سے بات نہیں کرتی۔'' عرشیہ نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں... ہم پہلے مل چکے ہیں۔'' اُس نے پھر کہا تو عرشیہ کے قدم ایک بار رُکے اور اُس نے بغور اُسکے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا ''کب...؟'' ''شاید آپکو یاد ہو... ایک بار ہماری گاڑیوں کی ٹکر ہوئی تھی روڈ پر.. ایک سال پہلے...'' اُس نے عرشیہ کو یاد دلایا تو وہ بغور اُسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگی۔ ''اوہ... اچھا... جی مجھے اب یاد آیا...'' عرشیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اب میں آپکا نام جان سکتا ہوں... میں شریف آدمی ہوں مجھے نام بتانے میں آپکا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔'' اُس نے اپنی شرافت کی یقین دہانی کروائی۔ ''عرشیہ کامران...'' عرشیہ اُسکی

بات پہ زیرِ لب مسکراہٹ دبا کر بولی۔ "نائس نیم.... میرا نام حسن مراد ہے اور میں یہیں پاس میں رہتا ہوں۔" اُس نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا لیکن عرشیہ بغیر کچھ کہے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی تو حسن مراد بھی ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ "آپ اپنے ابو کی قبر پہ آئی تھیں شاید۔ کتنا عرصہ ہوا اُنکی وفات کو...؟" حسن نے سوال کیا۔ "جی.. ایک سال ہوا ہے۔" عرشیہ نے دُکھ بھرے لہجے میں کہا۔ "بہت افسوس ہوا... میں یہاں اپنی امی کی قبر پہ آیا تھا۔" حسن نے بتایا۔ "اوہ... کب وفات ہوئی اُنکی..؟" عرشیہ نے پوچھا۔ "بہت وقت گزر چکا ہے.. تقریباً چھ سال۔" حسن نے بتایا۔ "اور آپکے ابو...؟" عرشیہ نے بے ساختہ پوچھا۔ "میرے گھر میں صرف میں اور میرے ابو رہتے ہیں.. ایک بہن ہے جو امریکہ میں ہوتی ہے۔" حسن کے لہجے میں اُداسی تھی۔ "تو آپ کے بیوی.. اور بچے...؟" عرشیہ کو حیرت ہوئی تو اُس نے پوچھا۔ "شادی ہی نہیں کی تو بیوی اور بچے کہاں سے آتے...؟" حسن نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"عمر تو ٹھیک لگتی ہے.... دیکھنے میں بھی اچھے ہیں.. پھر شادی نہ کرنے کی وجہ..؟" عرشیہ نے اُسکو اوپر سے نیچے تک دیکھتے ہوئے کہا۔ "جسے پسند کرتا تھا وہ مجھے کسی اور کی خاطر چھوڑ گئی.... میرے پاس اُس وقت اتنا پیسہ نہیں تھا اور اُسے کسی امیر آدمی سے شادی کرنی تھی مجھ جیسے مسکین سے نہیں...." حسن نے طنزیہ انداز میں بتایا۔ "ویری سیڈ..." عرشیہ نے مختصراً کہا۔ "آپ کا گھر ادھر پاس میں ہی ہے کیا؟" حسن نے پوچھا۔ "جی بس قبرستان سے دو گلیاں چھوڑ کر...." عرشیہ نے کہا۔ "تو آپ پیدل آئی ہیں... آج گاڑی نہیں ہے آپکے پاس..؟" حسن نے مسکراہٹ کے ساتھ سوال کیا۔ "جب سے ابو فوت ہوئے ہیں مجھ سے گاڑی نہیں چلائی جاتی..." عرشیہ نے کہا۔ "لیکن کیوں؟" حسن نے حیرت سے کہا۔

"معلوم نہیں.. اب اپنی ذات میں پہلے جیسا کونفیڈنس نہیں رہا شاید اسلئے...." عرشیہ کے انداز میں ملال جھلک رہا تھا۔ ساتھ چلتے چلتے حسن نے ایک نظر بھر کر اُسکے چہرے کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے عرشیہ کا بھولا پن اُسکے دل کی گہرائیوں میں اُترتا ہی چلا گیا ہو اور اُسے خود پہ قابو نہ رہا ہو۔ "شادی ہو گئی آپکی..؟" حسن نے خود پہ قابو پا کر اچانک ہی سوال کیا۔ "شادی بھی ہو گئی.. اور طلاق بھی.." عرشیہ نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔ "بہت ہی بدقسمت انسان ہو گا جس نے آپکو پا کر کھو دیا...." حسن کے منہ سے بے ساختہ ہی نکل گیا۔ عرشیہ نے چونک کر اُسکی جانب دیکھا۔ "معلوم نہیں بدقسمت تھا یا خوش قسمت... جو بھی تھا میرے لئے تو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح تھا۔" عرشیہ نے ایک گہری سانس لیکر جواب دیا۔ "کیا میں آپکو آپکے گھر تک چھوڑ دوں...؟" حسن مراد نے قبرستان کے گیٹ تک پہنچ کر پوچھا۔ "جی نہیں.. شکریہ.. میں خود چلی جاؤں گی۔" عرشیہ نے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دی۔ حسن مراد اپنی گاڑی میں اُسکا پیچھا کرتا رہا جس سے عرشیہ بالکل بے خبر تھی۔ وہ سر جھکائے بس تیز تیز قدموں سے چلی جا رہی تھی۔ اُس اپنے آس پاس کی خبر نہیں رہتی تھی۔ پہلے تیمور کے ظلم و ستم اور بعد میں ابو کی اچانک وفات نے اُسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ چلتی پھرتی اُلجھی بیٹھی ایک غم کی تصویر نظر آتی تھی۔ سانس بھی یوں لیتی تھی جیسے کوئی بوجھ اُٹھا رکھا ہو۔ گھر آ کر وہ پورچ سے گزرتی ہوئی لاؤنج میں پہنچی تو وہاں صبیحہ بیگم کے ساتھ کوئی اور بھی بیٹھا تھا۔ وہ کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں جسکی پشت عرشیہ کی طرف

تھی۔ عرشیہ کو دیکھتے ہی صبیحہ بیگم نے کہا۔ ''آؤ عرشیہ... دیکھو کون آیا ہے؟'' صبیحہ بیگم نے کہا تو اُس لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔ ''ارے.. نائمہ تم ...کب آئی تم؟'' عرشیہ نائمہ کو دیکھ کر خوش ہوئی تھی۔ نائمہ جلدی سے اُٹھ کر اُسکے گلے سے لگ گئی۔ ''اتنا سب کچھ ہو گیا عرشی... اور تم نے مجھے کچھ بتانا بھی مناسب نہ سمجھا۔'' نائمہ نے افسوس بھرے لہجے میں اُس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''تم بیٹھو... اور بتاؤ کہ تم کیسی ہو...؟'' عرشیہ نے اُسکی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''میں ٹھیک ہوں... تم کیسی ہو...؟'' نائمہ نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی زندہ ہوں۔'' عرشیہ نے ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''اچھا تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو میں چائے بھجواتی ہوں۔'' صبیحہ بیگم نے کہا اور کچن کی طرف بڑھ گئیں۔ ''آؤ... میرے کمرے میں چلتے ہیں۔'' عرشیہ نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے کہا تو نائمہ اُسکے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے کمرے میں آ گئی۔ عرشیہ نے کمرے کی لائٹ آن کی اور دونوں کھڑکی کے سامنے رکھے کاؤچ پہ بیٹھ گئیں۔ ''بہت افسوس ہوا انکل کی ڈیتھ کا...'' نائمہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''یوں لگتا ہے جیسے دنیا پہ بالکل اکیلی ہو گئی ہوں... ابو نہیں رہے تو لگتا ہے جیسے کچھ بھی نہیں رہا۔'' عرشیہ نے دُکھی لہجے میں کہا۔ ''ایک دن تو ہم سب کو جانا ہے۔ یہی قانونِ قدرت ہے عرشی...'' نائمہ نے اُسکے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے حوصلہ دیا۔ ''خیر... تم بتاؤ.. اتنے عرصے سے کہاں غائب تھی اور اب کیسے آ گئی تمہیں میری یاد...'' عرشیہ نے سب دکھ درد کو جھٹکتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ''میں تو یہاں تمہیں اپنی شادی کا کارڈ دینے آئی تھی... پھر آنٹی سے معلوم ہوا تمام افسوس ناک واقعات کے بارے میں.. انکل کی ڈیتھ اور تیمور سے تمہاری ڈیورس کے بارے میں.... سچ بہت ہی ذلیل اور گھٹیا نکلے وہ لوگ...'' نائمہ نے افسردگی سے کہا۔ ''کیا... شادی کا کارڈ... اور بد حواسی اُداسی سے بتا رہی ہو.. اتنی خوشی کی خبر...'' عرشیہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری زندگی میں اتنے غم کے پہاڑ ٹوٹے دیکھ کر... میری خوشی کی کوئی اہمیت نہیں رہی یار..'' نائمہ نے کہا۔ ''ارے نہیں پاگل... یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے.. لاؤ جلدی سے کارڈ دکھاؤ مجھے کب ہے شادی...؟'' عرشیہ نے کہا تو نائمہ نے اپنے ہینڈ بیگ سے شادی کا کارڈ نکال کر عرشیہ کو تھما دیا۔ ''نائمہ ود نوید....؟'' عرشیہ نے کارڈ پہ نام پڑھ کر حیرانگی سے نائمہ کی طرف دیکھا۔ ''ہاں... کیا ہوا..؟'' نائمہ نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے عرفان... اُسکا نام عرفان ہی تھا ناں..؟'' عرشیہ نے کہا۔ ''نام مت لو اُسکا میرے سامنے...'' نائمہ نے خفگی سے کہا۔ ''کیوں... کیا ہوا.. کیا کیا اُس نے..؟'' عرشیہ نے حیرانگی سے پوچھا۔ ''میری زندگی برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اُس نے.... مجھے وہاں لا کر مارا جہاں پانی بھی نہ ملے۔'' نائمہ کی آنکھوں میں نمی تیر گئی اور بہت سی تلخ یادیں ذہن میں کسی فلم کی طرح چلنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

''نائمہ... اے نائمہ.. چل جلدی سے آ کر برتن دھو دے...'' نائمہ کی امی کچن میں کھڑی اُسے آوازیں دے رہی تھیں۔

''کیا ہے اماں... مجھ سے نہیں دھلتے یہ برتن ورتن...'' نائمہ نے چڑتے ہوئے کہا۔

''تو تمہارے باپ نے کیا مجھے ملازم رکھ کے دیئے ہیں جو آ کر دھوئیں گے...؟'' اماں نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھتے ہوئے لڑنے والے انداز میں کہا۔

"تو ابا سے کہنا تھا ملازم بھی رکھ دیں اگر بچوں کی فوج پیدا کر رکھی ہے تو..... مجھ سے نہیں دھلتے یہ درجنوں برتن... ہونہہ..."

نائمہ نے ہاتھ نچا کر کہا تو اماں نے ایک زوردار تھپڑ اُسکے بازو پہ دے مارا اور وہ درد سے کراہتے ہوئے اپنا بازو سہلانے لگی۔

"بدتمیز... بے حیا... کیسے ماں سے زبان چلا رہی ہے.. گدی سے تیری زبان کھینچ لوں گی آئی بڑی نواب کی رن..." اماں نے خونخوار نظروں سے اُسے گھورتے ہوئے بُرا بھلا کہا۔

"ہاں... ہاں... بنوں گی.. ضرور بنوں گی کسی نواب کی رن میں.. بس مجھ سے نہیں دھلتے یہ برتن روز... پہلے سکول میں جا کر بچوں کو پڑھاؤ.. پھر کالج میں دھکے کھاؤ اور گھر آ کر محلے کے بچوں کو پڑھاؤ... اُسکے بعد بھی کھپتی ہو برتن دھونے میں.. یہ ظلم نہیں ہے تو کیا ہے؟" نائمہ کا لہجہ باغیانہ تھا۔

"اچھا... دیکھوں گی میں بھی اس دو کمروں کے مکان سے تجھے کونسا شہزادہ بیاہنے آتا ہے.." اماں نے ہاتھ نچا کر کہا تو نائمہ غصے سے جل بھن گئی۔

"دیکھ لینا اماں... میں کسی امیر لڑکے سے ہی شادی کروں گی... تاکہ مجھے نہ لوگوں کے بچوں کو پڑھا پڑھا کر اپنا دماغ دہی کرنا پڑے اور نہ ہی مہینہ بھر یہ ہزار پانچ سو جوڑتے بچاتے گزرے میری..." نائمہ نے غصے سے ہاتھ دماغ پہ مارتے ہوئے کہا اور پاؤں پٹختی ہوئی اندر کمرے میں چلی گئی۔ اماں بھی اُسکے پیچھے ہو لیں۔

"کرتی ہوں تیری خالہ سے بات کہ وہ نے آئیں رشتہ نوید کا... تیرے تو پَر کاٹوں میں.. بہت اونچا اُڑنے لگی ہے تُو..." اماں نے اُسے کہا۔

"میں نوید سے شادی نہیں کروں گی اماں... ہے کیا اُس کنگلے کے پاس.. سارا دن گلیوں کی خاک چھانتا ہے..." نائمہ نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"کالج میں پڑھتا ہے وہ... کل کو پڑھ لکھ کر کہیں اچھی نوکری لگ جائے تو شادی کر دوں گی اُس سے تیری..." اماں نے اپنی بات پہ زور دیا۔

"دس بیس ہزار کی نوکری سے کیا ہوتا ہے... مہینہ بھر پیٹ کاٹ کر بل بھی ادا نہیں کر پاتا انسان اتنی سی تنخواہ میں.." نائمہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"روکھی سوکھی جیسی بھی کھائے انسان.. کم از کم عزت کی کھاتا ہے... ورنہ دوسروں کے منہ لال دیکھ کر ہم جیسے غریب تو طمانچے مار کر ہی اپنا منہ لال کر سکتے ہیں۔" اماں نے منہ پہ اپنا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے... آج کل عزت اُسی کی ہے جسکے پاس دولت ہے..." نائمہ نے کہا۔

"دولت سے سب کچھ خریدا جا سکتا ہے نائمہ لیکن عزت اور محبت نہیں خریدی جا سکتی... تیری خالہ تجھے بہت چاہت سے اپنی بہو

بنا کرے جانا چاہتی ہیں... دیکھ تو انکار مت کر... تو یہ بہت اچھا لڑکا ہے تجھے بہت خوش رکھے گا۔" اماں نے التجائیہ لہجے میں اُس سے کہا۔

"بس بس رہنے دو اماں... یہ عزت اور محبت نہ پیٹ بھرتی ہے ناں جیب... سارا مہینہ میری طرح سڑکوں کی خاک چھانو گی ناں تب پتہ چلے گا تمہیں کہ یہ عزت اور محبت باہر کوڑیوں کے دام بکتی ہے..." نائمہ نے تلخی سے کہا۔

"فٹے منہ تیرا نائمہ... تجھے تو خدا ہی سمجھائے گا... تو کسی کے سمجھائے نہ سمجھے گی۔" اماں نے کہا اور لعن طعن کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ نائمہ پلنگ پہ لیٹ کر منہ تک چادر لے کر سونے لیٹ گئی۔ ابھی اُس نے آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ موبائل کی رنگ ٹون بجنے لگی۔ اُس نے موبائل تکیے کے نیچے سے نکال کر دیکھا تو سکرین پہ عرفان کا نمبر جگمگا رہا تھا۔ ایک پُرجوش مسکراہٹ کے ساتھ اُس نے کال اٹینڈ کر کے فون کان کو لگایا۔

"ہیلو..." نائمہ نے کہا۔

"نائمہ یار... کدھر غائب ہو کب سے میسج کر رہا ہوں..." دوسری طرف سے عرفان نے کہا۔

"اوہ... سوری... میں نے موبائل نہیں دیکھا سو رہی تھی۔" نائمہ نے شرمندگی سے کہا۔

"اچھا سنو... میرے پاس ایک گڈ نیوز ہے تمہارے لئے..." عرفان کی آواز میں جوش تھا۔

"ریلی... وہ کیا...؟" نائمہ نے جلدی سے کہا۔

"میں نے گھر پہ ہمارے رشتے کی بات کی ہے... سب اگریڈ ہیں کسی کو کوئی اعتراض نہیں اور بہت جلد میرے ممی پاپا تمہارے گھر آئیں گے تم سب سے ملنے..." عرفان نے خوشی سے بتایا تو کچھ دیر کے لئے نائمہ کو جیسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا۔

"عفی کیا تم سچ کہہ رہے ہو...؟" نائمہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں میری جان... بالکل سچ..." عرفان نے کہا۔

"مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ سب مان گئے..." نائمہ نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"بس اب یقین کر لو... اور کل تیار رہنا سکول سے جب تم فری ہو جاؤ گی تو تمہیں کچھ دکھانے لے کر جانا ہے۔" عرفان نے کہا۔

"کیا دکھانے لے کر جانا ہے؟" نائمہ نے پوچھا۔

"ہمارے خوابوں کا محل..." عرفان نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"مطلب...؟؟" نائمہ نے نا سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا گھر... جہاں ہم شادی کے بعد رہیں گے۔" عرفان نے کہا تو خوشی سے نائمہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"کیا... واقعی عفی... سچ میں...؟؟؟" نائمہ نے حیرت سے منہ کھولے کہا۔

"ہاں نائمہ... بس اب منزل ہم سے دور نہیں..." عرفان نے ذومعنی انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے کل بارہ بجے میرا لاسٹ پیپر ہوگا سکول میں...تم آجانا پھر ہم چلیں گے۔" نائمہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے پھر...اچھے سے تیار ہو کر آنا۔تاکہ جب گھر جائیں تو گھر کو بھی پتہ لگے کہ مالکن آئی ہے..." عرفان نے شوخ انداز میں کہا تو نائمہ ہنس دی۔

"ٹھیک ہے...خدا حافظ۔" نائمہ نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"اوکے...خدا حافظ۔فون بند کرنے کے بعد نائمہ عرفان کی باتوں میں کھوئی رہی۔اُسے یہ دنیا اپنے خوابوں کی دنیا معلوم ہو رہی تھی۔اُسکے انگ انگ سے خوشی پھوٹنے لگی تھی۔اُسے اپنی ماں کی ساری باتیں بے کار لگتی تھیں اور اب تو وہ بالکل ہی ان باتوں سے متنفر ہو گئی تھی۔وہ دنیا کو بس عرفان کی نظر سے ہی دیکھ رہی تھی۔وہ جو کہتا تھا اُسے وہی سچ نظر آتا تھا باقی ساری دنیا اُسے جھوٹی لگتی تھی۔ عرفان کے پیار کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔نائمہ عرفان کے دکھائے ہوئے خوبصورت خوابوں میں زندہ رہنے لگی تھی اور حقیقت کی دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔

☆......☆......☆

اگلے دن نائمہ مقررہ وقت پہ سکول کے باہر عرفان کی منتظر تھی۔ابھی اُسے انتظار کرتے پانچ منٹ ہی ہوئے ہو نگے کہ عرفان اپنی گاڑی پہ وہاں پہنچ گیا۔نائمہ جلدی سے اُسکی گاڑی میں بیٹھ گئی۔"آج پہلی بار وقت پہ پہنچے ہو..." نائمہ نے گاڑی میں بیٹھتے ہی کہا۔"آج دن ہی بہت سپیشل ہے..." عرفان نے گاڑی سڑک پہ دوڑاتے ہوئے کہا۔"مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا..." نائمہ نے خوشی اور حیرانگی کے ملے جلے جذبات سے کہا۔"کوئی بات نہیں میری جان...ابھی کچھ ہی دیر میں یقین آجائے گا۔" عرفان نے ذو معنی انداز میں کہا۔

"کتنی دور ہے گھر...؟" نائمہ نے پوچھا۔"بس آدھے گھنٹے میں ہم اپنی منزل پہ ہونگے..." عرفان نے کہا۔"اسکا مطلب کافی دور ہے؟" نائمہ کے چہرے پہ فکرمندی کے سائے لہرا گئے۔"ارے نہیں...بس ٹریفک کی وجہ سے ٹائم لگے گا ورنہ اتنا دور نہیں ہے۔" عرفان نے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی کے ساؤنڈ سسٹم پہ گانے لگا کر آواز اونچی کر دی۔نائمہ کو دل ہی دل میں خوف بھی محسوس ہو رہا تھا لیکن عرفان کی محبت نے اُسکی آنکھوں پہ اعتبار کی پٹی باندھ دی تھی۔کچھ دیر بعد ایک خوبصورت علاقے میں پہنچ کر ایک بہت بڑے گھر کے سامنے عرفان نے گاڑی روکی اور دو تین بار گاڑی کا ہارن بجایا۔کچھ دیر بعد ایک ملازم نے گیٹ کھولا اور آکر سلام کیا۔ عرفان نے گاڑی اندر پورچ میں پارک کر دی۔

"لو اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لو...ہمارے خوابوں کا محل..." عرفان نے نائمہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا جو حیران نظروں سے اس بڑے اور خوبصورت ولا کو دیکھ رہی تھی۔

"عفی...یہ تو سچ میں خوابوں کا محل ہے...میں نے ایسے خوبصورت گھر تو بس ٹی وی ڈراموں میں دیکھے ہیں۔" نائمہ نے حیران ہوتے ہوئے کہا تو عرفان مسکرا دیا۔

"چلو اب گاڑی اُترو... اندر سے گھر نہیں دیکھنا کیا...؟" عرفان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا تو نائمہ گاڑی سے اُتر آئی۔ عرفان نے اُسکا ہاتھ تھام لیا اور اُسے گھر کے اندر لے گیا۔ گھر پورا فرنشڈ تھا اور بہت ہی نفاست اور خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ نائمہ حیران نظروں سے ایک ایک چیز کو دیکھ رہی تھی اور اپنے نصیب پہ رشک کر رہی تھی۔ عرفان نے اُسے پورے گھر کا ایک ایک کونہ دکھایا۔ پھر آخر میں ایک بیڈ روم دکھایا جو بہت خوبصورت پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ "عفی... یہ کمرہ کتنا خوبصورت ہے.." نائمہ نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا۔ "یہی ہمارا بیڈ روم ہے نائمہ... کیسا لگا تمہیں؟" عرفان نے کہا۔ "بہت خوبصورت اور اعلیٰ..." نائمہ نے کہا۔ "چلو ٹھیک ہے تم اچھے سے دیکھ لو... اگر کوئی کمی لگتی ہے کسی چیز میں تو مجھے بتاؤ... میں کھانے پینے کا کچھ کرتا ہوں۔" عرفان نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ نائمہ ایک ایک چیز دیکھتے ہوئے خود کو ہواؤں میں اُڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اُسے اماں کی سب باتیں یاد آ رہی تھیں "دیکھوں گی کونسا شہزادہ آتا ہے تجھے بیاہنے کو.." اماں کے الفاظ اُسکی سماعتوں میں گونجے تھے۔ "لو اماں... دیکھ لو پھر.. آ ہی گیا مجھے کوئی شہزادہ بیاہنے.." نائمہ نے غرور سے بھرے لہجے میں خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کہ جب وہ اماں کو عرفان کے بارے میں بتائے گی تو اماں حیرت سے ایک بار تو سکتے میں آ ہی جائے گی۔ وہ پورے بیڈ روم میں یوں چل پھر رہی تھی جیسے واقعی اس گھر کی مالکن ہو۔

کچھ دیر بعد عرفان کمرے میں آ گیا اور اُسکے ساتھ ہی ملازم بہت سی کھانے پینے کی چیزیں لئے اندر داخل ہوا۔ اُس نے کاؤچ کے سامنے رکھی شیشے کی میز پہ وہ سب چیزیں سجا دیں۔ دو وائن گلاسز میں جوس بھی رکھا تھا۔ عرفان نے ایک گلاس نائمہ کو اُٹھا کر دیا اور دوسرا خود تھام کر کاؤچ پہ اُسکے پہلو میں بیٹھ گیا۔ نائمہ نے ایک سلائس پیزا کا کھایا اور پورا گلاس جوس کا پی گئی۔ وہ صبح اماں سے لڑ کر بغیر کچھ کھائے پیئے گھر سے نکلی تھی اور اس وقت بھوک سے اُسکا بُرا حال ہو رہا تھا۔ اسلئے وہ اطمینان اور تسلی سے سب چیزیں کھانے لگی۔ عرفان اُسے دلچسپ انداز میں یہ سب چیزیں کھاتا دیکھ رہا تھا لیکن خود کچھ نہیں کھا رہا تھا۔ وہ صرف جوس کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہا تھا۔ "عفی... تم بھی تو کچھ کھاؤ ناں.." نائمہ نے کافی دیر بعد نوٹ کیا کہ عرفان کچھ نہیں کھا رہا۔ "مجھے بھوک نہیں ہے جان... تم کھاؤ میں بس جوس لوں گا۔" عرفان نے کہا تو نائمہ پھر سے کھانے میں مصروف ہو گئی۔ گھر کی دال روٹی سے اُکتائی ہوئی لڑکی کے سامنے دنیا جہاں کی خوش ذائقہ چیزوں نے اُسکے ذہن پہ پردے ڈال دیئے تھے اور اُسے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ اُسکے ساتھ کیا ہونے جا رہا تھا۔ نائمہ کو کھاتے کھاتے اپنا سر اچانک سے بھاری ہوتا محسوس ہونے لگا اور اُس نے کھانا بند کر دیا۔ عرفان مزے سے بیٹھا جوس کے گھونٹ بھر رہا تھا اور اُسکے ہونٹوں پہ ایک مکروہ مسکراہٹ تھی۔ "عفی... میرے سر میں درد ہو رہا ہے.. اب گھر چلیں...؟" نائمہ نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ "کونسے گھر جان... تم اپنے گھر میں ہو.." عرفان نے کہا۔ نائمہ کا سر بُری طرح گھوم رہا تھا۔ وہ کاؤچ سے بمشکل اُٹھ سکی تھی۔ ابھی وہ اُٹھ کر دو قدم ہی چلی تھی کہ چکرا کر گر پڑی۔ عرفان اب کاؤچ سے اُٹھا اور کمرے کا دروازہ لاک کر دیا۔ نائمہ نیم بے ہوشی کی حالت میں فرش پہ پڑی بڑبڑا رہی تھی۔ عرفان دروازہ لاک کرنے کے بعد آہستہ آہستہ چلتا ہوا نائمہ کے پاس آ کھڑا ہوا اور تھوڑا جھک کر نائمہ کو اپنی بازوؤں میں اُٹھا کر بیڈ پہ لے گیا۔ نائمہ کی آنکھیں نیم وا تھیں جن سے اُس نے آخری منظر عرفان کی آنکھوں میں ہوس اور ہونٹوں پہ ایک کریہہ مسکراہٹ کا دیکھا جس کے بعد وہ مکمل ہوش سے بیگانہ ہو گئی۔

"یہ تم نے کیا کیا عرفان..." نائمہ کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے پہلو میں بیٹھے عرفان کو روتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں میری جان..its a part of Love" عرفان نے بیڈ پہ بیٹھے ہوئے ہی سگریٹ سُلگاتے ہوئے کہا۔ "میری آبرو ریزی کو تم part of Love کہتے ہو؟" نائمہ تقریباً چلا کر بولی۔ "زیادہ چلانے کی ضرورت نہیں ہے سمجھی..." عرفان نے آنکھیں نکالتے ہوئے اُسے جھڑکا تو وہ زاروقطار رونے لگی۔ "چلو اُٹھو... اب اپنا حلیہ درست کرو... تمھیں گھر تک ڈراپ کر دوں۔" عرفان نے کہا اور اُٹھ کر اپنی شرٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ چاروناچار نائمہ اپنی بے بسی پہ آنسو بہاتی ہوئی اُسکے ساتھ چل پڑی۔ وہ جتنی دور اُسے لے آیا تھا اب وہاں سے واپس گھر تک کا راستہ وہ اکیلی طے بھی نہیں کر سکتی تھی۔ سارا راستہ وہ چپ چاپ آنسو بہاتے ہوئے اپنی عقل پہ ماتم کرتی رہی۔ نائمہ کو رو رو کر افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے عرفان پہ اندھا اعتماد کیوں کیا۔ لیکن اب پچھتانے سے اُسکی عزت واپس آسکتی تھی نہ وقار... لیکن پھر بھی وہ اپنے ساتھ ہوئی زیادتی پہ آنسو بہائے جا رہی تھی۔ اونچی اُڑان کی خواہش میں وہ زمین پہ آ گری تھی۔ عرفان نے اُسے آسمان پہ پہنچا کر زمین پہ پٹخ دیا تھا۔ گلی کے موڑ پہ آ کر عرفان نے گاڑی روک دی۔ نائمہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے گاڑی سے اترنے لگی تو عرفان نے اُسے روکا۔ "ایک منٹ نائمہ..." عرفان نے کہا اور اپنے کوٹ کی جیب سے کچھ پیسے نکال کر اُسکے ہاتھ میں تھما دیے۔ "یہ کیا ہے؟" نائمہ نے نم آنکھوں سے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "رکھ لو... تمہارے کام آئیں گے۔" عرفان نے کہا تو نائمہ کو یوں لگا جیسے اس نے قیمت ادا کی ہے اُسکی عزت کی۔ نائمہ کا چہرہ شرم اور بے عزتی کے احساس سے لال ہو گیا اور اُس نے وہ پیسے عرفان کے منہ پہ دے مارے اور جلدی سے گاڑی سے اتر گئی اور تقریباً دوڑتی ہوئی گلی عبور کر کے گھر میں داخل ہو گئی۔ گلی کی نکڑ پہ کھڑا ہوا تو یہ سب منظر دیکھ رہا تھا اور فکرمندی کے آثار اُسکی پیشانی پہ نمایاں تھے۔ نائمہ کے جاتے ہی عرفان نے گاڑی زن سے آگے بڑھا دی اور وہاں سے چلا گیا۔ گیٹ بند کر کے وہ وہیں کھڑی زاروقطار رو دی۔ وہ کیا کیا سوچ کر عرفان کے ساتھ اپنے خوابوں کا محل دیکھنے گئی تھی لیکن یہ کیسا خواب تھا جسکی تعبیر اس قدر شرمناک اور تکلیف دہ تھی۔

☆......☆......☆

عرشیہ کو یہ سب کچھ بتاتے ہوئے نائمہ ایک بار پھر زاروقطار رونے لگی۔ عرشیہ نے اُسے گلے سے لگا کر حوصلہ اور تسلی دی۔ "پھر اُس نے تم سے کوئی رابطہ نہیں کیا یا تم نے خود اُسے چھوڑ دیا..؟" عرشیہ نے نائمہ سے پوچھا۔ "اس دن کے بعد میرا دل ہی نہیں چاہا کہ میں اُس سے کوئی بات کروں... اُس نے مجھے میری ہی نظر میں گرا دیا تھا اور میں جو کچھ پانے کی خواہش میں گھر سے نکلی تھی وہ سب بھی نہ ملا ...اور جو کچھ میرے پاس تھا وہ بھی گنوا دیا۔" نائمہ نے بھیگی پلکوں کے ساتھ کہا۔ "نائمہ میں اسلئے تم سے کہتی تھی ایسے تعلقات ہم جیسی شریف لڑکیوں کو زیب نہیں دیتے... تمھیں احتیاط کرنی چاہیے تھی۔" عرشیہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔ "جذبات اکثر ہمیں غلط راہوں کی طرف لے جاتے ہیں.. پھر ہمیں برائی بھی اچھائی لگنے لگتی ہے..ہوش تب آتا ہے جب ہم ٹھوکر کھا کر گرتے ہیں۔ تب احساس ہوتا ہے کہ جسے سنگِ میل سمجھا تھا وہ تو راستے میں پڑا پتھر نکلا۔" نائمہ نے جلے ہوئے دل سے کہا۔ "انسان کا بے صبرا پن اُسے غلط راہوں پہ ڈال

دیتا ہے نائمہ...شارٹ کٹ ڈھونڈنے میں انسان اپنا بہت سا قیمتی وقت بھٹکنے میں ضائع کر دیتا ہے۔تقدیر سے آگے کی تدبیر اُسے کہیں کا نہیں چھوڑتی...پھر واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہتا۔" عرشیہ نے سنجیدہ لہجے میں نائمہ سے کہا۔"تم سچ کہتی تھیں...واقعی میں نے اُس دن بڑا بول بولا تھا۔نوید کی سچی محبت کی توہین کی تھی میں نے...اسلئے خدا نے مجھے نیچا دکھایا ہے ورنہ میں تو خود کو نا جانے کیا سمجھ بیٹھی تھی۔عرفان مجھے چھوڑ کر ہمارے علاقے سے بھی چلا گیا اور پلٹ کر میری خبر بھی نہ لی اُس نے...اگر نوید اپنی محبت کی چادر سے میرا سر نہ ڈھکتا تو آج میں لوگوں کے قدموں کی دھول بن گئی ہوتی...میں نے جسے کمتر سمجھا اُسی نے مجھے عزت بخشی اور جسے میں نے مسیحا سمجھا اُسی نے مجھے نوچ کھایا..." پچھتاوے اور دُکھ کے آنسو ایک بار پھر نائمہ کی پلکوں سے بہتے ہوئے اُسکے رُخساروں پہ بہنے لگے۔عرشیہ نے اُسکے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر حوصلہ دیا۔

"ہمارا اختیار تو بس اتنا ہی ہے...ایک قدم اُٹھانے کا اختیار ہے انسان کو..اُسکے بعد قدم اُٹھے گا یا ہوا میں رہے گا اُسکا فیصلہ خدا کرتا ہے۔جہاں ہمارے اختیار کی حد ختم ہوتی ہے ناں وہیں سے ہمارے رب کا اختیار شروع ہوتا ہے اور اُسکے اختیارات کی کوئی حد نہیں...وہ جب چاہے جیسا چاہے،جس طرف چاہے تقدیر کا رُخ موڑ دیتا ہے۔" عرشیہ نے پُرسوچ انداز میں کہا۔"سچ کہہ رہی ہو تم...اگر خدا نے مجھے نوید جیسا چاہنے والا نہ دیا ہوتا تو میں ذلت اور رسوائی کے اندھیروں میں گم ہو جاتی۔" نائمہ نے کہا۔"چلو اب اپنا موڈ ٹھیک کرو...خدا نے ہمارے لئے اچھا ہی سوچ رکھا ہوتا ہے لیکن ہم ہی بے صبرے ہو جاتے ہیں..وقت سے پہلے اور تقدیر سے زیادہ پانے کی خواہش ہمیں تباہی و بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔" عرشیہ نے کہا۔"واقعی...ہم دولت سے شاید دنیا کی ہر چیز خرید لیں...لیکن نہ تقدیر خریدی جا سکتی ہے اور نہ ہی خوشیاں..." نائمہ نے کہا۔"اگر روپے پیسے سے محبت،قدر اور عزت کا سودا کیا جا سکتا ہوتا تو آج میں تیمور کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہی ہوتی...میرے والدین نے میرا گھر پیسے سے بسانے کی کوشش کی تھی لیکن اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں کسی دولت مند کی بیٹی دُکھی نہ ہوتی اور نہ ہی کسی امیر کی بیٹی کا گھر اُجڑتا..." عرشیہ نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔"سچ کہا...روپے پیسے سے خوشیاں نہیں خریدی جا سکتیں...اور عزت اور اطمینان سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دولت نہیں۔" نائمہ نے کہا۔ملازمہ چائے کے ساتھ پُرتکلف لوازمات سے ٹیبل کو سجا گئی تھی۔"چلو آؤ..چائے پیتے ہیں...ٹھنڈی ہو جائے گی۔" عرشیہ نے نائمہ سے کہا اور دونوں کھانے پینے میں مصروف ہو گئیں۔دوستوں کے ساتھ دُکھ درد بانٹ لینے سے انسان کتنا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے یہ احساس آج نائمہ اور عرشیہ کو شدت سے محسوس ہوا تھا۔دونوں ہر غم بھلا کر اب ہنستے مسکراتے ہوئے باتوں میں مصروف تھیں۔

☆.....☆.....☆

وقت کتنا ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو آخر بیت ہی جاتا ہے۔خدا نے وقت کو سب سے بڑا مرہم بنایا ہے یہ اگر زخم دے سکتا ہے تو اُنہیں مندمل کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

وقت کے ساتھ اُس نے اپنے حالات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔عرشیہ نے پھر سے سکول جوائن کر لیا تھا اور اب وہ اپنا زیادہ تر وقت

مصروف رہ کر گزار رہی تھی۔ایک دن عرشیہ سکول سے واپس گھر پہنچی تو ڈرائنگ روم میں امی کے ساتھ ایک خاتون اور ایک بزرگ صوفے پہ براجمان تھے۔عرشیہ اپنا ہینڈ بیگ لاؤنج میں رکھ کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔اُس نے اُن دونوں کو سلام کیا اور سوالیہ نظروں سے صبیحہ بیگم کی جانب دیکھنے لگی۔"یہ ہے میری بیٹی۔عرشیہ..." صبیحہ بیگم نے مسکراتے ہوئے اُن کا عرشیہ سے تعارف کروایا۔"جی...ماشاء اللہ آپکی بیٹی بہت پیاری ہے۔" اُس خاتون نے عرشیہ کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔"جاؤ بیٹا...انکل آنٹی کے لئے چائے بنا لاؤ۔" عرشیہ کو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اسلئے وہ چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کر کچن میں آکر ملازمہ کے ساتھ چائے بنانے میں لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد عرشیہ ٹرالی سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور چائے سرو کرنے لگی۔"حسن مراد میرا اکلوتا بیٹا ہے..ایک ہی بیٹی ہے جو امریکہ میں اپنی پھوپھو کے ہاں بیاہی ہوئی ہے۔"بزرگ انکل کے الفاظ پہ عرشیہ نے چونک کر اُنکی جانب دیکھا۔"حسن مراد...اوہ...تو یہ اُسکے والدین ہیں..لیکن یہ یہاں کیوں آئے ہیں۔" عرشیہ نے دل ہی دل میں سوچا۔"ہم تو سوالی بن کر آپکے در پہ آگئے ہیں..اب آپ جیسے چاہیں اپنی تسلی کر لیجئے..جب چاہیں آکر میرے بیٹے سے ملئے...لیکن جواب ہمیں ہاں ہی میں چاہیے۔" خاتون نے کہا جو غالباً حسن مراد کی خالہ تھیں۔"آج میری بہن ہوتی تو وہ اپنے بیٹے کے لئے خود آپکی بیٹی کا ہاتھ مانگنے آتی...لیکن خالہ بھی ماں کی جیسی ہوتی ہے اور میں نے بھی حسن مراد کو اپنا بھانجا نہیں بلکہ بیٹا ہی سمجھا ہے۔" حسن مراد کی خالہ نے کہا۔"جی..جی بہن..کیوں نہیں ایسے ہی تو نہیں خالہ کو 'ماسی' کہتے ہیں..کیونکہ وہ ماں جیسی ہوتی ہے۔" صبیحہ بیگم نے اُنکی تائید کرتے ہوئے کہا۔"آپ اپنا پورا وقت لیں...ہمارا گھر آپکے گھر سے دو گلیاں چھوڑ کر ساتویں لین میں ہے آپ جب چاہیں اپنے بیٹے کے ساتھ آیئے گا۔" حسن مراد کے والد نے کہا۔

عرشیہ چائے اور دیگر لوازمات سرو کر کے وہاں سے چلی آئی۔اُس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ حسن مراد اُس سے ایسی سرسری ملاقات پہ ہی اُسکے لئے اپنے والدین کو بھیج دے گا۔عرشیہ کو بہت حیرت ہو رہی تھی لیکن یہ سچ تھا کہ اُسے حسن مراد بہت اچھا لگا تھا۔اُسے وہ تب بھی بہت اچھا لگا تھا جب عرشیہ کی گاڑی اُسکی گاڑی سے ٹکرائی تھی لیکن اُس وقت عرشیہ اُسکے حسنِ اخلاق اور مردانہ وجاہت پہ فریفتہ ہوئی تھی لیکن اس بار اُسکی شرافت نے اُسے بے حد متاثر کیا تھا۔اُس نے یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ عرشیہ کی طلاق کیوں ہوئی اور کب ہوئی..اُس میں عرشیہ کا کتنا قصور تھا۔حسن مراد کی شرافت اور دیانت سے عرشیہ کے دل میں اُسکے لئے نرم گوشہ پیدا ہو گیا تھا۔ابھی عرشیہ انہی سوچوں میں گم اپنے کمرے میں کاؤچ پہ بیٹھی کھڑکی سے لان کو دیکھ رہی تھی کہ کسی کے ہاتھ کا لمس اُسے اپنے سر پہ محسوس ہوا۔"ارے امی...آپ...آئیں ناں بیٹھیں۔" عرشیہ نے مڑ کر دیکھا تو صبیحہ بیگم اُسے پیار سے دیکھ رہی تھیں۔"حسن مراد کے والد اور خالہ تمہارا ہاتھ مانگنے آئے تھے بیٹا...یہ لوگ ہمارے گھر کے پاس ہی رہتے ہیں اور حسن مراد نے تمہیں سکول آتے جاتے دیکھ کر پسند کیا اور اپنے والدین کو بھیجا ہے۔" امی نے اُسے تفصیل بتائی۔"جی امی...قبرستان میں جب ابو کی قبر پہ گئی تھی تب وہ وہاں اپنی امی کی قبر پہ آیا ہوا تھا اور میری اُس سے وہیں ایک سرسری سی سلام دعا ہوئی تھی۔" عرشیہ نے بتایا۔"اچھا...یہ تو بہت اچھی بات ہے۔اس طرح تم نے اُسے دیکھا ہے بات کی ہے..اب تو ہمیں فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی۔" صبیحہ بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔"مجھے نہیں پتہ تھا

کہ وہ اس طرح اپنے والدین کو ہی بھیج دے گا۔" عرشیہ تھوڑی خجالت محسوس کر رہی تھی۔"اس میں کیا بُری بات ہے بیٹا...شرافت اسی کا نام ہے۔" صبیحہ بیگم نے کہا۔"تو اسکا مطلب آپکو وہ لوگ اچھے لگے ہیں...؟" عرشیہ نے حیرت سے ماں کو تکتے ہوئے کہا۔"ہاں عرشی... لوگ نیک اور بھلے معلوم ہوتے ہیں...بیٹا تمہارے ابو کو بھی غم و دیمک کی طرح کھا گیا کہ وہ تمہارے حق میں درست فیصلہ نہیں کر پائے اور اُنکے ایک غلط فیصلے پہ تمہاری زندگی تباہ ہوگئی۔" صبیحہ بیگم نے افسردہ لہجے میں کہا۔"اس میں ابو کا کوئی دوش نہیں تھا...میری قسمت میں ہی شاید ایسا لکھا تھا۔" عرشیہ کے لہجے میں بھی افسردگی اُتر آئی تھی۔"لیکن بیٹا..اب میں چاہتی ہوں کہ جو بات ہو وہ تمہاری رضامندی اور خوشی کا شامل رکھ کر ہو..اسلئے اگر تمہاری اجازت ہو تو بات آگے بڑھائیں؟" صبیحہ بیگم کے سوال پہ عرشیہ نے چونک کر اُنکی جانب دیکھا پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔"جیتی رہو میری بچی...سدا خوش رہو۔" صبیحہ بیگم نے اُسے گلے سے لگا کر دعا دی۔عرشیہ اُنکے گلے لگ کر رو دی۔اُسے اپنی ماں کی اُسکے لئے فکرمندی کا اچھی طرح اندازہ تھا۔وہ منہ سے کچھ نہ کہتیں تھیں لیکن اُنکے چہرے سے عرشیہ کے لئے فکر عیاں تھی اسلئے وہ اپنی ماں کے دکھوں میں مزید اضافہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔اور سب سے بڑھ کر اُسے حسن مراد دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اچھا لگا تھا۔وہ تیمور کی طرح لالچی،بدکردار اور خودغرض نہیں تھا۔حسن مراد نہ صرف شکل بلکہ شرافت میں بھی باکمال انسان تھا۔عرشیہ کے دل میں اُسکے لئے عزت اور بھی بڑھ گئی تھی۔تیمور جیسے بدخصلت انسان کے ساتھ رہ کر اُسے اچھے اور بُرے کا فرق بہت اچھی طرح سمجھ میں آ گیا تھا۔اسلئے وہ حسن مراد کی دل سے قدر کرتے ہوئے اُسکا پرپوزل قبول کر چکی تھی۔اب تمام رسمی کاروائی دونوں فیملیز کے بیچ میں طے پا رہی تھی۔

باب نمبر9

انسان خود کو بہت بڑا پلانر (Planner) سمجھتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو پلان کرے گا ویسا ہی ہوگا لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ کوئی ہے کس نے پہلے سے ہماری زندگیوں کو پلان کیا ہوا ہے اور اُسکے پلان کے آگے انسان کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

"بابا جان... میں سوہائی سے شادی نہیں کر سکتا..." حیدر نے پیر شہباز علی گیلانی سے اٹل لہجے میں کہا۔

"تم اپنے ہوش میں تو ہو... تمہیں کچھ احساس ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" پیر شہباز علی گیلانی نے گرجدار لہجے میں کہا۔

"مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیوں کہہ رہا ہوں..." حیدر نے کہا۔

"تم ایسا صرف اُس لڑکی زویا کی وجہ سے کہہ رہے ہو میں جانتا ہوں..." شہباز علی گیلانی نے اُسے گھورتے ہوئے کہا۔

"نہیں بابا جان... میں زویا کی وجہ سے نہیں کہہ رہا۔ میں ایسا اسلئے کہہ رہا ہوں کیونکہ میرے ساتھ شادی کر کے سوہائی کبھی خوش نہیں رہے گی۔ کیونکہ میں اپنے دل اور زندگی میں اُسے وہ مقام اور چاہت نہیں دے سکتا جو میں زویا کے لئے اپنے دل میں رکھتا ہوں۔" حیدر نے اپنا موقف بیان کرتے ہوئے التجائیہ نظروں سے شہباز علی گیلانی کو دیکھا۔

"اچھا... تو تم یہ چاہتے ہو کہ میں اپنے بھائی کو منگنی توڑ کر ذلیل کروں اور اُسکی بیٹی کو رسوا کر دوں...؟" شہباز علی گیلانی نے غصے سے کہا۔

"نہیں بابا جان۔ ایسا نہیں کہہ رہا ہوں میں... آپ سوہائی کی شادی شباب بھائی سے کر دیں کیونکہ وہ سوہائی کو بہت چاہتے ہیں۔" حیدر نے کہا تو شہباز علی گیلانی نے چونک کر اُسکی طرف دیکھا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو حیدر... تمہیں کیسے معلوم ہوا یہ سب؟" شہباز علی گیلانی کو حیرت ہوئی تھی کہ وہ یہ بات کیوں نہ جان سکے۔

"میں نے خود محسوس کیا ہے بابا جان... بھائی سوہائی کو بہت چاہتے ہیں اور جب سے آپ نے میری اور سوہائی کی نسبت طے کی ہے وہ بے حد رنجیدہ نظر آتے ہیں لیکن منہ سے کچھ نہیں بولتے..." حیدر نے اپنے باپ سے کہا۔

"تو یہ سب تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا...؟" شہباز علی گیلانی نے کہا۔

"آپ میری کوئی بات سننے کو تیار ہی نہیں تھے... اور مجھے بھی اندازہ بھی میری سوہائی سے نسبت طے ہونے کے بعد ہوا۔" حیدر نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گئے۔

"ہمم... اس میں کچھ غلطی میری بھی ہے.. مجھے پہلے شہاب کے لئے سوچنا چاہیے تھا۔" شہباز علی گیلانی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔ لیکن بعض باتوں کا احساس ہمیں بہت دیر سے ہوتا ہے۔"اسی لئے بابا جان.. آپ چچا جان سے بات کیجئے اور سوہائی کی شادی شہاب بھائی سے کروا دیجئے تا کہ سوہائی کو بھی اُسکا پورا حق ملے اور شہاب بھائی کو بھی۔" حیدر نے کہا۔

"ہاں.. اب اس بارے میں مجھے تمہارے چچا سے بات کرنی ہی پڑے گی۔" شہباز علی گیلانی نے پُرسوچ انداز میں کہا تو حیدر دل ہی دل میں خوش ہوا کہ اُسے اُسکے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگئی ہے۔ اب زویا کے ڈیڈی کو جو اسکی منگنی پہ اعتراض تھا وہ بھی نہیں رہے گا۔

"بابا جان... اب آپ زویا کے ڈیڈی سے ہماری شادی کی بات بھی کر لیں.. پلیز.." حیدر کا لہجہ التجائیہ تھا جس پہ پیر شہباز علی گیلانی کو ہنسی آگئی تھی۔ "او میرا پتر... یہ بھی کر لیتے ہیں.. یہ کونسی کوئی بڑی بات ہے۔" پیر شہباز علی گیلانی نے حیدر کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تھینک یو بابا جان..." حیدر نے خوش ہوتے ہوئے ممنونیت سے کہا۔ "حیدر... میرے پتر.. مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنے بھائی کی خاطر بھی سوچا۔" پیر شہباز علی گیلانی کو اب بھی اپنے شہاب کو نظر انداز کیے جانے پہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ باپ ہو کر بھی وہ اُسے نظر انداز کر گئے لیکن اُسکے بھائی نے اُسکی خاطر سوچا۔ "بابا جان.. یہ میرا فرض تھا۔" حیدر نے سعادت مندی سے کہا تو شہباز علی گیلانی نے اُسکی کمر شفقت سے تھپتھپائی۔

زندگی میں کچھ احساس ہمیں بہت ہی دیر سے ہوتے ہیں۔ اکثر اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ پھر اُس احساس کی کوئی وقعت نہیں رہتی۔ اور یہی غلطی پیر شہباز علی گیلانی سے ہو چکی تھی اُنھیں شہاب کا خیال اتنی دیر سے آیا کہ اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ اُسکا خیال کرتے یا نہ کرتے۔ حسد اور جلن کے بیج شہاب کے دل میں نفرت کا وہ تناور درخت پیدا کر چکے تھے کہ جسے کاٹنا اب ممکن نہیں رہا تھا۔ شہباز علی گیلانی کی اولاد کے درمیان غیر منصفانہ روش نے شہاب کے دل میں نہ ختم ہونے والی دشمنی کو جنم دیا تھا جس کا نتیجہ بہت بھیانک ہو سکتا تھا۔

☆......☆......☆

شہاب علی گیلانی اپنے ڈیرے پہ رقص و سرور کی محفل سجائے ملک سفیر قصوری کے ساتھ براجمان تھا۔ اُسکے اور بھی بہت سے دوست وہاں موجود تھے جن میں سے زیادہ تر شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔ سفیر اور شہاب دونوں رقص کی اس محفل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے باتوں میں مصروف تھے۔ "پھر کیا سوچا تم نے حیدر کے حوالے سے...؟" ملک سفیر نے شہاب سے پوچھا۔ "ابھی کوئی منصوبہ نہیں بن پایا اُسے راستے سے ہٹانے کا... پچھلی بار بھی بہت مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا تھا۔" شہاب علی گیلانی نے جام کے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اب تو حیدر کی شادی بھی ہونے والی ہے.. اور اُسکی تعلیم مکمل ہوتے ہی تمہارے بابا اُسے گدی پہ بٹھا دینگے۔" ملک سفیر نے کہا۔ "ایسا تو میں ہونے نہیں دونگا..." شہاب نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ "ویسے اگر تم چاہو تو میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے اُسے تمہارے راستے سے ہٹانے کا..." ملک سفیر نے مکاری سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیسا منصوبہ...؟" شہاب نے چونک کر اُسکی جانب

دیکھا۔" سانپ بھی مر جائے گا اور لاٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی... ایسا منصوبہ ہے پیارے۔" ملک سفیر نے اپنے مخصوص انداز میں کہا اور دونوں کے چہروں پہ ایک مکروہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ ملک سفیر دل میں زویا کے خلاف کینہ اور بغض چھپائے ہوئے تھا لیکن شہاب اُسکے دل میں چھپے مکاری اور فریب سے بے خبر تھا۔ وہ حیدر سے اُسکی دشمنی کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کر رہا تھا اور شہاب اُس کے ہاتھوں کھلونا بنا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

"حیدر مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا کہ اگلے ہفتے ہماری شادی ہے..." زویا کی آواز پر جوش تھی۔

"یقین کر لو اب... کیونکہ ہم بہت جلد اپنی منزل کو پہنچنے والے ہیں۔" حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ساتھ ہوتی تو تمہیں چھو کر یقین کر لیتی۔ اب کیا کروں کہ فون پہ تمہیں دیکھ بھی نہیں سکتی چھونا تو دور کی بات ہے۔" زویا نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"چلو اب تو صرف ایک ہفتے کی بات ہے سویٹ ہارٹ... پھر تو تمہیں یقین کرنا ہی پڑے گا۔" حیدر نے رومانوی انداز میں کہا۔

"تم نہیں جانتے حیدر کہ میں کتنا خوش ہوں... سچ اگر تم میرے نہ ہوتے تو میں واقعی مر جاتی۔" زویا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

"چلو بس اب زیادہ ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں..." حیدر نے کہا تو زویا ہنس دی۔

"پتہ ہے شہاب بھائی شادی کی تیاریاں اتنے زور و شور سے کر رہے ہیں کہ مجھے لگ ہی نہیں رہا کہ میری ماں نہیں ہے... میں نے کبھی اُنکو اس طرح سے خوش نہیں دیکھا۔" حیدر نے زویا کو بتایا۔

"ریلی... یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" زویا نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"اور پتہ ہے اُنھوں نے ہماری ویڈنگ نائٹ کے لئے لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل میں روم بک کر دیا ہے... ہم شادی کے پہلی تین راتیں وہیں سٹے کریں گے۔" حیدر نے پر جوش انداز میں اُسے بتایا۔

"اوہ... گریٹ یار... شہاب بھائی اتنے اچھے ہیں۔" زویا نے حیرانگی سے کہا۔

"آخر بھائی کس کے ہیں..." حیدر نے خوشی سے کالر اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"ایک اور خوشی کی خبر میرے پاس بھی ہے..." زویا نے کہا۔

"وہ کیا۔ جلدی بتاؤ؟" حیدر نے بے صبری سے کہا۔

"ڈیڈی نے ملیشیاء میں ہمارے لئے ایک ریسورٹ (Resort) بک کروایا ہے ہمارے ہنی مون کے لئے... ہم شادی کے اگلے ہفتے ہی ملیشیاء جائیں گے۔" زویا نے خوشی سے تقریباً چلاتے ہوئے حیدر کو بتایا۔

"ارے واہ... کیا بات ہے سکندر حیات خان صاحب کی۔" حیدر نے خوشی اور حیرانگی کے ملے جلے جذبات میں کہا۔

''کبھی کبھی زندگی بالکل خواب کی طرح لگتی ہے ناں حیدر... اور اس خوشی میں یوں لگنے لگتا ہے جیسے کہیں آنکھ کھل گئی تو یہ خواب ٹوٹ نہ جائے۔'' زویا نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''ضروری نہیں کہ خواب ٹوٹے.. کچھ خواب سچے بھی تو ہوتے ہیں ناں...'' حیدر نے کہا۔

''اچھا اب میں فون رکھ رہی ہوں... چار بجنے والے ہیں اور میری ڈیزائنر کے ساتھ اپائنٹمنٹ ہے۔'' زویا نے کہا۔

''اچھا. سنو تو...... آئی لو یو۔'' حیدر نے رومانوی انداز میں کہا تو زویا کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''آئی ریلی لو یو حیدر...'' زویا نے بے اختیار ہو کر کہا۔

☆......☆......☆

میر شہباز علی گیلانی کی حویلی برقی قمقموں سے جگمگا رہی تھی۔ ہر طرف چہل پہل سی نظر آ رہی تھی۔ پوری حویلی میں جشن کا سماں تھا اور ہر چہرہ خوشی سے کھل رہا تھا۔ حیدر ان سب چیزوں کو انجوائے کر رہا تھا۔ وہ خود کو بہت مکمل محسوس کر رہا تھا۔ ذہن و دل پہ ایک عجیب سا خمار اور سرور چھایا ہوا تھا۔ شہاب اور میر شہباز علی گیلانی بھی بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ حیدر کو یاد آ رہا تھا جب اُسکی ماں زندہ تھی تو ایسی چہل پہل اور گہما گہمی ہر عید پہ ہوا کرتی تھی۔ خاندان کے تمام افراد حویلی میں جمع ہوتے تھے اور ایک بہت بڑی دعوت ہوا کرتی تھی اور دن بھر لنگر بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ حیدر کے باپ اور بھائی نے اُسے کبھی ماں کی کمی محسوس ہونے نہیں دی تھی لیکن یہ ایک ایسا موقعہ تھا کہ حیدر کو اپنی ماں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر آج اُسکی ماں زندہ ہوتی تو وہ کتنا خوش ہوتی اُسے دولہا بنا دیکھ کر۔ ابھی وہ انہی سوچوں میں گم حویلی کے لان میں ٹہل رہا تھا کہ شہاب نہ جانے کب اُسکے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا اور اُسکے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اُس سے مخاطب ہوا۔ ''حیدر... یہاں اکیلے کھڑے کیا کر رہے ہو...؟'' شہاب نے اچانک اُسکے کندھے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔ ''ارے بھائی... آپ...'' حیدر نے مڑ کر دیکھا۔ ''کیا ہوا یہاں اتنے اُداس سے کیوں کھڑے ہو؟'' شہاب نے پوچھا۔ ''آج امی جان کی بہت یاد آ رہی ہے بھائی...'' حیدر نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''ہاں... مجھے بھی وہ بہت یاد آ رہی ہیں۔ آج اگر وہ ہوتیں تو اپنے ہاتھوں سے تمہارے سر پہ سہرا سجاتیں۔'' شہاب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بھائی آپ بہت اچھے ہیں...'' حیدر نے کہا تو شہاب کے دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔ ''آپ جس طرح میری خوشیوں کو چار چاند لگا رہے ہیں اور جس جوش و خروش سے تیاریاں کر رہے ہیں ایسے تو کوئی ماں ہی اپنے بیٹے کے لئے کرتی ہے۔'' حیدر نے کہا تو شہاب دل ہی دل میں شرمندہ ہوا کیونکہ وہ تو یہ سب اسلئے کر رہا تھا تا کہ جب وہ حیدر کو اپنے راستے سے ہٹائے تو کسی کو بھی اُس پہ شک نہ ہو۔ ''کیوں نہ کروں... آخر تم میرے بھائی ہو۔'' شہاب نے کہا لیکن اُسے خود پہ شرم آئی تھی۔ ''بس میں نے بابا جان سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری شادی سے فارغ ہوتے ہی آپکی اور سوہائی کی شادی کر دیں تا کہ گھر میں بھابھی آ جانے سے مجھے ماں کی کمی محسوس نہ ہو...'' حیدر کے الفاظ سے شہاب کو ایک زوردار جھٹکا لگا تھا اور اُس نے چونک کر حیدر کی آنکھوں میں دیکھا جن میں خوشیوں کے بے تحاشا رنگ بکھرے نظر آ رہے تھے اور اُسکے ہونٹوں پہ ایک شرارت بھری مسکان تھی جو شہاب کے دل میں اُترتی ہی چلی گئی۔ ''حیدر... کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟'' شہاب کو جیسے اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا تھا۔

"بالکل سچ کہہ رہا ہوں بھائی... میں نے آپکی آنکھوں میں سوہائی کے لئے وہی محبت دیکھی ہے جو میری آنکھوں میں زویا کے لئے ہے.. اور یہ بات میں نے بابا جان کو بتا دی ہے اور بابا جان نے چچا جان کو بھی راضی کر لیا ہے۔" حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا تو شہاب کو اُسکے سامنے اپنا آپ بہت چھوٹا نظر آیا۔" حیدر... میرے بھائی۔" شہاب نے آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیا اور فرطِ جذبات سے اُسکی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔" حیدر نے بالکل ٹھیک کہا ہے پُتر شہاب۔" پیر شہباز علی گیلانی کی آواز پہ دونوں الگ ہوئے۔" بابا جان آپ.." شہاب نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔" حیدر نے مجھے احساس دلایا ہے پُتر... میں اپنی لاعلمی میں تم سے زیادتی کرنے چلا تھا اُسکے لئے مجھے معاف کر دو.. میرے لئے تم دونوں ہی ایک جیسے ہو.. تم دونوں ہی میرے لختِ جگر ہو..." پیر شہباز علی نے جذبات سے بھرپور لہجے میں کہا تو دونوں بھائی اپنے باپ سے بغلگیر ہو گئے۔" آج تم لوگوں کی ماں زندہ ہوتی تو تمھیں بتاتی کہ ماں باپ کے لئے ساری اولاد ایک سی ہوتی ہے پُتر اور باپ کی سختی اولاد کو راہِ راست پہ رکھنے کے لئے ہوتی ہے نہ کہ اولاد میں فرق کے لئے..." شہباز علی گیلانی نے کہا تو شہاب کو مزید خود کو شرمندگی ہوئی کہ وہ یہ کیا کرنے جا رہا تھا اپنے ہی بھائی کی جان لے کر اپنا ہی بازو کاٹنے چلا تھا۔" آپ نے بالکل سہی کہا بابا جان... بس اب آپ جلدی سے میری بھابھی گھر لے آئیں.. اور بھائی میں تو سوہائی کو بھابھی نہیں بھابھی ماں کہہ کر پکارا کروں گا ابھی سے بتا رہا ہوں..." حیدر نے بچگانہ انداز میں کہا تو شہاب اور پیر شہباز علی قہقہہ لگا کر ہنس دیئے۔" چلو بھابھی کے بچے... پہلے میں اپنی بھرجائی کو تو گھر لے آؤں.. چلو تیار ہو جاؤ.. مہمان آ چکے ہیں اور تمام تیاریاں مکمل ہیں تم تیار ہو جاؤ تو بارات لے کر نکلیں۔" شہاب نے کہا۔" ہاں بھئی.. اب جلدی سے تیاری پکڑو.. پوری شان سے بارات جانی چاہیے۔" پیر شہباز علی گیلانی نے کہا اور وہاں سے چل دیئے۔ شہاب اور حیدر بھی تیار ہونے اپنے اپنے کمروں کی طرف بڑھ گئے۔

شہاب جلدی سے اپنے کمرے میں پہنچا اور فون ملانے لگا۔ لیکن ملک سفیر قصوری کال ریسیو نہیں کر رہا تھا۔ شہاب کے ہاتھ کانپ رہے تھے اُسے کسی بھی طرح سفیر کو روکنا تھا۔ شہاب کو اپنا آپ بہت ہی گھٹیا اور پستیوں میں گرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ حیدر چھوٹا ہو کر بھی اپنی سوچ میں کتنا بڑا تھا اور شہاب بڑا ہو کر بھی کتنا نیچے گر گیا تھا کہ اپنے ہی بھائی کی جان لینے چل پڑا تھا۔ وہ تمام رشتوں ناطوں کو نفرت اور حسد کی آگ میں جلانے چلا تھا۔ اُسے رہ رہ کر خود پہ افسوس اور شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ حیدر جیسے بھائی کو موت کے گھاٹ اُتارنے چلا تھا جو بنا کہے اور بنا بتائے اُسکی زندگی کی سب سے بڑی خوشی اُسکی جھولی میں ڈال چکا تھا.. ایسے بھائی سے اُسکی زندگی اور خوشیاں چھیننے چلا تھا وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ وہ اپنی زندگی کی نئی شروعات کرنے چلا تھا۔ شہاب بار بار ملک سفیر کو کال کر رہا تھا لیکن اُسکی کال ریسیو نہیں کی جا رہی تھی۔ ابھی وہ اسی اضطرابی کیفیت میں تھا کہ کمرے کے دروازے پہ دستک ہوئی اور ساتھ ہی حیدر کمرے میں داخل ہوا۔" بھائی.. آپ اب تک یونہی بیٹھے ہیں... چلیں اُٹھیں اور مجھے شیروانی پہننے میں میری مدد کریں۔" حیدر اُسے بازو سے کھینچتا ہوا اپنے کمرے میں لے گیا۔" اچھا.. اچھا.. میرا بازو تو چھوڑو۔" شہاب نے کہا اور اُسکی شیروانی اُسے پہنانے لگا۔ شہاب اُسکی شیروانی کے بٹن بند کر رہا تھا لیکن اُسکا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ ملک سفیر سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اُس سے رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ کال لے

رنگ کی خوبصورت نگینوں سے سجی ہوئی شیروانی میں حیدر بالکل کسی شہزادے کی طرح نظر آ رہا تھا۔ اُسکا مردانہ وجاہت سے بھرپور وجود اس قدر شاہانہ نظر آ رہا تھا کہ اُس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹ رہی تھی۔ "خدا تمہیں نظرِ بد سے بچائے..." شہاب کے منہ سے بے اختیار ہی دعا نکلی تھی۔ "اچھا چلیں اب آپ بھی جلدی سے تیار ہو جائیں... مجھ سے اب صبر نہیں ہو رہا۔" حیدر نے اُسے اُسکے کمرے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا اور کمرے میں پہنچ کر اُسے واش روم میں دھکیل دیا۔ ایک ملازم نے اُسکے کپڑے لا کر حیدر کو تھما دیئے۔ شہاب کی بے چینی مزید بڑھتی جا رہی تھی وہ جتنا جلد چاہ رہا تھا کہ سفیر سے رابطہ ہو جائے اُتنا ہی اُس میں تاخیر ہوتی جا رہی تھی۔ شہاب جلدی جلدی شاور لیکر تیار ہو گیا اور بارات اپنے مقررہ وقت پہ حویلی سے نکل چکی تھی۔ بارات کا پُرتپاک استقبال کیا گیا اور ہر چیز اُنکے شایانِ شان تھی۔ حیدر بے چینی سے زویا کا انتظار کر رہا تھا اور ایک ایک پل جیسے ٹھہر ٹھہر کر گزر رہا تھا۔ اس دوران وہ دو تین بار زویا کو جلدی آنے کے لئے کال بھی کر چکا تھا لیکن وہ پارلر سے لیٹ ہو گئی تھی۔ کافی دیر بعد زویا جب وہاں پہنچی تو ہر آنکھ اُسے دیکھ کر پلک جھپکنا بھول گئی تھی۔ کیمرے کی لائٹ جب زویا پہ پڑی تو اُسکا خوبصورت لباس کے ساتھ اُسکا پریوں جیسا حسین وجود بھی جھلملانے لگا تھا۔ ہر کوئی اُسکے حُسن کی داد دے رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پرستان سے کوئی پری اُتر آئی ہو اور ہر کوئی اُس مافوق الفطرت سراپے کو حیرت سے تک رہا ہو۔ گہرے سُرخ اور سنہری رنگ کے زرق برق لباس میں وہ واقعی پریوں کی رانی لگ رہی تھی۔ سکندر حیات خان، مہرو، درخشندہ بیگم، اسفند اور جواد سب ہی زویا کو فخر بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور حیدر کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں تھا۔

زویا کے سٹیج پہ پہنچتے ہی نکاح کی رسم ادا کی گئی اور اُسکے بعد سب لوگ کھانے میں مگن ہو گئے۔ شہاب ایک کونے میں کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا اور بہت بے چین نظر آ رہا تھا۔ "ہیلو... سفیر... کہاں ہو تم یار کب سے فون ملا رہا ہوں تمہیں۔" شہاب نے اُسکے فون اُٹھاتے ہی کہا۔ "پیارے تمہارے ہی کام کی تیاری میں مصروف تھا۔" دوسری طرف سے سفیر نے کہا۔ "سارا منصوبہ کینسل کر دو... اب اس سب کی ضرورت نہیں رہی۔" شہاب نے جلدی سے اُسے کہا۔ "کیا.. یہ تم کیا کہہ رہے ہو.. کیوں ضرورت نہیں رہی؟" ملک سفیر نے حیرانگی سے سوال کیا۔ "یہ سب میں تمہیں بعد میں مل کر سمجھا دونگا لیکن تم ابھی کچھ نہیں کرو گے... کچھ بھی نہیں... تم سمجھ رہے ہو ناں؟" شہاب نے اپنی بات پہ زور دے کر کہا۔ "ہاں ٹھیک ہے... جیسے تمہاری مرضی۔" ملک سفیر نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔ اسکے ساتھ ہی شہاب نے شکر کا سانس لیا اور خود کو نارمل کرتا ہوا دوبارہ فنکشن میں شریک ہو گیا۔ شہاب اپنی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا اور اب پورے اطمینان سے شادی کی رسموں میں مصروف تھا۔ رخصتی کا وقت آ پہنچا تھا اور بارات اپنی امانت کو لیکر اپنی منزل کی جانب بڑھنے کو تیار تھی۔ حیدر اور زویا ایک گاڑی میں بیٹھ چکے تھے جو انہیں شہاب کی بُک کروائے ہوئے فائیو سٹار ہوٹل لے کر جانے والی تھی اور باقی بارات پیر شہباز علی گیلانی کے ہمراہ ملتان لوٹ رہی تھی۔ حیدر اور زویا کی گاڑی میں ایک محافظ فرنٹ سیٹ پہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اور باقی محافظ دوسری گاڑی میں اُنکے ہمراہ پیچھے پیچھے تھے۔

☆.....☆.....☆

حیدر اور زویا گاڑی میں اپنی ہی باتوں میں مصروف تھے کہ اچانک گاڑی کی زوردار بریک سے اُنھیں ایک زبردست جھٹکا لگا اور اُنھوں نے چونک کر گاڑی سے باہر دیکھا۔ اُنکی گاڑی کے آگے ایک گاڑی نے راستہ روک رکھا تھا۔ اور اُس میں سے بہت سے مسلح افراد نے حیدر کی گاڑی کو گھیرے میں لے کر سب سے پہلے گاڑی میں بیٹھے ہوئے گارڈ کو گولی مار کر ہلاک کیا اور اُسکے بعد ڈرائیور کو اپنی گولیوں کا نشانہ بناتے ہوئے دو مسلح افراد اُنکی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ حیدر حیران نظروں سے یہ سب منظر دیکھ رہا تھا اور زویا خوف کے مارے اُسکے سینے میں اپنا چہرہ چھپائے زاروقطار رو رہی تھی۔ ''کون ہو تم لوگ...اور کہاں لے جا رہے ہو؟'' حیدر نے اُن مسلح آدمیوں سے پوچھا۔ ''چپ چاپ بیٹھے رہو...ورنہ گولی سے اُڑا دینگے۔'' اُن میں سے جو ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پہ بیٹھا تھا اپنی بندوق کا نشانہ اُسکی طرف کرتے ہوئے کہنے لگا۔ زویا مسلسل روئے چلی جا رہی تھی اور حیدر کا پریشانی سے بُرا حال تھا۔ ''زویا پلیز...مت رو...یہ کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہمارا...'' حیدر نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ زویا کا ہاتھ اچانک حیدر کی کمر پہ لگا تو اُسے محسوس ہوا کہ اُسکی جیب میں موبائل ہے۔ اُس نے اسی طرح حیدر کے ساتھ خود کو چپکا کر چھپائے رکھا اور جیب سے موبائل کو اس طرح سے آدھا باہر نکالا کہ اغوا کاروں کی اُس پہ نظر نہیں پڑی۔ پہلا نمبر جو حیدر کی کال لسٹ میں تھا وہ شہاب علی گیلانی کا تھا۔ زویا نے اُسے کال ملا دی۔ اور جیسے ہی کال ریسیو ہوئی تو اُس نے موبائل واپس جیب میں ڈال کر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ''پلیز......ہمیں چھوڑ دو......ہمیں مت مارو......ہمیں کہاں لیکر جا رہے ہو...'' زویا نے روتے ہوئے کہا تو اُسی آدمی نے اُسے گھورتے ہوئے دہاڑا۔ ''چپ چاپ بیٹھی رہو لڑکی...ورنہ تمہیں گولی مار دونگا...'' اُس نے زویا کو پستول دکھاتے ہوئے کہا تو حیدر غصے سے چلایا۔ ''تمہیں شرم نہیں آتی لڑکی کو گن دکھاتے ہوئے...'' حیدر کے کہنے پہ وہ مزید بھڑک اُٹھا۔ ''خاموش ہو جاؤ ورنہ پہلے تمہیں ماروں گا اور پھر اِسے...پھر قبر میں جا کر سُہاگ رات منانا...'' اُس نے کہا اور دونوں بلند قہقہے کے ساتھ زویا اور حیدر کی بے بسی پہ ہنسنے لگے۔

کچھ ہی دیر بعد گاڑی ایک ویران سی جگہ پہ آکر رُک گئی اور دونوں مسلح آدمی گاڑی سے اُتر گئے۔ اُنکے پیچھے دوسری گاڑی میں بھی چند مسلح غنڈے اپنی بندوقیں تانے اُنکی گاڑی کی طرف بڑھے۔ ایک آدمی نے حیدر کو بازو سے کھینچ کر گاڑی سے نکالا اور دوسرے نے زویا کو گھسیٹتے ہوئے گاڑی سے باہر نکالا۔ زویا چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔ حیدر نے اُس آدمی کو للکارا ''چھوڑ دو اُسے...جو بھی کرنا ہے میرے ساتھ کرو۔ چھوڑ دو زویا کو...'' زویا اُس آدمی کی سخت گرفت سے خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اُس نے سختی سے اُسکی نازک کلائی کو تھام رکھا تھا۔ زویا نے زور سے اُس آدمی کے ہاتھ پہ دانتوں سے کاٹ لیا۔ وہ درد سے کراہا اور ایک زوردار تھپڑ اُسکے نازک رخسار پہ دے مارا جس پہ وہ دور جا کر زمین پہ گر گئی۔ حیدر کا دل تڑپ کر رہ گیا اور وہ اُسے گالیاں دینے لگا ''ذلیل...کمینے...کم ذات...عورت پہ ہاتھ اُٹھاتا ہے ہمت ہے تو مجھ سے مقابلہ کر...'' حیدر کو دو آدمیوں نے بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ سب کرائے کے غنڈے کسی کا انتظار کر رہے ہوں کیونکہ اگر وہ اُنھیں مارنا چاہتے تو کب کے مار چکے ہوتے۔ اُسی لمحے ایک بی۔ایم ڈبلیو کار اُنکے قریب آکر رُکی اور ایک آدمی گاڑی سے اُتر کر اُنکے سامنے آیا جسے دیکھ کر سب غنڈوں نے سیلوٹ کیا اور ادب سے کھڑے ہو گئے۔ ''ملک سفیر قصوری...'' زویا نے حیرت سے اُسے دیکھتے ہوئے اُسکا نام زیرِ لب دُہرایا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا زویا کے پاس آگیا اور اُسے بازو سے

پکڑ کر زمین سے اُٹھایا۔" تم یہ سب کیوں کر رہے ہو سفیر۔۔؟؟؟" زویا نے حیرت سے پوچھا۔" تم اسے جانتی ہو زویا۔۔؟" حیدر نے حیرانگی سے سوال کیا۔" ہاں۔۔۔ یہ فراز بھائی کا کزن ہے۔۔" زویا نے کہا تو ملک سفیر زور زور سے ہنسنے لگا۔" کر لو۔۔کر لو۔۔آخری بار تم دونوں نے جو بات کرنی ہے کر لو۔۔کیونکہ اسکے بعد تم دونوں کوئی بات نہیں کر سکو گے۔" سفیر نے کہا تو زویا کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔" تم ایسا کیوں کر رہے ہو ہمارے ساتھ۔۔کیا بگاڑا ہے ہم نے تمہارا۔۔؟" زویا نے بے بسی سے سوال کیا۔" تم کیا سمجھتے ہو ہم لاوارث ہیں۔۔ابھی میرے گارڈز تم تک پہنچ جائیں گے اور پھر۔۔۔" ابھی حیدر کچھ کہنا ہی چاہ رہا تھا کہ سفیر کا ایک اور بلند قہقہہ فضا میں گونجا۔" کونسے گارڈز۔۔۔ وہ جو اپنی حفاظت نہ کر سکے۔۔وہ تمہیں بچائیں گے۔۔" سفیر نے اپنی گن نکال کر حیدر کی کن پٹی پہ رکھتے ہوئے خونخوار نظروں سے اُسکی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تو زویا چیخی" سفیر۔۔۔چھوڑ دو اُسے۔۔پلیز۔۔کیا چاہتے ہو تم۔۔؟" زویا نے روتے ہوئے پوچھا تو سفیر زویا کی جانب پلٹا۔ایک آدمی نے زویا کو بازو سے سختی سے جکڑ رکھا تھا اور وہ بار بار خود کو اُسکی گرفت سے آزاد کروانے کے لئے کسمسا رہی تھی۔یہی حال حیدر کا بھی تھا جسے دو لمبے تڑنگے غنڈوں نے بازوؤں سے جکڑ رکھا تھا۔" اسکی خاطر زویا۔۔اسکی خاطر تم نے مجھے ٹھکرایا تھا ناں۔۔۔دیکھو ۔۔دیکھو اب یہ میرے رحم و کرم پہ ہے اور میں جب چاہوں اسکی جان لے سکتا ہوں۔" سفیر نے کہا۔" تم کون ہوتے ہو اپنا مقابلہ میرے حیدر سے کرنے والے۔۔تم اگر مر کر دوبارہ زندہ بھی ہو جاؤ تو حیدر کی جوتی کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔۔!" زویا نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا تو سفیر کے تن بدن میں غصے سے آگ لگ گئی اور ایک زناٹے دار تھپڑ زویا کے چہرے پہ دے مارا جس سے زویا کے نچلے ہونٹ سے خون رسنے لگا اور اُسے اپنے زمین و آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دینے لگے اور وہ چکرا کر رہ گئی۔" اب کون بچائے گا تم دونوں کو مجھ سے۔۔۔"

سفیر اپنی گن لوڈ کر کے جیسے ہی حیدر کی جانب بڑھا شہاب وہاں اپنی گاڑی لے کر پہنچ گیا۔سفیر کے تمام پالتو غنڈوں نے مستعدی سے اپنی بندوقیں شہاب پہ تان لیں۔" سفیر۔۔چھوڑ دو میرے بھائی کو۔۔۔" شہاب نے اُسے دور ہی سے للکارا۔" اوہ ہو۔۔آیئے ۔آیئے۔۔آپ بھی تشریف لایئے۔۔" سفیر نے مکروہ مسکراہٹ چہرے پہ سجا کر بولا۔" سفیر تم انہیں یہاں کیوں لائے ہو۔۔۔چھوڑ دو انہیں۔۔۔" شہاب نے قریب آ کر کہا۔" یہ پلان تمہارا ہی تو تھا۔۔۔میں تو بس انکو انجام تک پہنچانے کے لئے لایا ہوں۔" سفیر نے مکاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔" بھائی یہ سب کیا ہو رہا ہے۔۔آپ بھی اسکو جانتے ہیں۔۔۔؟" حیدر شدید اُلجھن اور حیرت میں مبتلا تھا اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔زویا نیم بے ہوشی کی سی حالت میں زمین پہ پڑی تھی۔" تمہارا بھائی تو میرا دوست ہے۔۔جگری دوست۔۔اور جانتے ہو۔۔تمہیں جان سے مارنے کی پلاننگ بھی ہم نے مل کر کی تھی۔۔" سفیر نے استہزائیہ لہجے میں شہاب کو دیکھتے ہوئے حیدر کو بتایا۔" بکواس کر رہے ہو تم۔۔جھوٹ بولتے ہو۔۔میرا بھائی ایسا نہیں کر سکتا۔" حیدر نے کہا۔" اچھا۔۔تو پھر پوچھ لو اپنے اس۔۔جان سے پیارے بھائی سے۔۔تم پہ اس سے پہلے بھی جو قاتلانہ حملہ ہوا۔۔وہ بھی تمہارے بھائی جان نے ہی کروایا تھا۔۔یقین نہیں آتا تو خود پوچھ لو۔۔" سفیر نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے شہاب کو دیکھا جو شرم سے سر جھکائے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اب کیسے اپنے بھائی کی جان بچائے کیونکہ سفیر کے ساتھ بہت سے پالتو غنڈے تھے۔" بھائی پلیز۔۔بتائیں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔۔آپ خاموش کیوں ہیں۔۔؟" حیدر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں تھیں اور سفیر کھڑا مزے سے مسکرا رہا تھا کہ اچانک ہی شہاب نے اُس کو منہ پہ ایک زوردار گھونسہ مارا اور اُسکے ہاتھ

سے پستول چھین کر اسی کی گن پٹی پہ رکھ دی۔ ''کہو اپنے چیلوں سے کہ میرے بھائی کو چھوڑ دیں ورنہ تمہیں گولی سے اُڑا دوں گا۔'' شہاب نے سفیر سے کہا تو اُسکے اشارے پہ اُسکے سب آدمیوں نے ہتھیار پھینک دیے اور حیدر کو بھی چھوڑ دیا۔ حیدر نے چھوٹتے ہی اُس آدمی کو ایک زناٹے دار تھپڑ مارا جس نے زویا کو تھپڑ مارا تھا۔ وہ جلدی سے زمین پہ بے ہوش پڑی زویا کی جانب لپکا۔ ''حیدر تم زویا کو لے کر یہاں سے جاؤ۔'' شہاب نے حیدر کو تحکمانہ لہجے میں کہا اور ایک ایک کر کے سفیر کے تمام آدمیوں کو گولی ماردی تاکہ جب حیدر وہاں سے جانے لگے تو وہ اُسے روکنے کی کوشش نہ کر سکیں۔ سفیر کا غصے اور بے بسی سے بُرا حال ہو رہا تھا وہ کسی صورت بھی زویا اور حیدر کو زندہ سلامت نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ وہ دونوں بھائیوں کو ختم کر کے اُنکے خاندان کو لاوارث اور برسوں سے جو اُنکا سیاست میں مقام تھا اُسے ختم کرنا چاہتا تھا۔ زویا نے سفیر کے رشتے کو ٹھکرا کر جو اُسکی تذلیل کی تھی وہ اُسکا بدلہ بھی لینا چاہتا تھا۔

حیدر زویا کو اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر گاڑی میں ڈال رہا تھا کہ سفیر شہاب کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ دونوں میں زبردست قسم کی ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ حیدر اپنے بھائی کی مدد کو آنے کے لیے دوڑا لیکن شہاب نے اُسے آگے بڑھنے سے پہلے ہی روک دیا۔ ''حیدر۔ تم زویا کو لے کر یہاں سے چلے جاؤ۔۔ میں اِس سے نپٹ لوں گا۔'' شہاب نے بلند آواز میں کہا۔ ''بھائی۔۔ میں آپکو یوں اکیلا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔'' حیدر اُن دونوں کی طرف دوڑا لیکن اُسکے پہنچنے سے پہلے ہی ہاتھا پائی کے دوران پستول چل گئی جس سے گولی سیدھا شہاب کے سینے کے آرپار ہو گئی۔ ''بھائی۔۔۔۔۔۔'' حیدر کی بلند چیخ فضا میں گونجی۔ سفیر نے اپنے اوپر سے خون میں لت پت شہاب کے وجود کو دھکیل کر زمین پہ گرا دیا۔ ''بھائی۔۔۔ یہ آپ نے کیا کر دیا۔۔۔ بھائی۔۔۔'' حیدر روتے ہوئے شہاب کے وجود کو اپنی بانہوں میں لے کر کہہ رہا تھا کہ سفیر جو کچھ دیر پہلے اپنے ہاتھوں اپنے دوست کا قتل ہونے پہ حیرت زدہ سا کھڑا تھا اچانک ہی کچھ سوچ کر حیدر کی طرف بڑھا اور اُسکے سر پہ پستول تان لی۔ گولی چلنے کی آواز ویرانے کی خاموشی میں چاروں طرف گونجی تھی اور تھوڑی ہی دیر میں سفیر اپنے ہاتھ میں پستول تھامے زمین پہ پڑا درد سے کراہ رہا تھا۔ پیر شہباز علی گیلانی اپنے گارڈز اور پولیس سمیت وہاں پہنچ چکا تھا۔ ملک سفیر پولیس کی گولی بازو پہ لگنے کے باعث زمین پہ پڑا درد سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ حیدر اپنے بھائی کو بانہوں میں لیے اُسکو بے بسی سے مرتا دیکھ رہا تھا۔ شہاب نے جو بھی گناہ کیے تھے آج اپنے بھائی اور اُسکی خوشیوں پہ قربان ہو کر سب دھو ڈالے تھے اور آج وہ ایک پُرسکون مسکان ہونٹوں پہ سجائے اِس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ اُس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ جس بھائی سے وہ چند گھنٹوں پہلے شدید نفرت کرتا تھا اور اُسکے خون کا پیاسا تھا۔ اب چند گھنٹوں بعد اُسی بھائی پہ اپنی زندگی وار گیا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ عدالت ملک سفیر قصوری ولد ملک امتیاز قصوری کو تازیراتِ پاکستان دفعہ ۳۰۲ کے تحت پیر شہاب علی گیلانی ولد پیر شہباز علی گیلانی کے قتل کے جرم اور زویا سکندر حیات خان کے اُسکے شوہر سمیت اغواء کے جرم میں عمر قید با مشقت اور دو کروڑ روپے جرمانے کی سزا سناتی ہے۔ The court is Adjourned'' جج نے فیصلہ سنایا تو عدالت میں بیٹھے ہوئے زویا اور حیدر کے چہروں پہ فاتحانہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تمہیں معلوم ہے زویا...ایک کھیل ہم کھیل رہے ہوتے ہیں اور ایک کھیل تقدیر ہمارے ساتھ کھیل رہی ہوتی ہے...ہم سمجھتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی کی بساط کے بادشاہ ہیں لیکن تقدیر ہمیں مہرہ بنا کر چلا رہی ہوتی ہے۔'' مقدمے کا فیصلہ سننے کے بعد ہائیکورٹ سے باہر نکلتے ہوئے حیدر نے زویا سے کہا۔

''زندگی کی بساط پہ تقدیر ہمیں کھیلتی ہے اور ہم بے بس مہروں کی طرح تقدیر کے اشاروں پہ چلائے جاتے ہیں۔ تقدیر کی چال سے بے خبر ہم اپنی چال چلتے ہیں اور جب مات ہوتی ہے تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہم تو محض مہرے تھے۔ اصل کھلاڑی تو کوئی اور ہی ہے۔'' زویا نے پُرسوچ انداز میں حیدر کی بات کی تائید میں کہا تو وہ اُسے دیکھ کر ہلکے سے مسکرا دیا۔

☆.....☆.....☆

''اپنی چاہت کو حاصل نہ کر پانا جتنا تکلیف دہ احساس ہے..اُس سے کہیں زیادہ اذیت ناک ہے اُسے پا کر کھو دینا۔'' صبا نے تبریز کو پاگلوں جیسی حرکتیں کرتے دیکھ کر رنج اور افسوس کے ملے جلے تاثرات سے کہا۔

''بعض گناہوں کی سزا انسان اسی دنیا میں بھگت کر جاتا ہے...شاید اسی کو مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔'' شاریز نے صبا کی بات پہ اپنے بھائی کو دُکھ بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ دونوں جب بھی تبریز کو ری ہیب سنٹر میں ملنے آتے تھے اسی طرح دل گرفتہ سے ہو کر وہاں سے واپس لوٹتے تھے۔ ڈاکٹرز تبریز کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور اُنکی رائے کے مطابق اب اُسکے ٹھیک ہونے کی چانسز نہ ہونے کے برابر تھے۔ اب خدا کے بعد صرف ری ہیب سنٹر ہی اُنکی آخری اُمید تھا جہاں وہ اپنے بھائی کو چھوڑ آئے تھے۔

☆.....☆.....☆

''زندگی بالکل کسی خواب کی طرح ہے ناں حسن...'' نرم گیلی گھاس پہ ننگے پاؤں چلتے ہوئے عرشیہ نے حسن مراد سے کہا۔

''پہلے ایسا نہیں لگتا تھا...زندگی ایک تھکا دینے والا سفر لگتی تھی۔ لیکن جب سے تمہارا ہاتھ تھاما ہے...زندگی واقعی کسی حسین خواب کی طرح لگنے لگی ہے۔'' حسن مراد نے عرشیہ کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اُسکا ہاتھ تھام کر کہا۔

''پتہ ہے حسن...جب سے آپ میری زندگی میں آئے ہیں میرا خدا پہ یقین مزید بڑھ گیا ہے اور قرآن کی اس آیت پہ میرا یقین اور بھی زیادہ پختہ ہو گیا ہے...'' عرشیہ نے حسن کو احترام سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''واقعی..کس آیت پہ...؟'' حسن نے حیرانگی سے اُسکی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ان اللہ مع الصابرین (اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)'' عرشیہ نے کہا تو حسن نے مسکراتے ہوئے اُسکا ماتھا چوم لیا اور دونوں پھر سے نرم گھاس پہ چلنے لگے۔

✿.........✿

ختم شد